تصوف و اہل تصوف

سلف و خلف کی نظر میں

زیر بحث موضوع پر ممتاز بزرگوں، مستند عالموں
اور مایہ ناز اہل دانش کے قیمتی مضامین کے
مجموعہ پر مشتمل کتاب

مرتب
محمد موسیٰ بھٹو

سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ
[illegible] بی - یونٹ نمبر [illegible]
لطیف آباد - حیدرآباد

http//knooz-e-dil.blogspot.com

تصوف واہل تصوف

سلف وخلف کی نظر میں

زیر بحث موضوع پر ممتاز بزرگوں، مستند عالموں
اور مایہ ناز اہل دانش کے قیمتی علمی مضامین کے
مجموعہ پر مشتمل کتاب

مرتب: محمد موسیٰ بھٹو

سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ

۴۰۰ - بی لطیف آباد نمبر ۴ حیدر آباد

کتاب کا نام: تصوف واہل تصوف
سلف وخلف کی نظر میں

مرتب: محمد موسیٰ بھٹو

کمپوزنگ: امتیاز احمد بھٹو - اشفاق احمد بھٹو

پیسٹر: سہیل سلام بھٹو

پریس: یادگار پرنٹنگ پریس حیدرآباد

قیمت: ۱۷۵ روپے

ناشر: سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ
۴۰۰ - بی لطیف آباد نمبر ۴ حیدرآباد



فہرست مضامین

تعارف

مسلم معاشرہ پچھلے تیرہ سو سال سے جن افراد کے طفیل زندہ اور قائم رہا ہے، ان میں فقہاء، محدث، علمائے کرام اور صوفیاء کرام شامل ہیں۔ فقہاء اور علمائے کرام نے اسلام کے ظاہری تسلسل کو قائم رکھنے کی سعی کی ہے تو صوفیاء کرام نے تزکیہ نفس کے ذریعہ مسلمانوں کو دنیا پرستی اور نفس پرستی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کی روک تھام کے سلسلہ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

تصوف کا ادارہ امت کا ایک مسلمہ ادارہ ہے، جس سے امت کی تاریخ اسلامیت کے روشن باب وابستہ ہیں۔ ہمارے موجودہ زوال کے اسباب کا اگر تجزیہ کیا جائے گا تو بادشاہوں اور امیروں کی عیاشی، فوجی قوت کے حامل سرداروں کی، دولت اور نفس پرستی کی خاطر باہم معرکہ آرائی، مغربی قوتوں کی جدید علوم وفنوں سے مسلح ہوکر، کمزور ومنتشر مسلمان ریاستوں پر فوج کشی اور ان کے نظام تعلیم وتربیت کو تبدیل کرکے، انہیں اپنے مادہ پرستی پر مبنی تعلیمی وتربیتی نظام میں رنگنے کی کاوشیں، تصوف میں پیدا ہونے والے بگاڑ، جدید تعلیم کے زیر اثر سیکولر فکر کے عمومی غلبے، اسلام کی محض سیاسی، عسکری اور معاشی نصب العینی تشریح اور اسلامیت کے جدید حاملین کی طرف سے حقیقی تصوف اور اس کے علمبرداروں کے بارے میں غلط فہمی کی وجہ سے تہذیب نفس کے سلسلہ میں ان سے عدم رجوع جیسے بہت سارے عوامل شامل ہیں۔

امت میں پچھلے ۱۳ سو سال میں اسلام کی محض علمی، عقلی اور فلسفیانہ تشریح کے حاملیں کے سیکڑوں گروہ پیدا ہوئے ہیں، جن میں خارجی اور معتزلین تو بہت ہی طاقتور حیثیت کے حامل تھے، لیکن اب ان سارے گروہوں کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں، وہ نسیا منسیا ہوکر رہ گئے، جب کہ اسلام کی اخلاقی وروحانی تعلیم کو بنیاد بنا کر

ساری اسلامی فکر کی تشریح کرنے والے اور سلامتیٔ دل، تہذیب نفس اور محبت خداوندی کو اسلامی فکر میں فیصلہ کن اہمیت دینے والے علمائے ربانی اور صوفیاء کرام اب بھی موجود ہیں اور مسلم معاشرہ میں وہ لاکھوں، کروڑوں افراد کو دین وایمان پر قائم رکھنے کا ذریعہ ہیں۔ البتہ یہ بجا ہے کہ عقلیت کی عالمگیر تحریک کے ہمہ گیر اثرات کی وجہ سے سیکولر افراد اور اسلامیت کی عقلیت کی تشریح کے حامل افراد اہل تصوف سے استفادہ سے بڑی حد محروم ہیں۔

علمائے ربانی اور اہل تصوف کا پیغام وہی ہے، جو قرآن وسنت کی روح ہے، یعنی اللہ سے اپنے تعلق کو اتنا مستحکم کرو کہ نفس پرستی اور مادہ پرستی کی قوتیں اور تحریکیں افراد کے فکر ونظر اور دل ودماغ کو متاثر نہ کرسکیں۔

نیز اللہ کی محبت کے زیر اثر زندگی کا ہر پہلو صبغۃ اللہ (اللہ کے رنگ) میں رنگ جائے اور حمیت دین کا جذبہ اتنا غالب ہوجائے کہ غیر اللہ کے خلاف افراد کی داخلی مزاحمانہ قوت مستحکم ہوجائے۔

اگر تصوف کی جامع تعریف کرنے کے لئے کہا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ تصوف، زہد، دنیا سے استغنیٰ، ساری امیدیں اللہ سے وابستہ کرنے، دنیا کے مقابلہ میں ہر وقت آخرت پر نگاہ رکھنے، اللہ کی مخلوق سے محبت کرنے، آخری حد تک رواداری کا مظاہرہ کرنے، دینی حمیت کے پیدا ہونے، اللہ کے بندوں کی اصلاح کے لئے بے چین ہونے اور اس سلسلہ میں حکمت وبصیرت کے ساتھ ساری تدابیر اختیار کرنے، اسلام کی ظاہری اور باطنی تعلیمات پر صدق دلی سے عمل پیرا ہونے، اللہ کی زمین پر عاجز بندہ بن کر رہنے، بڑے پن سے پوری طرح دستبردار ہوجانے، اعتماد ذات سے بہرہ ور ہونے، نفسی قوتوں سے ہر وقت چوکنا رہنے، افراد معاشرہ کی طرف سے اشتعال کی ساری کوششوں کے باوجود صبر وبرداشت کا مظاہرہ کرنے، روزی کے معاملہ میں اللہ پر توکل کرنے، اللہ کو مقصود ومطلوب بنانے، سنت رسول

اللہ ﷺ پر عمل پیرا ہونے کے معاملہ میں طبیعت میں زکاوۃ حس کا پیدا ہونے، امیروں اور حکمرانوں کے شر سے بچنے کے لئے ان سے عدم تعلقات رکھنے، ان طبقات میں اصلاح کی خواہش رکھنے والوں کی اصلاح کے لئے متفکر ہوجانے، دنیاوی معاملات میں ہر قسم کے ذہنی دباؤ سے محفوظ ہونے، اللہ کی محبت، دین کی فکر، آخرت کی فکر کے علاوہ ساری فکروں سے (سارے تفکرات سے) بے نیاز ہونے، حالت خود احتسابی اور حالت مراقبہ کو غالب رکھنے، نفس اور شیطان کے مکر وفریب سے ہر وقت چوکنا رہنے، بڑے سے بڑے مقام تک رسائی کے باوجود اللہ کی عظمت کے استحضار کے غلبہ کی وجہ سے اپنے آپ کو مخلوق میں سب سے زیادہ سیاہ کار تصور کرنے، بحث ومباحثہ اور غیر ضروری گفتگو سے طبع خاطر نہ ہونے اور ایسے مواقع پر محض اللہ کے بندوں کی مصلحت کی خاطر گفتگو میں شریک ہونے، معاشرہ میں بگاڑ کے غلبہ کے وقت دوسروں سے زیادہ اپنی فکر کو غالب رکھنے، حق وصداقت پر گامزن ہونے کے لئے بڑی سی بڑی قربانی دینے، اللہ کے لئے جینے اور اللہ کے لئے مرنے کا حوصلہ رکھنا وغیرہ یہ ہے وہ تصوف اور اس کے خدوخال، جو امت کی فاضل شخصیتوں کی تحریروں کے مطالعہ سے ذہن پر مرتسم ہوتے ہیں۔

جو تصوف واحسان زندگی میں اتنی خوبیاں اور اوصاف پیدا کرتا ہو، آج ہمارا معاشرہ اس تصوف سے کتنا بے گانہ ہو چکا ہے، تصوف واحسان یعنی صحبت علمائے ربانی اور کثرت ذکر کے ماحول سے منقطع ہوجانے کی وجہ سے ہمارا معاشرہ نفس پرستی کی اس دلدل میں پھنس چکا ہے، جہاں سے نکلنے کے سارے راستے مسدود نظر آجاتے ہیں۔

موجودہ دور میں مادیت کی عالمگیر طاقتوں نے شیطان کی اکساہٹ پر ایسے آلات ایجاد کردیئے ہیں کہ فرد کی نفسی قوتیں، دنیا ومال کے بارے میں ان کے جذبات اور خواہشات ہر وقت موجزن ومشتعل ہونے لگے ہیں، اور مادی حسن کے مظاہر نے ایسی صورت اختیار کرلی ہے کہ فرد وافراد کا ایمان ہر وقت حالت خطرے میں رہنے لگا ہے۔ مزاج میں اشتعال غالب ہونے لگا ہے، قوت برداشت جواب

دینے لگی ہے، معمولی سے معمولی مادی نقصان سے ذہن، اعصاب اور نفسیات غیرمتوازن ہونے لگے ہیں ہر شخص ذہنی دباؤ کی حالت میں رہنے لگا ہے۔ ان حالات میں علمائے ربانی کی صحبت کے بغیر تحفظ ایمان اور تحفظ اقدار اسلامی دشوار تر ہوگیا ہے۔ اب محض رسمی ایمان اور فرائض کی محض رسمی بجا آوری، فرد وافراد کو مادیت پرستی اور نفس پرستی کی عالمگیر قوتوں کے برپا کردہ سیلاب کی لہروں میں بہنے سے بچانے کا موجب نہیں بن سکتے، اس وقت اسلام اور ایمان کی شاہراہ پر گامزن ہونے کے لئے "احسان" کے اجزاء کا ہونا از حد ضروری ہے، "احسان" کے یہ اجزاء ہر مسلمان کی ایمان کی سلامتی کے لئے موت وحیات کی حیثیت رکھتے ہیں، ان اجزاء سے بہرہ وری ہی زندگی ہے ان اجزاء سے محرومی ہی موت کے مترادف ہے اور ان اجزاء کا حصول صحبت علمائے ربانی کے بغیر دشوار تر ہے۔

اگرچہ نفس کی قوت ہمیشہ اور ہر دور میں طاقتور رہی ہے، سابق انبیاء کی قوموں کا زوال، ان پر عذاب، اور ان قوموں کی طرف سے قبولیت حق سے انکار کا بنیادی سبب نفس پرستی کی داخلی وخارجی قوتیں ہی تھیں۔ لیکن موجودہ دور میں نفس پرستی کی داخلی وخارجی قوتوں کی حملہ آوری کی صلاحیت میں بے پناہ اضافہ ہو چکا ہے۔

اس کتاب میں شامل اکابر بزرگوں اور ممتاز فاضل شخصیتوں کی تحریروں کا حاصل یہی ہے کہ علمائے ربانی کی صحبت کے بغیر قلب کو وہ انوار حاصل نہیں ہوتے، جس سے وہ نفس پرستی کی داخلی وخارجی قوتوں کے خلاف مزاحمت کرسکیں اور نفس امارہ سے نفس مطمئنہ کی راہ پر گامزن ہوسکیں۔

کتاب میں جن اکابر بزرگوں اور فاضل شخصیتوں کی تحریریں شامل ہیں، ان کے نام یہ ہیں۔

(۱) حضرت علی ہجویریؒ (۲) حضرت خواجہ شہاب الدین سہروردیؒ (۳) حضرت مخدوم احمد یحیٰی منیریؒ (۴) امام غزالیؒ (۵) شاہ ولی اللہؒ (۶) ابن خلدون

(۷) علامہ ابن جوزیؒ (۸) مولانا اشرف علی تھانویؒ (۹) علامہ اقبالؒ (۱۰) مولانا مناظر احسن گیلانیؒ (۱۱) مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ (۱۲) مولانا عبدالماجد دریابادیؒ (۱۳) مولانا محمد منظور نعمانیؒ (۱۴) یوسف سلیم چشتیؒ (۱۵) مولانا محمد حنیف ندویؒ (۱۶) خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ (۱۷) مولانا شاہ ابو احمد غلام دستگیر (۱۸) علامہ یوسف القرضاوی (۱۹) جاوید اکبر انصاری صاحب آخر میں ایک مضمون مشہور مستشرق پروفیسر اے۔ جے۔ کا شامل ہے۔ کتاب کے آخری حصے میں راقم الحروف کے پانچ چھ مضامین شامل ہیں۔

تصوف کی حقیقت واصلیت اور اس کے اہداف وخدوخال اور اس کی شرعی آربری حیثیت کے فہم اور تصوف کے سلسلہ میں جملہ غلط فہمیوں کے ازالہ کے سلسلہ میں زیر نظر کتاب ایک مستند دستاویز کی حیثیت اختیار کر گئی ہے، اس لئے کہ کتاب میں شامل مضامین ان عرفاء، علماء اور فضلا کے ہیں، جو امت کا قیمتی سرمایہ ہیں، جن کے تبحر علمی اور سیرت وکردار ہماری تاریخ کا روشن باب ہے۔

راقم الحروف، اپنے مربی حضرت قبلہ مولانا عبدالحی صاحب مدظلہ (مانسرہ) کا ممنوں ہے کہ اس عاجز کو ان کی خصوصی دعائیں حاصل ہیں اور توجہات اور فیض نظر بھی۔ یہ کہنا بجا ہوگا کہ اس عاجز کو دینی خدمت کی جو سعادت حاصل ہے، اس میں حضرت ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خانؒ اور ان کے وصال کے بعد اب حضرت مولانا عبدالحی مدظلہ کی دعاؤں وتوجہات ہی کو دخل حاصل ہے۔

راقم، محترم جناب ڈاکٹر عرفان الکریم انصاری صاحب کا مشکور ہے اور دل کی گہرائیوں سے دعا گو بھی کہ عمر رسیدگی (۹۲ سال کی عمر) کے باوجود موصوف دامے، درمے سخنے ہمارے ساتھ مسلسل تعاون فرما رہے ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں اجر عظیم عطا فرمائے اور دین ودنیا کی جملہ سعادتوں سے بہرہ ور فرمائے۔ (آمین)

۱۵ جولائی ۲۰۰۹ — محمد موسیٰ بھٹو

ظاہری علوم کی بلندی سے تصوف کی گہرائیوں تک

امام غزالیؒ کی کہانی ان کی اپنی زبانی

امام غزالیؒ، تصوف سے وابستگی سے پہلے عقلی اور ظاہری علوم میں اپنے دور میں سارے علماء سے ممتاز تھے، بغداد یونیورسٹی کے پرنسپال تھے۔ لیکن علوم میں اس ممتاز حیثیت کے باوجود باطنی طور پر وہ شدید مضطرب رہے۔ تصوف نے ان کے اضطراب کو کس طرح دور کیا اور اہل تصوف سے انہیں کیا حاصل ہوا، اور تصوف سے پہلے وہ کس طرح حب جاہ وحب مال میں مبتلا تھے، اس کی ساری کہانی انہوں نے اپنی کتاب المنقذ من الضلال کتاب میں بیان کی ہے، ہم یہاں اس کتاب کی تلخیص پیش کرنے پر اکتفا کر رہے ہیں۔ (مرتب)

میں جب ان تمام علوم کی تحقیق وتفحص سے فراغت پا چکا، تو پوری توجہ سے صوفیا کے طریق حق کی طرف مائل ہوا۔ میں نے دیکھا کہ ان کی راہ صرف علم وفن کی راہ نہیں، بلکہ علم وعمل دونوں کی راہ ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ نفس کی دشوار گذار گھاٹیوں کو عبور کیا جائے، اخلاق ذمیمہ کو ترک کر کے، دل کو اس لائق ٹھہرایا جائے کہ اس میں غیر اللہ کے لیے قطعاً کوئی گنجائش نہ رہے۔ اور اللہ کے ذکر اور یاد کے ساتھ، اس کی آبادی اور زینت کا اہتمام کیا جائے۔

چونکہ اس سے متعلقہ علم میرے لیے عمل سے سہل تر تھا، اس لیے قدرتاً پہلے ان کتابوں کو پڑھنا شروع کیا، جن میں تصوف کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔ جیسے ابو طالب مکی کی قوت القلوب اور الحارث المحاسبی کے مولفات۔ ان کے علاوہ ان اقوال کے مطالعہ کا موقع بھی ملا، جو جنید، شبلی اور ابو یزید بسطامی اور ان کے مشائخ کی طرف منسوب ہیں۔ اس سے مجھے ان کے بارہ میں اتنا علم حاصل ہوگیا، جتنا کہ

تحصیل وسماع سے ممکن ہے۔ مگر ان کے لطائف اور خصوصی اسرار کا احاطہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا، جب تک کہ انسان تعلیم وتعلم کی حدوں سے گزر کر، ذوق وحال کی سرمستیوں سے واقف نہ ہو، اور اپنے اندر صفات واخلاق کی تبدیلیاں نہ پیدا کرے اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے؟ کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ ایک آدمی جب صحت وتندرستی کی کنہ علمی کو پالے، تو صحت وقوت کے فوائد سے بھی بہرہ مند ہو جائے۔ یا شکم سیری کی علمی تعریف معلوم کرلے تو اس سے اس کے پیٹ کے خلا بھی پُر ہو جائیں۔ سکر ومستی کو جاننا اور چیز ہے اور سکر وسرمستی سے دوچار ہونا شئے دیگر۔ کتنے ہی طبیب ومعالج ایسے ہیں کہ بیماری کی حقیقت سے آگاہ ہیں۔ اسباب وعلائم مرض کو بھی اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ اور دوا ونسخہ کا بھی پورا پورا علم رکھتے ہیں، مگر خود اپنی صحت کے معاملہ میں کچھ زیادہ خوش قسمت نہیں۔ پھر جس طرح ان دونوں حقیقتوں میں فرق ہے، اسی طرح زہد وورع کی کیفیتوں کو جان لینے اور ان کو اپنے اندر پیدا کرنے میں فرق ہے۔

میں نے جب اس فرق کو محسوس کیا، تو ان لوگوں کی صحبت میں رہنا شروع کیا، اس سے اندازہ ہوا کہ یہ حضرات اصحاب اقوال نہیں، اصحاب احوال ہیں، یہ بھی معلوم ہوا کہ جہاں تک سماع وتعلیم کے فوائد کا تعلق ہے، ان سے میں نے اپنا دامن بھر لیا، لیکن ابھی اس علم کو حاصل کرنا باقی ہے، جو محض ذوق وسلوک سے حاصل ہوتا ہے۔

اس سے پہلے میں شرعی وعقلی علوم کو آزما چکا تھا اور دین وفکر کے جن راستوں پر چل چکا تھا، اس سے اتنا معلوم ہو ہی چکا تھا، کہ تین باتوں کا ماننا بہرحال ضروری ہے۔

(۱) اللہ پر محکم ایمان

(۲) نبوت کی قلبی تصدیق اور

تقویٰ کی حقیقت اور احتسابِ نفس

ایمان کی یہ تین بنیادیں دل میں نقش ہو چکی تھیں۔ لیکن کسی ایک ہی اور معین دلیل کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس کے متعدد اسباب تھے، اور مختلف قرائن اور تجربے تھے، ان کی تفصیل تحریر میں نہیں آ سکتی۔ اب یہ راز منکشف ہوا، کہ عالمِ آخرت کی بہرہ مندیاں بجز تقویٰ کے اور نفس کو خواہشات سے بچانے کے، حاصل نہیں ہو سکتیں۔ لیکن یہ تقویٰ کیا ہے؟ تقویٰ اس سے تعبیر ہے کہ قلب علائق دنیا سے دست بردار ہو جائے، اور انسان اس دارالغرور سے منہ موڑ کر دارالخلود کی طرف رُخ کر لے۔ یہی نہیں، بلکہ پوری توجہ وہمت سے اللہ کی طرف عنانِ التفات پھیر لے۔ مگر یہ مقام آسانی سے میسر ہونے والا نہیں۔ اس کے لیے عزت وجاہ کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ مال و دولت سے کنارہ کش ہونا پڑتا ہے اور ہر طرح کے لگاؤ اور شور وغل سے دل کو ہٹانا ہوتا ہے۔

میں نے اس نقطہ نظر سے، جب اپنے احوال کا جائزہ لیا، تو کیا دیکھتا ہوں کہ علائق میں بُری طرح گرفتار ہوں۔ اعمال پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ ان میں تدریس وتعلیم کا مشغلہ جو نسبتہ بہتر ہے، وہ بھی کچھ لائق قدر نہیں، کیونکہ جن علوم کا میں درس دے رہا ہوں، وہ آخرت وعقبیٰ میں کام آنے والے نہیں۔

پھر جب نیتوں کو ٹٹولا تو یہاں بھی بگاڑ نظر آیا۔ یوں محسوس ہوا کہ اس مشغلہ سے مقصود اللہ کی رضا جوئی نہیں ہے، بلکہ اس کا محرک جاہ طلبی کا جذبہ ہے اور شہرت ونام آوری کا داعیہ ہے۔ اس صورتِ حال سے دوچار ہونا تھا کہ آنکھیں کھلیں اور معلوم ہوا کہ جہنم کے کنارے پر ہوں اور اگر تلافی احوال کی کوئی کوشش بروئے کار نہ لائی گئی، تو اس میں گر جانا یقینی ہے۔

کشاکش

اس تجزیہ احوال کا خیال آنا تھا کہ فکر دامنگیر ہوئی اور ایک عرصہ تک حیص بیص کے عالم میں رہا۔ زمامِ اختیار اگرچہ اب تک میرے ہاتھ میں تھی، تاہم قوتِ فیصلہ کھو چکا تھا۔ کبھی یہ سوچتا کہ بغداد سے نکل جاؤں اور جاہ وثروت کے ان احوال سے دست کش ہو جاؤں۔ کبھی مواقع آ گھیرتے۔ ایک قدم آگے بڑھاتا تو دوسرا پیچھے کو ہٹاتا۔ اگر کسی صبح کو عقبیٰ کی طلب صادق دل میں کروٹ لیتی، تو شام کو جنودِ شہوت ہلہ بول دیتے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ ہمتیں پست ہو جاتیں۔ ایک طرف، دنیا کی خواہشات بغداد ہی میں رہ جانے پر مجبور کرتیں اور دوسری طرف داعیہ آخرت کوچ! کوچ! پکارتا اور کہتا کہ عمر بہت کم رہ گئی ہے۔ سفر جو درپیش ہے، طولانی ہے اور علم وعمل کی جس پونجی پر تمہیں ناز ہے، وہ ریا وتخیل سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی، اس لیے اب اگر آخرت کے لیے تیار نہیں ہوتا اور اس وقت علائق دنیا سے پیچھا نہیں چھڑاتا تو اس کا توقع کب پیدا ہوگا۔ جب ایسے خیالات سطحِ دل پر ابھرتے تو دل چاہتا کہ بغداد سے بھاگوں۔ لیکن پھر فوراً ہی شیطان پلٹ کر دل میں ڈال دیتا کہ "یہ کیفیتیں تو سراسر عارضی ہیں۔ ان کی اطاعت ہرگز اختیار نہ کرنا، کیونکہ اس وقت تو یہ جاہ ورتبہ تمہیں بغیر کسی تکدر کے حاصل ہے، اور اس میں تمہارا کوئی شریک اور خصم بھی نہیں۔ لیکن اگر ان کیفیتوں سے متاثر ہوکر، تم نے اس کو چھوڑ دیا تو اس کے بعد تمہارا دل پھر اس ٹھاٹھ پر للچائے گا اور اس وقت اس کے حصول کی کوئی صورت نہ ہوگی۔"

امدادِ غیبی سے زبان بند ہو گئی

اس تردد اور بے یقینی کی حالت میں کوئی چھ ماہ تک پڑا رہا۔ کبھی خواہشاتِ دنیا روکتیں اور کبھی دواعی آخرت ہرب وفرار پر اکساتیں۔ آخر غیب سے سامانِ معاونت پیدا ہوا، اور میں نے حدِ اختیار سے نکل کر اضطرار کی سرحدوں میں قدم رکھا،

یعنی یکا یک میری زبان بند ہوگئی، اور میں نے مجبوراً درس وتعلیم کے مشغلوں سے علیحدگی اختیار کرلی۔ اب یہ حالت تھی کہ طالب علم میرے پاس آتے تھے، اور میں چاہتا بھی تھا کہ ان کو پڑھا کر ان کا دل خوش کروں، مگر زبان بالکل چلتی نہ تھی، اس پر دل بدرجہ غایت غمگین ہوا۔ کھانا پینا یکسر چھوٹ گیا۔ قوتِ ہضم نے جواب دے دیا اور نوبت یہاں تک پہنچی، کہ نہ کھانے کی کوئی چیز بھاتی تھی، اور نہ پانی کا ایک گھونٹ پیا جا سکتا تھا۔ نقاہت تھی کہ تمام قویٰ میں جاری وساری! اطبا نے تھک ہار کر علاج سے ہاتھ اٹھایا اور کہا کہ "یہ کوئی جسمانی عارضہ نہیں بلکہ اس کے دل پر پہلے کوئی صدمہ پہنچا ہے اور پھر اس نے مزاج کی طرف رخ کرلیا ہے۔ اب جب تک اس صدمہ کا علاج نہ ہو اور دل کو راحت میسر نہ آئے، دوسرے عوارض کا ازالہ نہیں ہو سکتا۔"

میں نے محسوس کیا کہ اس اضطرار کے ہاتھوں قطعی عاجز ہوگیا ہوں اور میرا کوئی اختیار باقی نہیں رہا۔ اس مرحلہ پر میں نے ایک عاجز وبے بس انسان کی طرح، اس ذاتِ گرامی کی طرف دعا کا ہاتھ بڑھایا، جس کی تعریف ہی یہ ہے:

امن یجیب المضطر اذا دعاہ

یا وہ جو بے بسوں کی دعائیں سنتا ہے۔

اس سے جاہ ومال اور عیال واولاد سے علیحدگی اختیار کرلینا آسان ہوگیا، چنانچہ سفر کی ٹھانی۔ لوگوں کو یہ یقین دلایا کہ مکہ معظمہ کا ارادہ ہے۔ حالانکہ ارادہ یہ تھا کہ شام کو مستقر ٹھہراؤں اور واپسی کا نام نہ لوں۔ یہ تدبیر اس لیے اختیار کی کہ مبادا خلیفہ اور میرا حلقہ احباب اس فیصلہ پر مطلع نہ ہو جائیں، اور مجھے روک نہ دیں۔ علمائے عراق میرے اس عزم وارادہ کے مخالف تھے۔ اس لیے انہوں نے اس پر ملامت بھی کی کہ اس شان وشکوہ سے کیوں دستبردار ہورہا ہوں۔ ان کے نزدیک یہ منصب تعلیم اور مسند درس، جس پر کہ میں فائز تھا، ایسی نہ تھی کہ اس کو چھوڑ دینا دینی

خدمت سمجھا جاتا، کیونکہ وہ تو اسی کو بہت بڑا دینی اعزاز قرار دیتے تھے۔ یہ تھا ان کا مبلغ علم۔

قیاس آرائیاں

میری اس روش نے عوام کو عجیب عجیب قیاس آرائیوں میں ڈال دیا۔ جو لوگ عراق سے دور تھے، وہ تو میری اس حرکت کو حکام کے ایما پر محمول کرتے تھے۔ اور جو حکام کے قریب تر تھے، وہ جب دیکھتے کہ حکام کس قدر میری طرف ملتفت ہیں اور میں کتنا ان سے بدکتا اور دور رہتا ہوں، تو وہ یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ "یہ کوئی آسمانی تدبیر ہے۔ اس کا سبب اس کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا کہ اہل اسلام اور گروہ علما کو نظر بد لگ گئی ہے۔"

بہرآئینہ میں نے بغداد چھوڑ دیا، اور جس قدر مال و دولت میرے پاس تھا، اس میں سے بقدر کفالت بچوں کے لیے رکھ کر، باقی سب اللہ کی راہ میں دے دیا۔ اور جو رکھ لیا وہ اس بنا پر کہ عراق کا مال مسلمانوں کے مصالح کے لیے وقف ہے۔ اس لیے میرے بچوں کے لیے، اس سے زیادہ نافع مال اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔

بغداد کو چھوڑنے کے بعد میں نے شام کا رخ کیا اور قریباً دو سال تک یہاں رہنا ہوا۔ ان دو سالوں میں عزلت وخلوت، اور مجاہدہ و ریاضت شب و روز کا مشغلہ تھا۔ غرض یہ تھی کہ تزکیۂ نفس کی نعمت پاؤں۔ اخلاق سنوریں، اور قلب اللہ کی یاد کے لیے یکسوئی حاصل کرلے۔ یہ لائحۂ عمل وہی تھا، جس کو میں نے صوفیا سے سیکھا تھا۔ میرا یہ روزانہ کا معمول ہوگیا تھا کہ دمشق کی ایک مسجد کے منارہ پر چڑھ جاتا اور دروازہ بند کرکے ذکر وشغل میں دن بھر لگا رہتا۔ پھر یہاں سے بیت المقدس کو منتقل ہوگیا اور مقام صخرہ میں ہر روز جا کر عبادت میں مشغول رہنے لگا۔

پھر فریضۂ حج کے داعیہ نے کروٹ لی۔ اور دل نے چاہا، کہ مکہ ومدینہ کے فیوض وبرکات سے بہرہ مندی حاصل کی جائے، اور حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے ہاں

حاضری دینے کے بعد، روضۂ رسول اللہ ﷺ کی زیارت کا شرف حاصل کیا جائے۔ اس خیال کا آنا تھا کہ حجاز کا قصد کیا۔

وطن کی یاد

حج سے فراغت ہوئی، تو بال بچوں کی کشش نے کھینچا اور وطن کی یاد دلائی۔ میں اگرچہ ان علائق سے دور ہو چکا تھا، تاہم وطن میں آنا ہی پڑا۔ یہاں پر بھی عزلت گزینی کا شوق قائم رہا۔ چنانچہ مجبوریوں کے باوجود تصفیۂ قلب کی خاطر خلوت وعلیحدگی کا انتظام کرتا رہا۔ اور جس طرح بھی بن پڑا ذکر وفکر اور خلوت وعزلت کے لمحوں سے استفادہ کرنے میں کوتاہی نہ ہونے دی۔ اگرچہ اس اثناء میں حوادث زمانہ، بال بچوں کی ضروریات اور معاش کی مصروفیتیں خلل انداز ہوتی رہیں اور یہ جھمیلے بار بار خلوت کی مسرتوں کو مکدر کرتے رہے، لیکن بایں ہمہ خلوت کی مسرتوں کی طرف رجوع کرتا ہی رہا۔

اس کشاکش اور خلوت ومراقبہ پر دس سال گزر گئے۔ اس عرصہ میں ایسے ایسے امور کا انکشاف ہوا کہ ان کا شمار ناممکن ہے۔ اس مرحلہ پر صرف اسی قدر بتاؤں گا کہ جس کا جاننا نفع مند اور مفید ہے۔

مجھے قطعیت کے ساتھ معلوم ہوا کہ صوفیا ہی کا گروہ ہے، جو خصوصیت سے اللہ کی راہ پر گامزن ہے۔ انہیں کی سیرت سب سے بہتر ہے۔ انہیں کا طریقہ زیادہ صاف ہے اور انہیں کے اخلاق زیادہ پاکیزہ اور بلند ہیں، بلکہ اگر تمام عقلا وحکما کی عقل وحکمت کو جمع کر لیا جائے اور واقفان شریعت کے اسرار وعلم کو ملا لیا جائے، تاکہ ان سے بہتر سیرت کی تشکیل ہو سکے، تب بھی ان کے اخلاق وسیرت کے ڈھانچے کو بدلنا ضروری نہ ہو، کیونکہ صوفیا کی تمام حرکات وسکنات، چاہے ظاہری ہوں، چاہے باطنی، مشکوٰۃ نبوت ہی سے تو مستنیر ہیں۔ اور نور نبوت سے بڑھ کر اور کوئی نور روئے زمین پر اس لائق نہیں کہ اس سے روشنی حاصل کی جائے۔ مقصود یہ

ہے کہ ایسے طریق کی بلندی اور وسعت پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے، جس میں پہلی شرط ہی دل کو ماسواء اللہ سے پاک کرنا ہے۔ اور جس کی تکبیر تحریمہ ہی یہ ہے کہ دل کو اللہ کے ذکر میں مستغرق رکھا جائے۔ جس کا آغاز یہ ہو، اور انتہا یہ ہو کہ سالک اللہ کی ذات میں اپنے کو کلیتاً فنا کر ڈالے۔

فنا فی اللہ سلوک کا پہلا زینہ ہے

فنا فی اللہ کا یہ درجہ آخری، کسب واختیار کی رعایت سے ہے، ورنہ سلوک کا تو یہ پہلا زینہ ہے اور اس سے پہلے جو کچھ ہے، اس کو اس کی دہلیز سمجھے، کیونکہ یہاں تو پہلے مرحلہ ہی پر مکاشفات ومشاہدات کا آغاز ہو جاتا ہے۔ صوفیا جب اس مرحلہ میں داخل ہوتے ہیں، تو عالم بیداری میں پہلے فرشتوں اور انبیا کی روحوں کو براہ راست دیکھتے ہیں، ان کی باتیں سنتے ہیں اور ان سے علوم ومعارف کا استفادہ کرتے ہیں۔ یہی نہیں، ان کے احوال میں ترقی ہوتی ہے، اور صور وامثال کے اس مشاہدہ سے آگے بڑھ کر، ایسے مقام پر فائز ہو جاتے ہیں کہ جہاں کی کیفیات وتاثرات پر الفاظ وحروف کا جامہ ٹھیک نہیں بیٹھتا۔ اور اگر کوئی جرأت کر کے، اس حالت کی وضاحت کرنا بھی چاہے، تو خطا ولغزش کا سہارا لیے بغیر چارہ نہیں۔ مختصراً یوں خیال کیجیے کہ یہ قرب واتصال کی ایسی کیفیت ہے کہ ایک گروہ تو اس کو حلول سے تعبیر کرتا ہے۔ ایک طائفہ اتحاد کہتا ہے۔ اور ایک اس کو وصول کے نام سے پکارتا ہے۔ یہ سب خیالات غلط ہیں۔ ہم نے اپنی کتاب "المقصد الاسنیٰ" میں اس کی نشان دہی کی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جو شخص بھی اس حقیقت سے دوچار ہو، اس کو اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہیے۔

فکان ما کان مما لست اذکره   فظن خیرا ولا تسئل عن الخبر

(جو ہوا سو ہوا، میں اس کی تفصیلات بیان کرنے کا نہیں۔ بس یہ سمجھ لو کہ اچھا ہی ہوا، زیادہ کاوش اور ٹٹول سے کیا فائدہ)

تصوف کی ضرورت

غرض یہ ہے کہ جس نے تصوف کی بہرہ مندیوں سے اپنا دامن طلب نہیں بھرا، اس نے حقیقتِ نبوت کی بو بھی نہیں سونگھی، اور بجز نام اور اسم کے اس کو کچھ حاصل نہیں ہوا۔

اولیاء اللہ کی کرامات، انبیاء کی بدایات ہیں۔ چنانچہ کرامات کی یہ کیفیتیں آں حضرتؐ کو اسی وقت میسر تھیں، جب آں حضرتؐ غارِ حرا میں خلوت وعبادت کی غرض سے تشریف لے گئے اور اس حد تک ان میں والہانہ طور پر مصروف رہے کہ عربوں کو یہ دیکھ کر کہنا پڑا:

ان محمدا عشق ربه.

حضرت محمدؐ تو خدا پر عاشق ہو گئے ہیں۔

یہ وہ حالت ہے، جس کو ہر وہ شخص محسوس کر سکتا ہے، جو اس راہ پر گام فرسا ہے، اور جس کو یہ ذوق حاصل نہیں، وہ تجربہ اور سننے سے جان سکتا ہے۔ بشرطیکہ ان لوگوں کے ساتھ کثرت سے نشست وبرخاست رکھے اور قرائن واحوال سے حق ویقین کو معلوم کرنے کی کوشش کرے۔ یہ وہ گروہ پاک ہے کہ جو شخص بھی ان کے ساتھ محبت رکھے گا، حقیقت وایمان کی نعمت سے محروم نہیں رہے گا۔ کیونکہ ان کا کوئی ہم نشین بھی اس معاملہ میں بدنصیب نہیں۔

علم، ذوق اور ایمان

اگر کوئی شخص برہان ودلیل کی وساطت سے، کسی نتیجہ تک پہنچتا ہے تو یہ علم ہے۔ اگر ان نتائج سے روبرو دوچار ہے، تو یہ ذوق ہے اور اگر انہی نتائج ومعارف کو سنتا اور تجربے سے دریافت کرتا ہے تو اسے ایمان کہتے ہیں۔

یہ ہیں علم کے تین درجے جن کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے:

یرفع اللہ الذین آمنوا منکم والذین اوتوا العلم درجات

اللہ تعالیٰ تم میں سے مومنوں کے اور اہل علم کے درجات بڑھاتا رہتا ہے۔

ان کے ماسوا جو لوگ ہیں، وہ سراسر جاہل ہیں اور یہی اس حالت وکیفیت کے منکر بھی ہیں۔ اور انہی کو مذاق اور ٹھٹھوں کی سوجھتی ہے۔ یہی وہ حضرات ہیں، جن کے بارہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ومنھم من یستمع الیک حتی اذا خرجوا من عندک قالوا الذین اوتوا العلم. ماذا قال انفا اولئک الذین طبع اللہ علیٰ قلوبھم واتبعوا اھواء ھم فاصمھم واعمھم.

"انہی میں سے بعض ایسے بھی ہیں، جو تمہاری باتوں کو سنتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب تمہاری بزم ارشاد سے نکل کر باہر جاتے ہیں تو اہل علم سے کہتے ہیں۔ دیکھو اس نے آج کیا کہا۔ یہ وہی لوگ ہیں، جن کے دلوں پر اللہ نے مہر لگادی ہے اور وہ اپنی خواہشات کی پیروی کررہے ہیں۔ سو اللہ نے ان کو بہرہ اور اندھا بنا رکھا ہے۔"

عمل میں تساہل کے اسباب

پھر میں نے اس بات پر غور کیا کہ لوگوں کے دلوں میں نبوت اور حقیقتِ نبوت کے بارے میں شکوک کیوں ابھرتے ہیں اور لوگ عمل میں قاصر ومتساہل کیوں ہیں۔ جب اس نقطۂ نظر سے نظر دوڑائی تو اس کے چار سبب معلوم ہوئے:

(۱) فلسفہ اور علوم حکمیہ میں غور وخوض
(۲) تصوف کی غلط تدبیر
(۳) تعلیمیہ کے عقائد
(۴) علما کا طرزِ عمل

میں ایک عرصہ تک، اس ٹوہ میں لگا رہا کہ ضعفِ ایمان اور ضعفِ عمل کے حقیقی اسباب کا کھوج لگاؤں۔ چنانچہ اس غرض سے میں متعدد لوگوں سے ملا اور ان

میں سے ایک ایک کو پوچھا کہ شریعت کی پیروی واطاعت میں تم کیوں متامل ہو۔ تمہارے دل میں کس نوعیت کے شبہات ہیں، اور تمہارے دلوں میں کیا کیا وساوس اور راز پوشیدہ ہیں؟ میں ان سے یہ کرید کرید کر دریافت کرتا، کہ اگر تم آخرت پر فی الواقع ایمان رکھتے ہو، تو اس کے لیے تیاری کیوں نہیں کرتے، اور تم کیوں اسے دنیائے دوں کے عوض بیچ ڈالتے ہو۔ کیا یہ کھلی ہوئی حماقت نہیں۔ جب دنیا کے معاملے میں تم اتنے سمجھ دار ہو، کبھی دو روپے کے عوض ایک روپیہ قبول نہیں کرتے، تو آخرت کے معاملہ میں یہ بے وقوفی کیوں روا رکھی جاتی ہے کہ بے انتہا آسائشوں کو محدود اور عارضی مسرتوں کے بھینٹ چڑھایا جارہا ہے۔ لیکن اگر بدقسمتی سے تمہارا ایمان آخرت پر نہیں ہے، تب تمہیں سمجھ لینا چاہیے کہ تم صراحتا کافر ہو، اس صورت میں تمہیں اصلاحِ نفس کی فکر کرنا چاہیے۔ اور یہ معلوم کرنا چاہیے کہ اس کفر کی تہہ میں کون کون سے اسباب کارفرما ہیں۔ جن کی وجہ سے تمہیں اقرارِ کفر پر جرأت ہورہی ہے۔ اگرچہ کھلے بندوں تم اس کا اظہار نہیں کرتے۔

علماء کا حال

ایک ہی سوال کے مختلف جواب ملے۔ کسی نے کہا کہ اگر شریعت کی محافظت ضروری ہو، تو گروہ علما کو اس کا کہیں زیادہ خیال رکھنا چاہیے تھا۔ حالانکہ فلاں مشہور عالم ہے، مگر اس حقیقت کے باوجود نماز نہیں پڑھتا۔ فلاں بہت بڑا فاضل ہے، مگر شراب پیتا ہے۔ فلاں صاحب حرام خوری کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اوقاف کا مال کھا جاتے ہیں، یتیموں کی دولت سمیٹ لیتے ہیں، اور بادشاہ وقت کے وظیفہ خوار ہیں، لیکن رشوت قبول کرلینے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے۔ اسی طرح ایک صاحب صوفی صافی ہونے کے مدعی ہیں، ان کا کہنا ہے کہ میں علم معرفت کے ایسے درجہ تک پہنچ گیا ہوں، کہ وہاں عبادات کی کچھ حاجت نہیں۔ کسی نے کہا کہ اباحت ہی صحیح ہے۔ اباحت کے قائلین وہ ہیں، جنہوں نے تصوف کو چھوڑ کر گمراہی اختیار کی ہے۔

یہ خود بھی گمراہ ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ تعلیمیہ نے یہ حجت پیش کی کہ حق کی پہچان ہی دشوار ہے، کیونکہ جن راستوں سے گذر کر حق کی طرف پہنچنا ممکن تھا، وہ سبھی تو بند ہیں۔ مذاہب میں وہ اختلاف ہے، کہ اس بات کا فیصلہ کرنا مشکل ہوگیا ہے کہ ان میں کون برسرِ حق ہے اور کون برسرِ حق نہیں۔ دلائل عقلیہ میں تعارض اور تناقض ہے اور رائے وقیاس تو بالکل ناقابل اعتماد ہے۔ ان حالات میں یقین کی ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے، وہ یہ کہ صاحبِ تعلیم کو تسلیم کیا جائے اور بس۔ اب آپ ہی بتایئے کہ یقین کو پاکر شک کو کون اختیار کرے۔

فلسفہ اور اس کے اثرات

کسی کسی نے میرے سوالات کا جواب دیا، کہ جناب میں نے جن خیالات وافکار کو اپنایا ہے، وہ بر بنائے تقلید نہیں، بلکہ سوچ سمجھ کر یہ مسلک اختیار کیا ہے۔ مجھے فلسفہ کے مطالعہ سے اچھی طرح معلوم ہوگیا ہے، کہ نبوت کا مقصد کیا ہے۔ میرے نزدیک نبوت کی غرض وغایت، اس سے زیادہ نہیں کہ حکمت و مصلحت کے تقاضوں کو قائم رکھا جائے۔ عوام کو لڑائی جھگڑے اور فتنہ وفساد سے باز رکھا جائے اور اس طرح کی پابندیاں اور قیود ان پر عائد کی جائیں کہ یہ شہوات وخواہشات کی رو میں نہ بہہ جائیں، بلکہ لیے دیے رہیں اور اپنے کو قابو میں رکھیں۔ میں چونکہ ان جاہل عوام میں نہیں ہوں، اور فلسفہ وحکمت کا پورا پورا ذوق رکھتا ہوں اور جانتا ہوں کہ مصلحت وحکمت کس انداز کی زندگی کی متقاضی ہیں۔ اس لیے تکالیفِ شرعیہ کے التزامات کو غیر ضروری سمجھتا ہوں۔

یہ ہے ان لوگوں کے ایمان کا سب سے اونچا زینہ، جنہوں نے حکما فلسفیوں کے افکار کا مطالعہ کیا ہے اور ابن سینا اور فارابی کے ذریعہ ان کے خیالات وافکار کو حاصل کیا ہے۔ بظاہر یہ لوگ اسلام سے بہرہ مند بھی ہیں۔ ان میں ایسے لوگ بھی ملیں گے، جو قرآن پڑھتے ہیں، نمازوں میں باقاعدہ حاضر ہوتے ہیں۔ اسلامی

اجتماعات میں بھی حصہ لیتے ہیں اور زبان سے شریعت کے محامد بھی بیان کرتے ہیں، لیکن اس کے باوجود بادہ خوری، اور فسق وفجور کے دوسرے کاموں سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان سے اگر کہا جائے کہ اگر نبوت کا تصور صحیح نہیں ہے، تو نماز پڑھنا کیا ضرور ہے؟ تو اس پر یہ کہتے ہیں کہ اس سے تھوڑی سی ورزش ہوجاتی ہے۔ اس کا یہ بھی فائدہ ہے کہ عوام کے ساتھ ربط قائم رہتا ہے، اور اس طرح مال ودولت اور بال بچے ان کی زد سے محفوظ رہتے ہیں۔ ان میں کے بعض کہتے ہیں کہ شریعت ونبوت برحق ہے۔ لیکن جب یہ پوچھا جاتا ہے کہ پھر شراب خوری کی وجہ جواز کیا ہے؟ تو کہتے ہیں کہ شراب اس وقت ناجائز ہے، جب کوئی شخص پی کر بدمست ہوجائے اور اخلاقی حدود کا خیال نہ رکھ سکے، میرے لیے اس بنا پر جائز ہے کہ میں اپنے حکیمانہ ذوق کی وجہ سے قرینے سے بقدر ضرورت پیتا ہوں، علاوہ ازیں اس کا یہ فائدہ بھی ہے کہ اس سے ذہن وفکر کی صلاحیتیں بڑھتی ہیں اور دماغ میں تیزی آتی ہے۔

ابن سینا کی وصیت اور شراب نوشی

اور تو اور ابن سینا کو دیکھیے، اپنی وصیت میں اللہ تعالیٰ سے شرائع کی پیروی واحترام کا عہد کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ آئندہ تکالیفِ دینیہ کا پورا پورا خیال رکھوں گا، لیکن شراب خوری کو مستثنیٰ ہی رہنے دیتا ہے، زیادہ سے زیادہ اس سلسلہ میں جو احتیاط برتتا ہے، وہ یہ کہ اب جو شراب پیوں گا، تو لہو ولعب کی خاطر نہیں، بلکہ محض دوا وشفا کی خاطر۔ یہ ہے اس ڈھنگ کے فلسفیوں کا درجۂ ایمانی اور مرتبۂ علم کہ التزام شریعت کے اقرار کے بعد بھی، اس ام الخبائث کو چھوڑ دینے پر تیار نہیں۔ اسی طرح کے خیالات واہیہ سے سادہ لوح مسلمان اکثر ان کے دھوکہ میں آجاتے ہیں۔ ہمارے نزدیک ان کے دام تزویر میں آجانے اور مات کھا جانے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے، کہ جو لوگ ان پر معترض ہوتے ہیں، وہ ان کی سیرت وکردار اور ایمان وعقیدہ کی کمزوریوں کو بیان کرنے کے بجائے، ان کے علوم جیسے ہندسہ یا منطق پر

اعتراضات وارد کرنے شروع کردیتے ہیں، حالانکہ ان علوم کی تحصیل فی نفسہ ضروری ہے۔

نشرِ علوم کی طرف دوبارہ رجوع

میں نے جب ان حالات کو بچشم خود دیکھا، اور محسوس کیا کہ لوگوں میں مندرجہ بالا اسباب کی بنا پر گمراہی پھیل گئی ہے۔ ان کے ایمانوں میں فتور آگیا ہے، اور عمل کے دواعی کمزور ہوگئے ہیں، تو میں نے سوچا کہ کیوں نہ اصلاح احوال کی طرف توجہ کی جائے، جب کہ دل کا اصرار بھی اسی بات کا متقاضی تھا۔ اور یہ امر میرے لیے کچھ دشوار بھی نہ تھا کہ ان کے عقیدہ وعمل کی کمزوریوں کو کھول کر بیان کروں، کیونکہ میں حکما فلسفیوں کے علوم وفنون خوب پڑھے ہوئے تھا۔ بہرخود غلط صوفیا کے تلبیسات کو بھی اچھی طرح سے جانتا تھا۔ تعلیمیہ کے عقائد بھی مجھ سے چھپے ڈھکے نہ تھے، اور نام نہاد علما کی بدکرداریوں کو بھی آزما چکا تھا۔ دل نے کہا کہ اٹھو! اور خلق خدا کی اصلاح وہدایت کا بیڑہ اٹھاؤ۔ آخر کب تک خلوت وعزلت میں رہوگے، اور فکر وذکر کی لذتوں سے باہر نہیں آؤگے، جب کہ ایک دنیا گمراہ ہورہی ہے اور بیماری نے ان لوگوں پر بھی قابو پالیا ہے، جن کو کہ طبیب یا چارہ ساز ہونا چاہیے تھا۔ ایک خیال یہ آتا کہ تو کس طرح ان تاریکیوں کو اجالے سے بدل سکے گا، جب کہ یہ دور ہی ظلمت وتاریکی کا ہے۔ اور دین میں تساہل روا رکھنے کو مطلق معیوب خیال نہیں کیا جاتا، تو اگر ان کو حق کی طرف بلائے گا بھی تو یہ ماننے والے کب ہیں، بلکہ الٹا تیرے دشمن ہوجائیں گے اور وہ وہ سنائیں گے کہ زندہ رہنا مشکل ہوجائے گا۔ اصلاح وہدایت کا کام تو اسی وقت انجام پا سکتا ہے، جب وقت اس کے لیے سازگار ہو اور بادشاہ دین دار اور قاہر ہو، جو اس کام کی حوصلہ افزائی کرے، اور زور وقوت سے دین کی باتوں کو منوائے۔

بادشاہ کا اصرار

یہ سوچ کر میں نے اللہ تعالیٰ سے معذرت چاہی، اور عزلت گزینی کو بدیں وجہ مرجح سمجھا، کہ بحث ومناظرہ سے ان لوگوں پر غالب آنا ممکن نہیں۔ پھر بغیر کسی تحریک خارجی کے، بادشاہ کے دل میں خود بخود اس داعیہ نے کروٹ لی اور انہوں نے مجھے حکم دیا کہ خلوت کی پناہ گاہوں سے نکلوں اور نیشاپور جاؤں، تاکہ اس ضعف ایمان وعمل کے فتنہ کا سدباب ہو سکے۔ اس حکم پر ان کا اس درجہ اصرار تھا کہ اگر میں اس کی مخالفت کرتا، تو اس کو میری وحشت اور بداخلاقی پر محمول کیا جاتا۔ میں نے بھی خیال کیا کہ معذرت ورخصت کا وقت نہیں رہا۔ اب اگر گوشہ نشینی نہیں چھوڑتا ہوں، اور اصلاح وہدایت کا فریضہ انجام نہیں دیتا ہوں، تو اس کو سراسر کسل اور آرام طلبی سمجھا جائے گا یا اس کی تہہ میں یہ ڈر پوشیدہ ہوگا کہ عوام کی ناراضی مول لے کر اپنے کو خواہ مخواہ ذلیل کیوں کروں۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں مناسب نہیں۔ اور پھر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی تو ہے:

احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا آمنا وھم لا یفتنون ولقد فتنا الذین من قبلھم.

کیا یہ لوگ اس غلط فہمی میں ہیں کہ ان کو اتنی سی بات پر چھوڑ دیا جائے گا، کہ وہ کہہ دیں کہ ہم ایمان لائے اور ان کو آزمائش کی بھٹی میں ڈالا نہیں جائے گا اور ہم ان سے پہلے ایمانداروں کی آزمائش کر چکے ہیں۔

ولقد کذبت رسل من قبلک فصبروا علیٰ ما کذبوا واوذوا حتیٰ آتاھم نصرنا. ولا مبدل لکلمات اللہ. ولقد جاء ک من انباء المرسلین. (الانعام: ۳۴)

جو پیغمبر آپ سے پہلے ہوئے ہیں، ان کی بھی تو تکذیب ہوئی۔ لیکن انہوں نے اس تکذیب اور ایذا دہی پر صبر کیا۔ یہاں تک کہ ہماری مدد آ پہنچی اور کوئی اللہ

کے کلمات کو بدلنے والا نہیں، اور آپ تک دوسرے انبیا کی خبر تو پہنچ ہی چکی ہے۔

اہل دل سے مشورہ طلبی

تاہم میں نے چند اہل دل اور ارباب مشاہدہ سے مشورہ کر لینا مناسب سمجھا، سب نے یہی کہا کہ عزلت وخلوت کی لذتوں کو ترک کر دینا چاہیے اور ہدایت کے میدان میں اترنا چاہیے۔ اس پر مستزاد یہ کہ بہت سے صلحا نے منامات وکشوف کی بنا پر، یہی رائے دی اور کہا کہ انشاء اللہ یہ اقدام خیر ہی پر منتج ہوگا، جیسا کہ اس کا وعدہ ہے کہ وہ ہر ہر صدی کے آغاز پر اپنے دین کی تجدید کرے گا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ تجدید واحیا کا فریضہ آپ ہی کے ہاتھوں اس طرح سرانجام پائے۔ ان خیالات کا آنا تھا کہ رجا کا پہلو استوار ہوا اور ان شہادتوں کے پیش نظر یہی قرار پایا کہ بادشاہ کے حکم کو مان لینا چاہیے۔ تب میں ذی قعدہ ۴۹۹ھ میں اس مہم کی تکمیل کے لیے نیشاپور کے قصد سے چل کھڑا ہوا۔ اتفاق ملاحظہ ہو کہ بغداد سے نکلنے کی بھی یہی تاریخ تھی، یعنی ذی قعدہ ۴۸۸ھ، اس حساب سے عزلت گزینی کا زمانہ گیارہ برس کے لگ بھگ ہوتا ہے۔ میرا اس طرح خلوت وعزلت کے گوشوں کو یک دم ترک کر دینا بھی، اللہ تعالیٰ کے عجائب مصدرات سے ہے۔ ورنہ یہ کبھی حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آیا تھا کہ کبھی ایسا بھی ہو سکے گا۔ یہ فیصلہ بالکل اسی ڈھنگ کا تھا، جیسے بغداد چھوڑ دینا اور تمام طرح کے تعلقات کو منقطع کر دینا۔ اس زمانے میں کبھی وہم نہ گزرا تھا کہ یہ سب واقعات ہونے والے ہیں۔ یہ تو محض اس پروردگار عالم کا کرم ہے، جو مقلب القلوب اور احوال وکیفیات پر اثر انداز ہونے والا ہے کہ اس نے ارادہ وعزم کی ہمتیں اس آسانی سے بدل دیں اور کیوں نہ ہو جب کہ:

قلب المومن بین اصبعین من اصابع الرحمن.

مومن کا دل اللہ کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہے۔

تعلیم وتدریس کے منصب کو دوبارہ اختیار کرنا جذبۂ ترک کے منافی نہیں

یہ واضح رہے کہ میں جانتا ہوں کہ علمی مشغلوں میں دوبارہ پڑنا اور پھر درس و تدریس کی مسندوں کو سنبھالنا، اس کیفیت سے کہیں مختلف ہے، جس کے تحت پہلے ان سب چیزوں سے دست بردار ہوا تھا، کیونکہ پہلے یہ حالت تھی کہ میں ایسے علم کی نشر واشاعت میں مصروف تھا، جو جاہ وطمطراق کا موجب ہوتا تھا۔ اور اب ایسے علم کی طرف رجوع ہو رہا تھا، جو یہ سکھاتا ہے کہ عزت وجاہ کو ترک کیونکر کیا جاتا ہے۔

مجھے اس کا قطعی علم نہیں کہ میں اپنے ارادوں میں کامیاب ہو سکوں گا یا نہیں۔ ہاں اتنا البتہ یقین ہے کہ ہر چیز منشائے الٰہی کے تابع ہے۔ اور میرا یہ اقدام اپنا اقدام نہیں، بلکہ اس کے کرم خاص کا نتیجہ ہے۔ اور میں خود اس فریضہ سے نمٹنے کے لیے آمادہ نہیں ہوا، بلکہ اللہ تعالیٰ مجھ سے خصوصیت سے یہ کام لینا چاہتا ہے، اس سے ہر آن یہ دعا ہے کہ میرے اصلاحِ احوال کے درپے رہے، مجھے راہِ راست پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، تاکہ دوسروں کو بھی ہدایت نصیب ہو اور مجھے اس بات کی بھی توفیق بخشے کہ میں ہمیشہ حق کو حق سمجھوں اور باطل کو باطل اور پھر حق کی پیروی میں کوشاں رہوں اور باطل سے اجتناب کروں۔

تصوف کی توضیح وتشریح

حضرت علی ہجویری پانچویں صدی کے بزرگ ہیں۔ وہ ان بزرگانِ دین میں شامل ہیں۔ جن کا روحانی فیض زندگی کے بعد بھی جاری ساری رہتا ہے۔

ان کی متعدد کتابیں ہیں، لیکن معروف کتاب "کشف المحجوب" کے نام سے ہے۔ جو تصوف، آداب تصوف اور اہل تصوف کے سلسلہ میں اپنی نوعیت کی اہم ترین کتاب ہے، جو علمی حلقوں میں صدیوں سے پڑھی جا رہی ہے۔ اور تصوف کی امہات کتابوں میں شامل ہے۔ زیرِ نظر مضمون آپ کی اسی کتاب سے ماخوذ ہے۔ (مرتب)

فصل

اللہ تعالیٰ جل مجدہ کا ارشاد ہے:

وعباد الرحمٰن الذین یمشون علی الارض ھوناً واذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما۔

یعنی خاص بندگانِ الٰہی وہ ہیں، جو زمین پر جھک کر چلتے ہیں اور جب جاہل انہیں چھیڑیں تو وہ بجائے جواب کے ان سے کہہ دیتے ہیں کہ اچھا خوش رہو۔

اور حضور کریم ﷺ نے فرمایا: **من سمع صوت اھل التصوف فلا یومن علیٰ دعائھم، کتب عنداللہ من الغافلین.** یعنی جس نے اہل تصوف کی آواز سن کر، اس کی دعوت کو قبول نہ کیا۔ وہ اللہ کے نزدیک غافلوں میں لکھا گیا۔

(مگر یہ سمجھنا ضروری ہے کہ صوفی کون ہے، اس لئے کہ) لوگوں نے نام صوفی کی بہت سی تعریفیں بنا رکھی ہیں اور اس بحث میں بہت سی کتابیں بھی تالیف ہوچکی ہیں۔ ایک جماعت تو کہتی ہے کہ صوفی کو صوفی اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ کمبلی اوڑھتا ہے۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ صوفی کو صوفی اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ بروز قیامت صف اول میں ہونگے۔ ایک گروہ اس طرف گیا کہ صوفی وہ کہا جاسکتا ہے، جو اصحاب صفہ کے ساتھ محبت کا رابطہ رکھے۔ ایک فرقہ کہنے لگا کہ صوفی ایک اسم ہے، جو صفا سے مشتق ہے۔ یعنی جس کے اندر باہر صفائی ہے، وہ صوفی کہلانے کا حق دار ہے۔ اگرچہ بلحاظ طریقت ان توجیہات میں بہت سے لطافت حاصل ہوسکتے ہیں، لیکن آخری طبقہ کی تعریف کے اعتبار سے لغوی معنی اس کے علیحد ہی نکلیں گے۔

اگرچہ صفا بمعنی صفائی ہے، اور صفائی ہر پہلو سے اچھی ہے اور صفائی کی ضد کدورت ہے اور حضور کریم ﷺ نے بھی فرمایا ذھب صفو الدنیا وبقی کدرھا۔ دنیا کی صفائی جاتی رہی اور اس کی کدورت باقی رہ گئی اور ظاہر ہے کہ لطیف و صاف چیز اور میلی و مکدر چیز علیحدہ ہے، اور یہ امر ظاہر و واضح ہے کہ اہل تصوف نے اپنے تمام معاملات اخلاقی، معاشی، معادی و ملی مہذب کر لئے اور اپنا دل کدورت و آفات دنیا سے صاف فرما لیا۔ اس لئے انہیں صوفی کہا گیا اور یہ اسم عارفوں کے لئے اسمائے اعلام سے ہے۔ کیونکہ اہل تصوف کے خطرات قلبیہ اور امورات حالیہ اس اسم سے کہیں بڑھ کر ہیں۔ بلکہ درحقیقت لفظ صوفی ان کے صفات باطن کی ترجمانی کیلئے کافی نہیں اور ان کے معاملات تقرب پر اس کی تعریف محیط نہیں ہوسکتی۔ بنا برایں اسم صوفی کا مبداء اشتقاق، صفا بنا کر اسے اسم صفت قرار دینا صحیح نہیں ہوسکتا۔

پھر یہ زمانہ تو وہ ہے کہ حضرت حق تعالیٰ شانہ نے عوام کو حقیقت تصوف اور اہل تصوف سے حجاب میں فرما کر اور ان کے منصب جلیل کی بلندی اور نورانیت قلبی

کو عوام کے دلوں سے مخفی کر دیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ کوئی جماعت تو یہ سمجھ بیٹھی کہ تصوف ایک طریقہ کا نام ہے، جو مشاہدہ باطن میں مدد دیتا ہے اور اصلاح ظاہری کر دیتا ہے۔ کوئی اس گمان میں بہک گیا کہ یہ صوفی اور تصوف ایک بے حقیقت چیز ہے اور یہی نام محض ہے، بے اصل نام ہے، حتیٰ کہ بعض کمینہ جاہل تو مسخرہ پن کر کے، نافہم اہل علم کو اپنے ساتھ ملا کر محض ظاہر بین نظروں سے دیکھ بھال کر، سرے سے تصوف کے منکر ہوگئے اور باوجودیکہ وہ سخت حجاب غفلت میں محجوب ہیں۔ لیکن اپنی اندھی نظر کی تحقیق پر مطمئن ہیں۔ ان کی پیروی جاہل عوام کا، لانعام نے کی اور صفا باطن کی خواہش ہی دل سے نکال دی اور سلف صالحین اور صحابہ کرام کے طریقہ کو چھوڑ بیٹھے۔

ان الصفا صفت الصدیق ان اردت صوفیا علی التحقیق

یعنی اگر تو واقعی صوفی کا متلاشی ہے، تو یاد رہے کہ صوفی ہونے کی شان تو صرف صدیق اکبر رضی اللہ عنہ میں تھی۔ اس لئے کہ صفا حقیقی کے لئے ایک اصل اور ایک فرع ہے، اصل تو دل کا ماسواللہ سے منقطع ہونا ہے اور فرع دل کا، دنیا غدار کی محبت سے خالی کر دینا۔

اور یہ دونوں صفتیں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ میں تھیں، جن کا نام حضرت عبداللہ ابوبکر بن ابی قحافہ رضی اللہ عنھما ہے۔ اس لئے کہ صدیق اکبر کی ہی وہ ہستی ہے، جسے امام اہل طریقت اور مقتدا اہل تصوف کہا جائے اور یہی وہ پاک باطن تھے، جن کا دل اغیار سے اس قدر صاف تھا کہ صحابہ کرام میں بھی آپ کی ہستی کا ہمسر کوئی نہ تھا۔

بوقت وفات، قیامت آیات سرور عالم ﷺ، تمام صحابہ کرام اس عالی جناب گردوں رکاب کی جدائی سے اس قدر دل شکستہ تھے، کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے از خود رفتگی میں برہنہ تلوار کھینچ کر با آواز فرما دیا۔ خبردار، جس نے کہا کہ حضور

عالم ﷺ انتقال فرما گئے ہیں۔ اس کا سر قلم کردوں گا۔

حضرت افضل البشر بعد الانبیاء صدیق اکبر رضی اللہ عنہ باہر تشریف لائے اور بلند آواز سے فرمایا: **الا من عبد محمداً فان محمداً قدمات ومن عبد رب محمدٍ فانه حی لا یموت.** خبردار رہو، جس نے حضور کریم ﷺ کو حی قدیم جان کر عبادت کی تو بیشک اس ہستی پاک نے وجود عنصری سے پردہ فرمالیا اور جو عابدالٰہی ہے، وہ سن لے کہ وہ جل مجدہ حی قدیم ہے، اسے فنا نہیں۔

پھر حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی:

وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل افان مات او قُتل انقلبتم علیٰ اعقابکم.

''ہمارے محبوب محمد ﷺ خدا نہیں، بلکہ ہمارے رسول ہیں۔ ان سے پہلے جو رسول آئے، وہ بھی دنیا سے تشریف لے جاچکے ہیں۔ تو کیا اگر یہ انتقال فرما جائیں یا شہید ہوجائیں تو تم اپنے پچھلے رویہ پر لوٹ جاؤ گے۔''

یعنی جو محمد کو خدا جانتا ہے، اسے چاہئے کہ سن لے کہ وہ تشریف لے گئے ہیں اور جو خدائے محمد ﷺ کا پوجنے والا ہے، وہ جان لے کہ وہ ذات زندہ اور قدیم ہے۔ گویا دوسرے الفاظ میں اپنی صفوۃ کا مظاہرہ فرمایا کہ تعلیم مصطفےٰ علیہ التحیۃ والثنایہ ہے کہ سوا ذات باقی کے، سب فانی ہیں اور فانی سے وراء الوریٰ ذات باقی ہے، تو جس کا دل اس لئے کہ جب میرا دل تعلق دنیا سے آزاد ہوچکا، تو مجھے ناگزیر تھا کہ گندگی اور میل کچیل سے صفائی حاصل کروں۔ یہ ہے مکمل صفت صوفی صافی و عارف صادق کی اور اس سے انکار کرنا درحقیقت انکار ذات باقی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ (درحقیقت تصوف یہی ہے) اس لئے کہ صوفی وہ ہے، جو صاف دل ہو۔ اقسام کدورات سے اور صفائی کی ضد تکدر اور میلا پن ہے۔ دوسرے مکدر و ملوث بدنیا ہونا، صفات بشری میں داخل ہے اور درحقیقت صوفی وہ ہے، جو حقیقت تکدر سے گذر کر

صفائی بشری سے بالاتر ہوجائے۔

جیسا کہ بحالت استغراق ومحویت مشاہدہ جمال و لطائف حسن یوسف کے زنان مصر پر کیفیت بشریہ نے غلبہ کیا، پھر اس کیفیت غلبۂ بشریت پر جب حسن یوسفی نے اپنا عکس حسن ڈالا، تو وہ غلبۂ بشریت درجۂ غایت کو پہنچ گیا۔ پھر جب مشاہدہ حسن نہایت پر پہنچا، تو غلبۂ بشریت فنا ہوگیا اور انہیں زنان مصر کی زبان سے حاشاللہ ماھذا ابشرا، نکل گیا یعنی خدا کی قسم یہ بشر نہیں ہے۔ (یہاں درحقیقت حسن یوسفی نے زنان مصر کی کیفیت بشری کو بدل ڈالا تھا) مگر انہوں نے اس دعویٰ کا نشانہ حسن یوسف علیہ السلام کو بنایا اور فی الواقع اپنا حال بیان کیا تھا۔ اس کی تائید میں مشائخ طریقت رحمہم اللہ نے فرمایا۔

لیس الصفا من صفات البشر لان البشر مدر والمدر یخلوا من الکدر.

صفائی صفات بشریہ سے نہیں، اس لئے کہ بشر کی تخلیق مٹی سے ہے اور مٹی کے خواص ذاتی ہیں کدورت و کثافت ہے۔ بنا برایں بشر کو کثافت و کدورت بغیر چارہ نہیں۔

تو ظاہر ہوگیا کہ حصول صفا افعال و اعمال سے نہیں ہوسکتا اور بشر کی صفت خالص مجاہدہ و ریاضت سے زائل ہونا، ناممکن ہے۔ اس لئے کہ صفت کو افعال و اعمال سے کوئی نسبت نہیں اور اسم صفا کو کسی نام یا کسی لقب سے کوئی حاصل نہیں کرسکتا، بلکہ 'الصفا صفة الاحباب وهم شموس بلا سحاب' صفت صفا محبوبان الٰہی کی صفت ہے اور وہ وہ ہیں کہ اپنی صفت بشری سے فانی ہوکر، صفت محبوبان الٰہی کے ساتھ باقی ہوچکے ہیں اور محبوبان بارگاہ وہ ہیں کہ ان کی کیفیت حالی اہل حال کی نظروں میں مثل اس آفتاب کے روشن اور نمایاں ہے، جس پر ابر کا بھی حجاب نہیں۔

چنانچہ حدیث ہے کہ سرور عالم ﷺ سے صحابہ کبار رضی اللہ عنہ نے حضرت حارثہ بن

زید کے متعلق دریافت کیا۔ حضور نے فرمایا۔

عبدٌ نوراللہ قلبہ بالایمان۔ وہ وہ بندہ ہے، جس کا دل اللہ تعالیٰ نے نور ایمان سے منور کر دیا۔ اس کا چہرہ یہ اثر رکھتا ہے کہ اس میں کیفیت مقررہ موجود ہے، (یعنی جس طرح چاند آفتاب کو دیکھ کر روشن ہو جاتا ہے۔ حضرت حارثہ بن زید کے چہرہ کو دیکھنے سے دیکھنے والے میں نور آ جاتا ہے) اور حارثہ کو اللہ نے اپنے نور سے مصور و مخلوق فرمایا۔

کہتے ہیں کہ مشائخ سلاسل میں کسی نے یہ شعر کہا:

ضیاء الشمس والقمر اذا اشترکا
انموذج من صفاء لحب التوحید اذ [illegible]

"نور آفتاب و قمر جب ایک دوسرے کے ساتھ مل جائیں، تو ان کی مثال توحید و محبت کی صفاء ہے، جبکہ یہ دونوں یکجا جمع ہو جائیں۔"

لیکن یاد رکھو کہ نور آفتاب و ماہتاب کے وہاں کچھ حقیقت نہیں۔ جہاں نور محبت و توحید جبار کی جلوہ ریزی ہو۔ مگر اس مثال سے نور محبت و توحید کو اس لئے محبت دی گئی کہ اس دنیا میں کوئی نور اس سے زیادہ منور نہیں اور ہماری چشم ظاہر آفتاب و ماہتاب کے نور سے آسمان دیکھ رہی ہے اور بس اور نور توحید و محبت سے قیام، قیامت تک کے تمام احوال دنیا میں منکشف ہوتے ہیں، اور اس پر جملہ مشائخ طریقت مجتمع ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ جب بندہ قید مقامات سے آزاد ہو جاتا ہے تو کیفیت مکدرہ سے خالی ہو کر، مقام تغیر وتلون سے بھی آزادی حاصل کر لیتا ہے اور اس میں تمام احوال محمود آ جاتے ہیں اور وہ صفات محمود کے ساتھ متصف ہوتا ہے۔ مگر اس وقت وہ فی نفسہ قید اوصاف سے بھی بیگانہ ہوتا ہے اور قید صفات سے بالاتر ہو کر، حمید ومحمود کو نہیں دیکھتا۔

یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے لطائف کے مشاہدہ سے، عجب ونخوت نہیں کرتا، مغرور

نہیں ہوتا، بلکہ اس کی کیفیت حالیہ ادراک عقل سے مخفی ہو جاتی اور اس کا ظاہر و باطن شکوک وظنون و اوہام کے دستبرد سے محفوظ بلکہ پاک ہوتا ہے۔ یہ اس لئے کہ اس کی کیفیت حضوری کو ذہاب یعنی حجاب دخفا نہ ہو اور اس کا وجود ظاہری علل واسباب کا محتاج نہ رہے۔

لان الصفا حضور بلا زهاب ووجو بلا اسباب۔

"یعنی مقتضا صفاء قلب یہ ہے کہ اسے نہ زائل ہونے والا، حضور حاصل ہو اور بلا احتیاج سبب سب کچھ موجود ہو۔"

حاضری بارگاہ بلا غیبت ہو اور ہر چیز بلا سبب و علت موجود، اس لئے کہ جو حضور غیبت سے مٹ جائے، وہ حضور نہیں اور جو موجود سبب وعلت سے موجود ہو وہ موجود کوئی وجود نہیں رکھتا۔

جب اس درجہ پر صوفی پہنچ جاتا ہے، تو عقبیٰ میں فنا ہو جاتا ہے اور بظاہر جسم انسانی رکھکر، ربانی بن جاتا ہے، پھر اس کی نظر میں زر و جواہر اور کنکر و پتھر یکساں ہوتے ہیں، اور جو کچھ اہل دنیا پر دشوار ہوتا ہے، وہ سب ان پر آسان ہو جاتا ہے۔ خواہ اتباع احکام ہو یا اور کچھ۔

چنانچہ حضرت حارثہ بن زید رضی اللہ عنہ دربار رسالت میں حاضر ہوئے۔ حضور نے فرمایا:

کیف اصبحت یا حارثہ یعنی اے ابن زید آج تم نے کیسی صبح کی۔

قال اصبحت مومنا باللہ حقا فقال انظر ما تقول یا حارثة ان لکل شیء حقیقت فی حقیقت ایمانک فقال عزفت وحرفت نفسی عن الدنیا فاستوی عندی حجرها وزهبها وفضتها ومدرها فاسهرت لیلی و اظمات نهاری حتیٰ صرت کانی انظر الیٰ عرش ربی بارزاً و کانی انظر الیٰ اهل الجنة یتزاودون فیها و کانی انظر الیٰ اهل النار یتضارعون وفی روایة یتعاورون والحدیث.

حارثہ بن زید رضی اللہ عنہ نے عرض کی، حضور میں نے آج سچا مومن ہونے کی حالت میں صبح کی۔ حضور کریم ﷺ نے فرمایا: حارثہ غور کر۔ کیا کہہ رہے ہو۔ یاد رکھو، ہر چیز کی ایک حقیقت ہوتی ہے اور ہر چیز پر ایک دلیل۔ تیرے اس دعوئ کی کیا حقیقت ہے اور تیرے ایمان کی کیا دلیل۔

عرض کی، حضور میں نے اپنی جان کو دنیا سے علیحدہ کرلیا اور اپنا منہ دنیا سے موڑ لیا۔ اب میری نظر میں دنیا کا پتھر، سونا، چاندی، کنکر کوڑا سب یکساں ہے اور جب میں دنیا ومافیہا سے آزاد ہوچکا تو مقام اقصیٰ یعنی درجہ انتہائی پر پہنچ گیا۔ حتیٰ کہ آج میں نے نہار کی شکم پری اور شب بیداری میں مجھے (بہ تصدیق سرکار یہ منصب حاصل ہے کہ)، گویا میں رب اعلیٰ کے عرش بریں کا مشاہدہ بلاحجاب کر رہا ہوں اور گویا کہ میں اہل جنت کو دیکھ رہا ہوں اور وہ سیر وتفریح میں ہیں اور گویا کہ میں جہنمیوں کو دیکھ رہا ہوں، کہ وہ تڑپ رہے ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ آنکھیں پھاڑ کر جہنم میں دیکھ رہے ہیں۔ حضور کریم ﷺ نے فرمایا: 'عرفت' جان تو لیا تو نے، مگر 'فالزم' اب اس منصب کی محافظت کر۔ اس لئے کہ بس اس کے سوا اور عرفان (مخلوق کو حاصل نہیں)، ولیوں کو اسی منصب و نام سے پکارتے ہیں۔ کسی بزرگ نے مشائخ کرام سے فرمایا۔

من صفاه الحب فهو صاف ومن صفاه الحبيب فهو صوفي. جو محبت کے ذریعہ صاف ہوا، وہ صافی ہوا اور جو محبت حبیب میں محو و مستغرق ہوا، وہ غیر محبوب سے بری ہوکر، صوفی ہوگیا۔

اور بمقتضاء لغت اس اسم صوفی کا مشتق ہونا درست نہیں۔ اس لئے کہ لفظ صوفی معنیٔ لغوی سے وراء الوریٰ ہے۔ اس لئے کہ اگر اس کو بمناسبت معنی لغوی دیکھا جائے گا، تو اسے جنس ماننا پڑے گا۔ تاکہ وہ جنس کسی جنس سے مشتق ہوسکے۔ کیونکہ ہر مشتق کو اپنی مبداء اشتقاق سے مجانست لازمی ہے، اور لفظ صوفی، جس معنی

سے وابستہ ہے۔ وہ وہ ہے، جو صافی و مصفیٰ ہے اور جس قدر مبادی اشتقاق ہیں، وہ یقیناً ضد صفا ہیں۔ لہٰذا ضد سے ضد کا اشتقاق صحیح نہیں، تو اس کے معنی اظہر الشمس ہوگئے کہ اہل تصوف کے نزدیک تعریف صوفی محتاج تعریف نہیں اور اس کی تشریح کی حاجت نہیں۔ لان الصوفي ممنوع عن العبارة والاشارة، اس لئے کہ صوفی عبارت و اشارت سے روکا ہوا ہے۔ تو جب صوفی زبانی تعریفات وتعبیرات واشارات سے آزاد ہوا، تو سب جہاں اس کے لئے معنی اور تعبیر چھانٹا کرے اور کوئی اس کی حقیقت سمجھے یا نہ سمجھے۔ اسم صوفی کو ان تعبیرات سے کچھ خطرہ نہیں۔

تو بحالت حصول معنیٔ اہل کمال نے انہیں صوفی کہا اور جو اس کمال کا طالب اور اہل کمال سے وابستہ ہیں۔ ان کو متصوف۔ اور تصوف باب تفعل سے ہے اور یہ باب مقتضی تکلف ہے اور تصوف میں تکلف ومجاہدہ اس کی جڑ یعنی اصل کی ایک فرع اور شاخ ہے، اور مقتضاء لغت و معنی سے صوفی کے معنی حقیقت کا فرض ظاہر بلکہ اظہر ہے۔

الصفاء ولايت ولها آية ورواية والتصوف حكاية للصفاء بلا شكاية. یعنی صفا ولایت کا نام ہے اور اس کے لئے علامت اور روایت کی ضرورت ہے اور تصوف بلاشبہ حصول صفا کے لئے ایک حکایت ہے، جس میں شائبہ شکایت نہیں ہوتا، تو صفا کے روشن معنی ظاہر ہوگئے اور تصوف کا محض حکایت ہونا واضح ہوگیا۔ تو درجہ تصوف میں جو لوگ ہیں۔ ان کی تین قسم ہیں۔ ایک صوفی، دوسرا متصوف، تیسرا مستصوف۔

صوفی وہ ہے، جو اپنے وجود سے فانی ہوکر باقی بحق ہوگیا۔ قید مزاج وطبائع سے آزاد ہوکر، حقیقت حقائق کے ساتھ مل گیا۔

متصوف وہ ہے، جو اس درجہ کے حاصل کرنے کی آرزو میں تکلف ومشقت ومجاہدہ کر رہا ہے اور صوفی بننے کا خواہشمند ہے اور صوفیائے کرام کے رسم ورواج کی

پیروی میں اپنی اصلاح کرتا ہے۔

اور مستصوف وہ ہے، جو مال ومنال دنیاوی حاصل کرنے کی غرض سے صوفیاء کرام کے اعمال وافعال وحرکات کی نقل کرتا ہے۔ صوفیا کے اقوال کہتا پھرتا ہے۔ مگر خود محض بے خبر ہے اور کچھ نہیں جانتا۔ چنانچہ ایسے شخص کے ہی حق میں، مشائخ کرام نے فرمایا۔

المستصوف عندالصوفية كالذباب وعند غيرهم كالذياب.

مستصوف صوفیائے کرام کے نزدیک، ایک ذلیل مکھی ہے، جو کچھ کرتا ہے، وہ محض لغو اور فضول ہے اور عوام کے حق میں مستصوف مثل بھیڑیے کے ہے یا بجو کی طرح۔ وہ جو کچھ کرتا ہے، سب بیکار ہے۔ اس لئے کہ وہ جو کچھ کرتا ہے، اس سے اس کی مراد تھوڑے سے ٹکڑے کا حاصل کرنا ہے، تو خلاصہ یہ نکلا کہ صوفی صاحب وصول ہوتا ہے اور متصوف صاحب اصول اور مستصوف، صاحب فضول، جو صوفی ہے، اسے اصل کشف ووصل محبوب نصیب ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ رسم و لطائف میں مستقیم رہا اور جس کو درجہ فضول ملا، وہ سب سے پیچھے رہ گیا اور رسم کے دروازہ پر پڑا رہا اور اس پر حجاب معنی اس قدر پڑے کہ وہ محجوب ہوکر، وصل واصل دونوں سے محروم رہ گیا۔ اس حال کو مشائخ کرام نے اس قدر رموز میں بیان فرمایا ہے کہ سب کا بیان کرنا ممکن نہیں۔ تاہم بعض ان کی رموزات اس کتاب میں ہم بیان کریں گے۔ تاکہ ناظرین کو کافی فائدہ پہنچے۔ انشاء اللہ۔

فصل:- حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ **الصوفی اذانطق بان نطقه من الحقائق وان سكت نطقت عنه الجوارح بقطع العلائق.**

صوفی وہ ہے کہ جب کلام کرے، تو اس کا کلام اس کے حال کی حقیقت کا مظہر ہو اور کوئی ایسی بات کہے، جو اس میں نہ ہو اور جب وہ خاموش رہے تو اس کی خاموشی اس کے حال کی ترجمان ہو۔ اور علائق دنیاوی سے بے تعلقی کا ثبوت، اس

کے اعضا سے واضح ہو، گویا گفتار صوفی اس کے حسب حال ہو اور کردار صوفی میں شان تجرید مقدر ہو کہ قطع دنیا واضح نظر آئے۔ غرض کہ اگر وہ کلام کرے تو ایسا کہ سب اس پر صحیح اترے اور سچ نظر آئے اور خاموش رہے، تو خاموشی سے اس کے فقر کی ادائیں نظر آئیں۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

التصوف نعت رقيم العبد فيه قيل نعت للعبد ام للحق فقال نعت الحق حقيقته ونعت العبد رسم.

تصوف ایک ایسی صفت ہے، کہ بندہ اس صفت کے ساتھ ٹھہرتا ہے۔ بعض نے کہا کہ صفت اللہ تعالیٰ کے لئے ہے یا بندہ کے لئے، تو فرمایا بمعنی حقیقی تو ہر صفت مخصوص بذات باری تعالیٰ ہے۔ لیکن رسماً صفت بطور مجاز بندہ کے لئے ہوتی ہے۔

یعنی حقیقت تصوف یہ ہے کہ بندہ کی صفت کو فنا کردے اور صفات عبد کا فنا ہونا صفت حقہ باقی رہنے کو ہے اور یہی صفت حق ہے اور رسم تصوف دواماً بندہ سے مجاہدات و ریاضت کا تقاضہ کرتی ہے اور فنائے صفت استقامت و استمرار، اس مجاہدہ پر رکھنا یہ بندہ کی شان ہے۔

اور اس مضمون کو بالفاظ دیگر یوں بھی ادا کرسکتے ہیں، کہ حقیقت توحید میں بندہ کو کسی صفت سے متصف کرنا صحیح نہیں، اس لئے کہ صفات عبد حق عبد میں دوامی نہیں اور بندہ کی صفت کی حقیقت محض رسم ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں اور واضح طور پر روشن ہے کہ صفت عبد باقی نہیں رہتی، بلکہ بندہ میں کسی صفت کا آنا یہ ایک فعل ہے، اس قدیم الصفات کا اور ذات قدیم الصفات کے جتنے افعال ہیں، وہ سب اس کی ملک اور تحت قدرت ہیں تو درحقیقت جو صفت بندہ میں ہوگی، وہ صفت واجب تعالیٰ شانہ ماننی پڑے گی۔

اسے اور وضاحت سے یوں سمجھا جائے کہ جب اللہ تعالیٰ بندہ کو روزہ رکھنے کا

حکم دیتا ہے، تو بندہ کو اس حکم کی تعمیل کے وقت اسم صائم عطا ہوجاتا ہے۔ تو روزہ رکھنا بطریق رسم بندہ کی طرف منسوب ہے۔ ورنہ درحقیقت یہ صوم بھی از جانب الٰہی ہے، جیسا کہ حدیث قدسی میں حضور کو جناب باری تعالیٰ نے فرمایا: "الصوم لی وانا اجزیٰ بہ" (روزہ میرے لئے ہے اور میں اس کا بدلہ ہوں) یعنی وہ روزہ جو بندہ نے رکھا، وہ میرے حکم سے رکھا اور اس کے تمام کام اس کے مِلک ہیں۔ مگر یہ اضافت مِلک بندہ کی طرف جو ہے۔ درحقیقت بطریق رسم ومجاز ہے نہ کہ بطریق حقیقت۔

حضرت ابوالحسن نوری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "التصوف ترک کل حظ لنفس،" تصوف نام ہے، تمام حظوظ نفسانیہ کا ترک اور یہ دوطرح ہوتا ہے ایک رسمی طور پر دوسرے حقیقی صورت میں۔

یہ بھی درحقیقت عجیب وغریب شان ہے۔ اس لئے کہ اگر بندہ نے خوشی سے ترک حظ نفس کیا، تو فی نفسہ ترک حظ بھی تو ایک حظ ہے اور یہ خالص رسم ہے۔

اور اگر خوشی نے بندہ کو ترک کردیا اور حظ نفس خود علیحدہ ہوگیا، تو یہ فناء حظ ہوگا اور اس معنی کا تعلق درحقیقت مشاہدہ سے ہے۔

اس لئے کہ یہ امر واضح ہے کہ ترک حظ یعنی خوشی اور لذات نفسانیہ کا ترک کردینا، یہ بندہ کا فعل ہے اور لذات نفسانیہ اور حظوظ جسمانیہ کا فنا ہونا، من جانب اللہ ہے۔

اور یہ امر مسلمات سے ہے کہ فعل عبد محض رسم ومجاز ہے اور فعل حق حقیقت ذات۔

اور حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ کا وہ قول، جو ہم پہلے بیان کرچکے ہیں، وہ بھی اس امر کو ظاہر کرتا ہے اور حضرت ابوالحسن نوری رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں۔ الصوفیۃ هم الذین صفت ارواجهم فصاروا فی صف الاول بین یدی الحق.

صوفی وہ ہیں، کہ ان کی روحیں کدورت بشریت سے مجلّا ہوچکی ہوں۔ اور تمام آفات نفسانیہ سے پاک ہوکر، حرص وہوائے شہوانیہ سے خلاص پاکر، دربار الٰہی میں صف اول کے اندر درجہ تقرب پاتی ہیں، اور ماسوائے اللہ سے بعید ہوچکی ہیں۔

حضرت ابوالحسن نوری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں "الصوفی الذی لا یملک ولا یملک" صوفی وہ ہے، جو کسی کا مالک ہو، نہ کسی کی ملک۔ یعنی صوفی وہ ہے، جس کی قید میں کچھ نہ ہو اور وہ خود کسی کی قید میں مقید نہ ہو۔

اور یہ تعریف عین فنا کی ہے۔ اس لئے کہ فانی فی الصفت نہ کسی شے کا مالک بالذات ہوتا ہے، نہ مملوک غیر ذات۔ اس لئے کہ ملک اس کی صحیح ہوتی ہے، جو خود موجود ہے اور مملوکیت کا بھی وہی اہل ہے، جو موجود ہو تو مسئلہ واضح ہوگیا کہ صوفی متاع دنیا وآخرت میں سے خود کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا اور آپ نفس وحرص وحظ اور خواہشات کے ملک میں نہیں رہتا۔

گویا اپنی مشیت اور ارادہ کو ماسوی اللہ سے منقطع کرلیتا ہے، تاکہ غیر اس کی اطاعت وبندگی کا طمع نہ کرسکے اور یہ قول بالخصوص اس گروہ صوفیاء کے بہت مناسب حال ہے، جو فناء کل کے قائل ہیں اور میں ان کے خیالات کو اس کتاب میں نقل کرونگا۔ تاکہ تمہیں معلوم ہوجائے۔ انشاء اللہ، اللہ تمہیں اپنا برگزیدہ بنائے۔

حضرت ابن الجلا رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ التصوف حقیقت لارسم له. تصوف ایسی حقیقت کا نام ہے، جس کی تعریف رسمی نہیں ہوسکتی۔ اس لئے کہ رسم مخلوقات کا وہ حصہ ہے، جو معاملات میں مستعمل ہے اور تصوف حقیقۃً خاصۂ الٰہی ہے اور بات بھی یہی ہے، کیوں کہ جب تصوف مخلوقات سے اعراض کرنے کو کہا جاتا ہے، تو محالہ اس کے لئے رسم ورواج مخلوقی سے علیحدہ ہونا ضروری ہے۔

حضرت ابوعمر دمشقی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ التصوف رؤیت الکون بعین النقص بل غض الطرف عن الکون. تصوف یہ ہے کہ عالم کون کو بنظر نقص

وحدوث دیکھے اور یہ بھی بقا صفت کی دلیل ہے۔ بلکہ عالم سے آنکھ کو بند کرلے، تاکہ یہ دلیل فنا صفت کی مکمل ہوجائے۔ اس لئے کہ جب تک نظر عالم کون کی طرف رہے گی، خواہ ناقص ہو خواہ کامل۔ تو صفت باقی رہے گی۔ مگر جب کون ہی نہ رہے گا، تو نظر بھی اس پر نہ رہے گی، تو صفت کا فانی ہونا محقق ہوجائے گا۔

غرضیکہ جب صوفی اپنی ذات سے نابینا ہوجاتا ہے۔ ذات واجب کے ساتھ بینا بن جاتا ہے اور جبکہ صوفی ہوکر، طالب کون و فساد ہوا، تو اس کے تمام کاروبار کا تعلق اسی کی ذات کے ساتھ رہے گا، تو پھر اسے اپنے یا کسی اور کے ساتھ کوئی راستہ نہیں مل سکتا۔

تو ایک وہ ہوا جو خود کو دیکھتا ہے، مگر ناقص دیکھتا ہے اور ایک وہ ہے، جو اپنی آنکھیں ماسوی اللہ سے بلند کرکے کسی کو نہیں دیکھتا۔ تو جو دیکھ رہا ہے، اگرچہ ناقص ہی دیکھے، مگر ابھی اس کی چشم بینا پر حجاب دوئی ہے۔ اور ایک وہ جو دیکھتا ہے تو اپنی بینائی کی وجہ سے محجوب ہوجاتا ہے۔

اور ایک وہ جو ماسوی اللہ کو دیکھتا ہی نہیں۔ وہ اپنی چشم حق میں محجوب نہیں ہوتا، اور یہی اصل قوت ہے۔ جسے متوصفہ اور ارباب معانی اعلیٰ مقام بتاتے ہیں۔

بس اب اس سے زائد شرح کرنا اس مقام کے ساتھ ناموزوں ہے۔

حضرت ابوبکر شبلی رحمتہ اللہ نے فرمایا: التصوف شرک لانه صیانة القلب عن رویة الغیر ولاغیر. تصوف شرک طریقت ہے۔ اس لئے کہ متصوف اپنے دل کو محفوظ کرتا ہے۔ غیر کے دیکھنے سے اور صوفی کی نظر میں وجود غیر معدوم ہے۔

یعنی جب صوفی پر وحدة ذات کا پرتو کما حقہ، پڑ جائے تو مقام توحید میں رویت غیر کو شرکِ طریقت کہا گیا۔ اس لئے کہ جب قلب صوفی میں وجود غیر کی کوئی قدر ومنزلت ہی نہیں، تو اس سے حفاظت کرنا یا اس کے وہم میں ذکر غیر آنا ہی محال ہے۔

حضرت حصری رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا: التصوف صفاء السر من کدورة المخالفة. تصوف نام ہے، اپنے ضمیر کو مخالفت حق سے محفوظ رکھنے اور اس کے جلاء و نورانیت کو کدورت اوہام سے بچانے کا۔

اس لئے کہ محبت نام موافقت کا ہے اور موافقت ضد مخالفت ہے، اور دوست کو تمام عالم میں سوا اطاعت فرمان دوست کے کچھ محبوب ہی نہیں۔ تو جب دوست کی مراد وہی ہوئی جو دوست کی مراد تھی، تو پھر مخالفت وہاں کیونکر ممکن ہوسکتی ہے اور جب ممکن ہی نہیں تو اس کا وجود کہاں۔

حضرت محمد بن علی بن الحسین ابن علی بن ابی طالب رحمهم اللہ فرماتے ہیں۔ التصوف خلق فمن زاد علیک فی الخلق زاد علیک فی التصوف. تصوف ایک نیک خصلت ہے، جو زیادہ نیک خصلت ہے، وہ اعلیٰ صوفی ہے۔

اور نیک خصلت دو قسم پر ہے۔ ایک خصلت نیک بخت۔ دوسری خصلت نیک بخلوق۔ نیک خو بخت وہ ہے، جو رب جل مجدہ کی رضا و قضا میں راضی رہے اور نیک مخلوق وہ ہے، جو اللہ کے لئے مخلوق کا بار خدمت اپنے سر لے۔

اور یہ دونوں خصلتیں در حقیقت طالب کی طرف ہی ہوتی ہیں، یعنی ان خصلتوں کا تعلق طالب حق ہی ہوسکتا ہے۔ اس لئے وہ ذات بے نیاز متصف باستغنا ہے اور رضا و حظ خوشی و غصہ کے بار اٹھانے سے مبرا و بے نیاز ہے، یہ دوصفت درحقیقت نظارۂ وحدانیت میں موقوف و مربوط ہیں۔

حضرت ابومحمد مرتعش رحمتہ اللہ نے فرمایا۔ الصوفی لایستیق همة خطوته البتة.

صوفی وہ ہے کہ اس کا خطرہ قلبی بھی اس کے قدم ہمت سے قطعاً نہ بڑھ سکے، ہمیشہ اس کی ہمت اس کا خطرہ اس کا ارادہ سب یکساں ہو۔ یعنی اس کا جسم جہاں ہو، دل بھی وہاں ہو اور جس مقام پر دل ہو، اس جگہ اس کا تن ہو۔ جہاں اس کا قدم ہو،

وہاں ہی اس کا قول ہو اور جہاں اس کا قول ہو، وہاں ہی اس کا قدم ہو اور یہ بلاغیبو بیت نشان حضوری ہے۔ برخلاف ان کے جو کہتے ہیں، کہ صوفی اپنے وجود سے غائب ہوکر، ذات سرمدی کے ساتھ حاضر ہوتا ہے۔ یہ کچھ نہیں، بلکہ حاضر بحق بھی ہو اور حاضر بخود بھی۔ اور یہی حقیقی جمع الجمع ہے، کیونکہ جب تک رویت ذات اپنی ذات سے ہو، اس وقت تک وہ اپنے سے غائب وفنا نہیں اور جب یہ رویت اٹھ گئی، تو بغیر غیبوبیت کے حضوری ہوئی۔ اس اجمال کی تفصیل میں حضرت شبلی رحمتہ اللہ علیہ کا یہ قول خوب ہے، 'الصوفی فی لایریٰ فی الدارین مع اللہ غیر اللہ' (صوفی وہ ہے، جو دونوں جہان میں سوائے ذات قدیم کے کچھ نہیں دیکھتا) تو چونکہ بندہ غیر ہے، تو غیر کو نہ دیکھنا، اپنے آپ کو نہ دیکھنا ہوا۔ گویا حالت نفی و اثبات میں صوفی اپنے آپ سے بالکل فارغ ہوتا ہے۔

حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ التصوف مبنی علیٰ ثمان خصال. الشخاء والرضاء والصبر والاشارۃ والغربت ولبس الصوف والسیاحۃ والفقر اماالسخا فلا براھیم علیہ السلام واماالربنا فلا سحاق علیہ السلام واما الصبر فلا یوب علیہ السلام واماالاشارۃ فلزکریا علیہ السلام واماالغربیۃ فلیحیٰ علیہ السلام واما لبس الصوف فلموسیٰ علیہ السلام واماالسیاحۃ فلعیسیٰ علیہ السلام واماالفقر فلمحمد المصطفیٰ ﷺ وعلیھم اجمعین. تصوف آٹھ خصلتوں پر مبنی ہے، آٹھ پیغمبران اولعزم کی اقتدا سے صوفی بنتا ہے۔

(۱) سخاوۃ ابراہیم سے حاصل کرے۔ وہ وہ تھی کہ رضا محبوب میں، اپنے لخت جگر کو فدا کر دیا۔ (۲) رضا اسحٰق علیہ السلام کی اقتدا میں رضا مولا پر، اس درجہ راضی ہو کہ جان کی پرواہ نہ کرے۔

(۳) اور صبر ایوب علیہ السلام کے اقتدا میں کیڑوں کے ساتھ بھی، اگر امتحان

ہو تو بخوشی برداشت کرے اور غیرت رحمانی پر صبر سے کام لے۔

(۴) اور اشارہ زکریا علیہ السلام یہ ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ان لا تکلم الناس ثلاثۃ ایام الا رمزا. (تم لوگوں سے تین دن تک نہ بول سکو گے، مگر اشارہ سے) اور اسی سورۃ میں فرمایا، اذ نادیٰ ربہ نداء خفیا. (جبکہ اس نے اپنے رب کو پکارا خفیہ طور سے) تو صوفی کو بھی، اس اشارہ کی اقتدا کرنی ہوتی ہے۔

(۵) اور غربت یحیٰ علیہ السلام کی اقتدا کرے کہ وہ اپنے وطن میں اپنے آپ کو مسافر سمجھتے تھے اور رشتہ دار عزیز واقارب میں رہ کر، سب سے بیگانہ تھے۔

(۶) اور سیاحت عیسیٰ علیہ السلام کی اقتدا ہو کہ آپ اپنے سفر میں اس قدر مجرد تھے کہ سوائے ایک پیالہ اور ایک کنگھی کے ہمراہ کچھ نہ رکھا۔ حتیٰ کہ جب ایک شخص کو دیکھا، کہ وہ دونوں ہاتھوں سے پانی پی رہا ہے، تو اپنے پیالہ کو پھینک دیا اور جب ایک شخص کو دیکھا کہ بالوں میں انگلیوں سے خلال کر کے شانہ کا کام لے رہا ہے۔ تو کنگھی بھی ضایع فرمادی۔

(۷) اور لبس صوف میں اتباع سیدنا موسیٰ علیہ السلام ہو، کہ آپ کا لباس ہمیشہ پشمینہ کا رہتا تھا۔

(۸) اور فقر میں سیدالانبیا حبیب کبریا محمد رسول اللہ ﷺ کی اقتدا کی جائے کہ باآنکہ حق تعالیٰ شانہ نے خزانہائے روئے زمین کی کنجی، حضور کی خدمت میں بھیجی اور فرمایا۔ اے محبوب اپنی جان پاک پر محنت و مشقت نہ ڈالئے اور خزانوں سے جس قدر چاہیے، خرچ فرما کر اپنی شان تجمل دوبالا کیجئے۔ حضور سید یوم النشور ﷺ نے بارگاہ جل مجدہ میں عرض کیا کہ الٰہی، میں یہ نہیں چاہتا، بلکہ یہ چاہتا ہوں کہ ایک روز کھاؤں اور ایک روز بھوکا رہوں اور یہ اصول معاملہ وتصوف میں بہترین خصلت ہے۔

حضرت بصری رحمتہ اللہ فرماتے ہیں۔ الصوفی لایوجد بعد عدمہ ولا

يعدم بعد وجوده (صوفی وہ ہے کہ اس کی ہستی کو نیستی نہ ہو، اور اس کی نیستی کو ہستی نہ ملے، یعنی جو کچھ وہ پائے، وہ ہرگز گم نہ ہو اور جس چیز کو اس نے گم کر دیا، وہ کبھی وجود میں نہ آئے اور بالفاظ دیگر اس کے یہ معنی ہوسکتے ہیں کہ صوفی وہ ہے، جو ملی ہوئی چیز کو ملی ہوئی نہ جانے اور جو نہ ملی ہوئی چیز ہو، وہ اسے ملنے والی نہ ہو۔ بغیر اس کے پاس وہ اثبات ہو، جس کی نفی نہیں اور وہ نفی ہو، جس کا اثبات نہ ہو۔

اس تمام مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ صوفی اس درجہ تک آ جائے کہ حالت بشریہ سے کلیتہً اسے سقوط حاصل ہوکر، شواہد جسانی ذات حق کے ساتھ معدوم و فوت ہوجائیں اور اس کی نسبت کلیتہً منقطع ہوجائے، تاکہ بشریت اس کے حق میں ظاہر ہو ، تاکہ اس کی تفریق اور اختلاف اس کے عین میں خود جمع ہوجائیں اور پھر اپنے سے اپنے میں قیام پائے۔

اور یہ صورت دو پیغمبروں میں ظاہر کی جاسکتی ہے، ایک حضرت موسیٰ علیہ السلام میں کہ ان کے وجود پاک میں عدم نہ تھا، حتیٰ کہ آپ نے عرض کیا رب اشرح لی صدری، (یعنی اے میرے رب میرے لئے میرا سینہ کھول دے) اور دوسرے ہمارے سرور عالم ﷺ آپ کے عدم میں وجود ہی نہ تھا، یہاں تک کہ فرمایا۔ الم نشرح لک صدرک (کیا نہیں کھول دیا اے محبوب ہم نے تیرا سینہ پاک) ایک نے تو آرائش چاہی اور زینت طلب کی، دوسری ہستی پاک کو خود آراستہ کیا اور آراستہ کرکے اسے اتنا چاہا کہ محبوب بنالیا ﷺ۔

حضرت علی بن بندار الصیر فی النیشاپوری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ التصوف اسقاط الرویته للحق ظاهراً و باطناً. (تصوف یہ ہے کہ صاحب تصوف اپنے کو ظاہرا اور باطناً کسی حالت میں نہ دیکھے اور دیکھے تو کلیتہً ذات والا صفات کو دیکھے کیونکہ اگر ظاہر دیکھے تو ظاہر میں نشان توفیق پائیگا اور اگر معاملات ظاہر کو دیکھے گا، تو اپنے پہلو میں پر پشہ کے برابر توفیق حق نہ جانے دیگا، تولا محالہ رویت ظاہری کو ترک

کریگا۔

پھر اگر باطن پر نشان تائید حق پائیگا، تو معاملات باطنی دیکھنے سے پہلو میں تائید حق ذرہ بھر نہ ملے گی، تو ترک باطن کے لئے کہے گا۔ لہٰذا ظاہر باطن کی رویت کو ترک کرکے ذات حق کو دیکھے گا، جب صرف ذات حق کو دیکھے گا تو خود کو ہرگز نہ دیکھے گا۔

حضرت محمد بن احمد مقری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں، التصوف استقامة الاحوال مع الحق. (تصوف وہ استقامت حال ہے، جو ذات حق کے ساتھ ہو) یعنی صوفی کی کیفیت حالیہ اس کے سر اور ضمیر کے موافق ہونی چاہئے۔ اس کے اسرار اسے کجی میں نہیں جانے دیتے، گویا جس کا دل صید محول حال ہے، اس کی کیفیات حالیہ اسے محور استقامت سے نہیں گرنے دیتی اور قرب حق سے نہیں روکتی۔

فصل:۔ جو کچھ معاملات تصوف میں بزرگوں نے فرمایا ہے۔ اس میں سے حضرت ابوحفص نیشاپوری کا یہ ارشاد ہے 'التصوف كله آداب لكل وقتٍ ادب ولكل حالٍ ادب فمن لزم آداب الاوقات بلغ مبلغ الرجال ومن ضيع الادب فهو بعيد من حيث يظن القرب ومردود من حيث يظن القبول.' (تصوف ایک ایسے مجموعہ ادب کا نام ہے، جو ہر وقت اور ہر مقام اور ہر حال میں ایک خاص ادب کی راہنمائی کرتا ہے، جس نے اس راہ میں ملازمت آداب واوقات کرلی، مردان خدا کے درجہ کو پہنچ گیا اور جس نے اس راہ کی رسم ادب ترک کردی اور آداب ضایع کردیئے، وہ ان درجہ والوں سے بعید ہوگیا اور گمان کرتا رہا کہ میں ان کے قریب ہوں اور وہ ان کی بارگاہ سے مردود ہوگیا۔ باآنکہ اسے یہی خیال رہا کہ میں قرب کے درجہ پر ہوں۔

بموجب ارشاد حضرت ابوالحسن نوری رحمتہ اللہ علیہ آپ فرماتے ہیں: ليس التصوف رسوماً ولا علوماً ولكن اخلاق. (تصوف رسوم وعلم نہیں ہے، لیکن یہ

ایک خاص خصلت ہے) یعنی اگر تصوف رسمی چیز ہوتی، تو مجاہدہ و ریاضت سے حاصل ہوجاتا اور اگر یہ علم ہوتا تو محض تعلیم و تعلم سے حاصل ہوجاتا، تو ثابت ہوا کہ تصوف ایک خصلت خاص کا نام ہے اور جب تک یہ خصلت خود اپنے اندر نہ پیدا کرے، اس وقت تک وہ حاصل نہیں ہوتا۔

فرق رسم و خصلت: اور رسم و خصلت میں یہ فرق ہے کہ رسم وہ فعل، جو بتکلف انسان کرسکتا ہے اور یہ امر واضح ہے کہ ظاہر انسان جو کچھ کرتا ہے، اگر باطن اس کے موافق نہیں تو وہ فعل ظاہر محض بے معنی اور فضول ہے۔

اور خصلت اس خاص فعل کو کہتے ہیں، جو بغیر بناوٹ اور تکلف کے صادر ہو اور اس کے تمام اسباب ظاہری اس کے باطن کے موافق ہوں اور زبانی دعاوی محمود سے وہ بالکل خالی اور پاک ہو۔

حضرت مرتعش رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ التصوف حسن الخلق (تصوف نیک خصلت کو کہتے ہیں) یہ خصائل حمیدہ تین قسم کے ہیں۔ ایک وہ کہ اوامر الٰہیہ ادا کرنے میں کسی قسم کا ریا اور دکھاوا نہ ہو اور اپنے رب کی رضا جوئی میں اداء حق فرائض ہوں۔

دوسری یہ کہ عوام کے ساتھ نیک خصلت ہو۔ بڑوں کی عزت، چھوٹوں پر رحم اور ہر معاملہ میں انصاف پسند ہو اور اس میں کسی قسم کا معاوضہ حاصل کرنا مطلوب نہ ہو۔

تیسرے یہ کہ اپنے کو ہواء شیطانی کی متابعت سے مجتنب رکھے اور ہر قسم کی حرص و خواہش نفسانی سے بچے۔

جو ان تینوں تعریفوں کے ساتھ اپنے کو متصف کرے، وہ نیک خصلت انسانوں میں شمار ہوگا اور وہ اس درجہ کو حاصل کرنے والا ہوسکتا ہے، جو ہم نے اول بیان کیا۔

اس کی تائید میں ایک واقعہ ہے۔ ایک صحابی نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے عرض کیا۔ حضور، ہمیں اخلاق محمد رسول اللہ ﷺ کے متعلق کچھ سنائیں، آپ نے فرمایا قرآن میں دیکھ لے۔ جو اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کے اخلاق کی خبر دی ہے اور فرمایا ہے۔

خذالعفوا و أمر بالمعروف و اعرض عن الجاھلین. (اے محبوب درگذر فرمانے کی خصلت کو پکڑے رہو اور لوگوں کو بھلائی کرنے کے ترغیب فرماؤ اور جاہلوں سے علیحدگی اور اعراض کرو۔)

حضرت مرتعش رحمتہ اللہ نے بھی تصوف کے معاملہ میں فرمایا۔ ھٰذا مذھب کله جد فلا تخلطوہ بشیء من الھزل. (یہ مذہب تصوف تمام کا تمام مجاہدہ ہے، اس میں لہو و لہب کا اختلاط نہ کرنا) اور رسم پرست لوگوں کی متابعت کرکے، اسے مخلوط نہ کردینا اور جو تصوف میں کورانہ تقلید کر رہے اور صوفی بن رہے ہیں، ان سے اپنے کو بچانا۔ عوام الناس نے جب اس زمانہ کے لوگوں کو دیکھا کہ رسمی متصوف لوگوں میں ٹھمکہ کے ساتھ ناچنا اور رقص و سرود کرنا، بارگاہ سلاطین میں پہنچ کر ایک ایک لقمہ پر جھگڑنا اور بادشاہوں کی بارگاہ میں مشرف ہونا، کمال فقر بن گیا ہے اور عوام کے خیالات خراب ہوگئے اور صوفیائے کرام سے اس قدر بدعقیدہ ہوگئے کہ عام طور پر کہنے لگے کہ ان صوفیوں کا یہی طغرائے امتیاز ہے اور پہلے لوگ بھی ایسے ہی حال میں گذر گئے اور یہ نہ سمجھا کہ یہ زمانہ فتنہ کا ہے اور روز بروز بلائیں بڑھ رہی ہیں۔

غرضکہ جب بادشاہوں کی حرص بڑھ گئی تو اس نے انہیں ظلم و جور کی طرف مائل کردیا اور زمانہ میں عوام کے اندر بدکاری، زنا فسق و فجور عام ہونے لگا۔ اسی طرح جب زہد و ورع میں ریا پیدا ہوجاتا ہے، تو وہ زاہد کو نفاق کی بیماری میں مبتلا کردیتا ہے اور ہوا و حرص شیطانی صوفی کو رقص و سرود کی طرف مائل کردیتا ہے۔

اچھی طرح یاد رکھو، اگرچہ اہل طریقہ تباہ ہوجائیں، مگر اصول طریقت تباہ نہیں ہوسکتے اور اچھی طرح جان لو کہ اگر ایک جماعت افعال بے ہودہ میں سے کچھ اختیار کرلے اور اس ہزل کو مجاہدہ وریاضت یا جذب دل کے پردہ میں پوشیدہ کرنا چاہے، تو اہل طریقت کے مجاہدات اس کی وجہ سے لغو نہیں ہوسکتے، (ان کے جذبات صادق، صادق رہیں گے اور اہل ہزل کے ہزل ریاضت نما خالص ہزل ہی ہوں گے)۔

حضرت ابوعلی قزوینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ "التصوف هو الاخلاق الرضية" تصوف ایک خصلت پسندیدہ ہے۔ اور خصائل پسندیدہ وہ ہوتے ہیں کہ بندہ تمام حالات میں اپنے رب کی رضا میں راضی رہے۔

حضرت ابوالحسن نوری رحمتہ اللہ فرماتے ہیں:

التصوف هو الحرية والفتوة وترک التکلف والسخا وبذل الدنیا.

"تصوف ایک ایسی آزادی ہے کہ بندہ قید حرص سے آزاد ہوجاتا ہے اور تصوف ایک ایسی جوانمردی ہے کہ بندہ خواہشات شہوانیہ سے مجرد ہوتا ہے اور تصوف تکلفات کا ایسا ترک کردینا ہے کہ بندہ ہر متعلق اور مقسوم کے اندر خوش رہتا ہے اور تصوف ایک ایسی سخاوت کا نام ہے کہ دنیا اہل دنیا پر ہی چھوڑ دیتا ہے اور خود بے تعلق ہوجاتا ہے۔

حضرت ابوالحسن بوسنجہ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

التصوف الیوم اسم ولاحقیقة وقد کان حقیقة ولا اسم.

"آج کے دن تصوف کا نام ہی نام رہ گیا ہے اور حقیقتاً کچھ نہیں رہا۔ ایک دن وہ تھا، کہ تصوف حقیقتاً خالص تصوف تھا۔ اور نام ونمود نہ تھی۔ یعنی عہد صحابہ کرام اور سلف صالحین رحمہم اللہ میں تصوف نام کا نہ تھا، بلکہ حقیقت تصوف کا پرتو ہر کس وناکس میں تھا۔ اب وہ انحطاطی دور آیا کہ تصوف کا نام تو باقی ہے، مگر معنی حقیقی معدوم ہیں، یعنی [illegible] تو صوفیوں کی نقل میں ہو رہے ہیں۔ اور رسمی صوفی بہت مشہور

ہیں۔ مگر ان کے دعاوی تصوف میں بالکل مجہول ہیں۔ گویا اب صوفی ہونے کا دعویٰ تو مشہور معروف ہے۔ لیکن افعال واعمال بالکل مجہول ہوگئے۔ یہاں تک میں نے اقوال مشائخ کرام کی تحقیق نقل کی، تاکہ اللہ تعالیٰ تجھے سعادت عطا فرمائے اور تجھ پر طریق تصوف کا حال منکشف ہوجائے اور منکرین تصوف کو بتا سکو کہ تصوف کے انکار سے ان کی کیا مراد ہے۔ اگر تنہا اسم تصوف سے انکار کرتے ہیں، تو مضائقہ نہیں۔ اس لئے کہ معانی حقائق میں مسمیات سے بالکل بیگانہ ہیں۔

اور اگر عین تصوف کے منکر ہیں، تو یہ انکار احکام شرعیہ اور انبیاء کرام کا ہے اور ان کے خصائل ستودہ کا انکار لازم آتا ہے۔ اللہ تجھے وہ سعادت عطا فرمائے، جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنے ولیوں کو سعید بنایا۔

اس کتاب میں ہم تمہیں ہدایت کرتے ہیں، تاکہ تم حق تصوف کی رعایت رکھو اور انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ اور سچے صوفیوں کے ساتھ نیک اعتقاد رکھو۔

وباللہ التوفیق۔

تصوف کی جامع تعریف

حضرت خواجہ شہاب الدین سہروردی چھٹی صدی ہجری کے بزرگ ہیں۔ برصغیر ہند میں سہروردی سلسلہ آپ کے خلیفہ حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانی کے ذریعہ پھیلا، آپ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، لیکن آپ کی سب سے مشہور کتاب ''عوارف المعارف'' ہے، یہ کتاب صدیوں سے تصوف کے بعض حلقوں میں درس کے طور پر پڑھائی جاتی رہی ہے۔

کتاب کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ سادہ اسلوب میں قرآن و سنت کی اسناد اور اکابر بزرگاں دین کے اقوال سے تصوف کے نقوش و آداب بیان کئے گئے ہیں، تصوف کی سب سے آسان ترین اور جامع کتاب ہے، زیرنظر مضمون آپ کی اسی کتاب سے لیا گیا ہے۔ (مرتب)

شیخ ابو زرعہ طاہر بن ابی الفضل نے اپنے مشائخ کے حوالے سے حضرت عبداللہ بن عمر کی یہ حدیث ہم سے بیان کی۔ کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''ہر چیز کی ایک کنجی ہوتی ہے۔ لہٰذا جنت کی کنجی غریبوں اور صابر فقراء سے محبت کرنا ہے۔ وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے ہم نشیں ہوں گے۔''

اس طرح فقر، تصوف کی اصل حقیقت میں داخل ہے اور وہ اس کی بنیاد اور لازمی جزو ہے، حضرت رویم نے فرمایا۔ ''تصوف تین خصلتوں پر مبنی ہے (۱) فقر اختیار کرنا (۲) سخاوت و ایثار کرنا (۳) تعرض اور اختیار کو ترک کرنا۔

حضرت جنید بغدادیؒ سے جب تصوف کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا:

''تصوف یہ ہے۔ کہ تم اللہ کے ساتھ کسی قسم کے بغیر رہو۔''

حضرت معروف کرخیؒ نے فرمایا۔ تصوف حقائق کو اختیار کرنے اور لوگوں کی مملوکہ چیزوں سے مایوس ہونے کے مرادف ہے۔''

فقر کی تعریف

حضرت شبلیؒ سے فقر کی اصل حقیقت کے بارے میں پوچھا گیا۔ تو فرمایا۔

''فقر یہ ہے کہ حق کے سوا اور کسی چیز کی پروا نہ کی جائے۔''

حضرت ابو الحسین النوری نے ارشاد فرمایا۔ ''فقیر کی تعریف یہ ہے کہ مفلسی کے وقت مطمئن ہو۔ مال موجود ہونے کے موقع پر سخاوت و ایثار سے کام لے۔''

ایک اور بزرگ کا مقولہ ہے۔ ''مخلص فقیر وہ ہے، جو دولت مند سے پرہیز کرتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ دولت اس کے پاس آ کر اس کے فقر کو بگاڑ دے، جیسا کہ دولت مند شخص فقیر سے اس لیے کنارہ کش رہتا ہے کہ کہیں فقیر اس کے پاس آ کر اس کی دولت کو خراب نہ کرے۔''

مذکورہ بالا اسناد کے حوالہ سے مظفر القرمیسینی کا یہ قول نقل کیا گیا ہے۔ کہ وہ فرماتے ہیں:

''فقیر وہ ہے۔ جو خدا کے سامنے کوئی حاجت پیش نہ کرے۔''

مزید فرماتے ہیں: ''میں نے ابوبکر المصری سے فقیر کے بارے میں دریافت کیا۔ تو انہوں نے فرمایا۔ ''فقیر وہ ہے جو نہ کسی کا مالک ہو اور نہ اس کا کوئی مالک۔''

''فقیر خدا کے سامنے کوئی حاجت پیش نہ کرے۔'' کا مطلب یہ ہے کہ فقیر ہمیشہ اپنی بندگی کے فرائض میں مشغول رہتا ہے، اسے اپنے پروردگار پر پورا بھروسہ ہوتا ہے کہ وہ اسے خوب جانتا ہے اور اس کی اچھی طرح حفاظت کرتا ہے، اس لیے اپنی حاجت پیش کرنے کی اسے کوئی ضرورت نہیں، اسے یہ معلوم ہے کہ خدا اس کے حال سے بخوبی واقف ہے، اس لیے وہ سوال کو درمیان لانا فضول سمجھتا ہے۔

فقر و تصوف میں اشتباہ

بہر حال اقوالِ مشائخ کے الفاظ کے مختلف معانی نکل سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ مختلف اوقات، حالات اور کیفیات کے ماتحت مختلف اشارے کرتے رہتے ہیں۔ اس لیے مختلف اقوال میں تمیز کرنے اور ان کا فرق معلوم کرنے کے لیے چند قواعد وضوابط کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ایسا اتفاق ہوا ہے کہ تصوف کی تشریح میں چند باتوں کا ذکر کیا گیا اور اس قسم کی باتیں فقیر کے ذکر میں بھی بیان کر دی گئیں۔ اسی طرح اس کے برعکس معاملہ بھی ہوا ہے کہ فقر کی تشریح میں تصوف کی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ اس طرح ان کی اصل حقیقت معلوم کرنے میں لوگوں کو اشتباہ ہو گیا لہٰذا ایک جامع تعریف کی ضرورت ہے، کیونکہ کبھی فقر زہد کے مفہوم میں اور کبھی تصوف کے مفہوم میں مستعمل ہوتا ہے، اس لیے ایک طالب حقیقت کے لیے ایک دوسرے میں فرق کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ ہم ان کا فرق اور تصوف کی جامع تعریف بیان کرتے ہیں۔

تصوف کی اصل حقیقت

تصوف، فقر اور زہد تینوں جداگانہ چیزیں ہیں۔ تصوف فقر وزہد کے تمام معانی پر حاوی ہے۔ اور اس میں ان دونوں چیزوں کے تمام اجزاء موجود ہیں۔ مگر ان کے ساتھ ساتھ اس میں ایسے اوصاف کا بھی اضافہ ہے، جن کے بغیر کوئی صوفی نہیں بن سکتا۔ خواہ وہ فقیر اور زاہد کیوں نہ ہو۔

حضرت ابو حفص فرماتے ہیں۔ ''تصوف سراپا آداب کا مجموعہ ہے۔ اس میں ہر وقت کے لیے ایک ادب ہے اور ہر حال ومقام کے لیے آداب مقرر ہیں۔ لہٰذا جس نے اوقات کے آداب کی پابندی کی۔ وہ انسانوں کے درجہ تک پہنچ گیا۔ اور جس نے آداب کو ضائع کیا۔ وہ مقام قرب سے دور اور قبولیت کی توقع میں ناکام رہا۔'' مزید فرمایا۔ ''ظاہری آداب، باطنی آداب کی نشانی ہیں۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ

نے فرمایا ہے۔ ''جس کے دل میں خشوع وخضوع ہے، اس کے اعضاء پر بھی اس کا اثر ہوگا۔''

شیخ رضی الدین احمد بن اسمٰعیل نے اپنے مشائخ کی اسناد کی حوالہ سے ہم سے یہ روایت بیان کی ہے۔ کہ ابوالقشیری بیان فرماتے ہیں۔ کہ میں نے عبداللہ بن علی کی روایت سے یہ سنا کہ جب ابومحمد الجریری سے تصوف کے بارے میں سوال کیا گیا۔ تو آپ نے فرمایا:

''تصوف اعلیٰ اخلاق کو اختیار کرنا اور پست اخلاق سے پرہیز کرنے کا نام ہے۔''

جب ہمیں تصوف کا یہ مفہوم معلوم ہو گیا کہ اس میں اخلاق تبدیل ہو کر اعلیٰ معیار پر پہنچ جاتے ہیں تو اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ تصوف، زہد وفقر سے بلند تر ہے، اسی بناء پر یہ کہا گیا ہے کہ فقر کی انتہا اپنی فضیلتوں کے باوجود تصوف کی ابتداء کے برابر ہے، تاہم اہل شام تصوف اور فقر میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتے، ان کا قول ہے کہ مندرجہ ذیل آیت صوفیائے کرام کے بارے میں ہے اور خدا نے ان کا نام فقراء رکھا ہے، وہ آیت یہ ہے:

للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللہ۔ (پارہ ۱۳، رکوع ۵:۷)

یہ ان فقراء کے لیے ہے جو اللہ کی راہ میں محصور ہو گئے ہیں۔

فقر اور تصوف میں فرق

اب میں فقر اور تصوف میں فرق کے متعلق وضاحت کرتا ہوں، بات دراصل یہ ہے کہ فقیر، فقر کو اختیار کر کے، اسے بہت بڑی فضیلت سمجھتا اور اسے دولت مندی پر ترجیح دیتا ہے، کیونکہ وہ خدا سے اس کے معاوضہ کی توقع رکھتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''میری امت کے فقراء، دولت مندوں سے نصف یوم پہلے جنت میں داخل

ہوں گے۔ وہاں کا یہ نصف یوم موجودہ دنیا کے پانچ سو سال کے برابر ہوگا۔"

لہٰذا غیر فانی ثواب کی توقع میں فانی دنیا کو چھوڑ بیٹھا ہے اور فقر وافلاس کو اختیار کیے ہوئے ہے۔ اسے یہ بھی اندیشہ ہے کہ اگر اس کا فقر جاتا رہا تو اس کی یہ فضیلت اور ثواب جاتا رہے گا، مگر ثواب ومعاوضہ کی توقع اور اس کے زوال کا اندیشہ صوفیائے کرام کے طریقے میں کمزوری اور روحانی بیماری کی نشانی ہے۔ کیونکہ فقیر معاوضہ کی توقع رکھتا ہے اور اسی مقصد سے اس نے دنیا چھوڑی ہے۔ مگر صوفی کسی متوقع معاوضہ کے بغیر اپنے موجود حال وجذبہ کے مطابق تمام چیزیں چھوڑ دیتا ہے۔

مزید برآں یہ بات بھی ہے کہ فقیر فانی دنیا کو چھوڑ کر، اپنی خوشی اور ارادہ کے ماتحت فقیری اختیار کرتا ہے۔ مگر صوفی کے مسلک میں ارادہ اور اختیار ایک بیماری ہے، صوفی صرف اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے ماتحت کام کرتا ہے۔ اس کا اپنا کوئی مستقل ارادہ نہیں ہوتا، وہ فضیلت کو صرف فقر یا دولتمندی میں محدود نہیں سمجھتا، بلکہ فضیلت اسی چیز کو خیال کرتا ہے، جس کی خدا توفیق دیتا ہے اور اس کا حکم صادر فرماتا ہے۔ وہ کسی کام کو کرنے سے پہلے اس کے حکم کا منتظر رہتا ہے۔

کبھی وہ خدا کے حکم کے ماتحت فقر کے برخلاف آسودگی کی زندگی بسر کرتا ہے اور اسی آسودگی کو فضیلت سمجھتا ہے، کیونکہ خدا کی طرف سے اسے اس کی اجازت دی گئی ہے۔ مخلص اور سچے بندوں کو صرف اسی وقت آسودہ زندگی بسر کرنے کی اجازت دی جاتی ہے، جب کہ وہ اذن الٰہی کے علم میں پختہ ہوجاتے ہیں، ورنہ اس مقام پر بہت سے لوگوں کے پاؤں پھسل جاتے ہیں۔ اور بہت سے مدعی، دعویٰ کرنے لگ جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صاحب حال جب کسی حال میں مبتلا ہوتا ہے تو اس میں اسے کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

لیہلک من ہلک عن بینۃ ویحییٰ من حی عن بینۃ. (پارہ ۱۰،

رکوع ۱ : ۲)

(تاکہ جو ہلاک ہو وہ کھلی نشانی کے مطابق ہلاک ہوجائے۔ اور جو زندہ رہے وہ بھی کھلی نشانی کے مطابق زندہ رہے۔)

مذکورہ بالا وضاحت کے بعد تصوف اور فقر کے درمیان فرق ظاہر ہوگیا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوگیا ہے کہ فقر، تصوف کی بنیاد اور اس کا لازمی حصہ ہے یعنی ہم فقر کے راستے سے تصوف کے درجات تک پہنچ سکتے ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فقر کی دولت سے مکمل تصوف وجود میں آجائے گا۔

فنا فی اللہ

حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں۔ "تصوف کا مفہوم یہ ہے کہ حق تعالیٰ تمہاری نفسانیت کو مردہ کرکے، اپنے ساتھ تمہیں زندہ رکھے۔"

اس کا وہی مفہوم ہے، جو میں نے بیان کیا کہ صوفی کا وجود اللہ کے ساتھ قائم ہے۔ وہ اپنے آپ کو کھو چکا ہے، اس کے برعکس فقیر وزاہد اپنی مستقل ہستی رکھتے ہیں اپنے ارادہ سے واقف ہوتے ہیں۔ اور اپنے علم کے مطابق کام کرتے ہیں۔ مگر صوفی اپنی معلومات کی طرف مائل نہیں ہوتا، اپنے ارادہ سے کام نہیں کرتا، بلکہ اپنے پروردگار کی مرضی کے تابع ہوتا ہے۔

حضرت ذوالنون مصریؒ کا ارشاد ہے۔ "صوفی وہ ہے، جسے کسی چیز کی طلب تنگ نہیں کرتی۔ اور نہ کسی چیز کی ضرورت اور اس کی نایابی اسے پریشان کرتی ہے۔"

مزید فرمایا۔ "صوفیہ نے خدا کو ہر چیز پر ترجیح دی ہے، اس لیے خدا نے بھی ان کو سب پر ترجیح دی ہے۔"

ان کے ایثار کا ایک ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ذاتی علم پر، خدا کے علم کو اور اپنے ارادہ پر خدا کے ارادہ کو ترجیح دی ہے۔

کسی نے ایک بزرگ سے دریافت کیا، "میں کونسی جماعت کے ساتھ رہوں؟

انہوں نے جواب دیا۔ ''صوفیہ کے ساتھ رہو۔ کیونکہ وہ برے کام پر معذرت قبول کر لیتے ہیں۔ اور کسی ایسے بڑے سے بڑے کام کی، ان کے نزدیک کوئی وقعت نہیں، جس کی وجہ سے وہ تمہیں اس قدر بڑھا دیں کہ تم غرور اور خود پسندی میں مبتلا ہو جاؤ۔''

مگر اس قسم کا علمِ تصوف فقیر وزاہد کے پاس موجود نہیں۔ کیونکہ زاہد وفقیر ترک دنیا کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور دنیا داری کو بُرا سمجھتے ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا ظرف چھوٹا اور ان کا علم محدود ہے۔

ایک بزرگ نے فرمایا۔ ''صوفی وہ ہے کہ جب اس کے سامنے دو اچھی چیزیں یا دو اچھی عادتیں آئیں تو وہ بہترین چیز کو اختیار کرے گا۔ اس کے برعکس فقیر وزاہد دو اچھے اخلاق میں پوری طرح تمیز بھی نہیں کر سکیں گے۔ بلکہ وہ چیز اختیار کریں گے، جس کا ترک دنیا سے سب سے زیادہ تعلق ہو، ایسی صورت میں وہ اپنے ذاتی علم کے مطابق فیصلہ کریں گے۔

ان کے برخلاف ایک صوفی خدا سے رجوع کر کے، اس سے التجا کرے گا اور اس کا قرب حاصل کر کے، اس کے علم سے واقف ہوگا۔ مناجات ومکالمہ کے بعد مذکورہ بالا دونوں چیزوں میں سے بہتر شے معلوم کرنے کی کوشش کرے گا۔

مشائخ کے اقوال

حضرت رویم فرماتے ہیں۔'' تصوف یہ ہے کہ نفس کو خدا کی مرضی اور ارادہ پر چھوڑ دیا جائے۔''

حضرت عمرو بن عثمان المکی کا ارشاد ہے:

''تصوف یہ ہے کہ بندہ ہمیشہ اپنے وقت کے مطابق افضل کام میں مشغول رہے۔''

کسی دوسرے بزرگ کا مقولہ ہے۔ ''تصوف کی ابتداء علم ہے، اس کا اوسط

درجہ عمل ہے اور اس کا آخری انجام بخشش خداوندی ہے۔''

یہ بھی کہا گیا ہے۔ ''تصوف یہ ہے کہ ذکر باجماعت جو اور ساعت پر وجدانی کیفیت طاری ہو اور اتباع کے ساتھ عمل ہو۔

ایک یہ قول بھی منقول ہے۔ '' تصوف تکلفات کو چھوڑ دینے اور روحانی قربانی کا دوسرا نام ہے۔'' حضرت سہل بن عبداللہ کا قول ہے۔ ''صوفی وہ ہے جو کدورت سے صاف اور فکر وشوق ومستی سے معمور ہو۔ انسانوں سے الگ ہو کر صرف خدا سے لو لگائے بیٹھا ہو، اور اس کی نظر میں سونا اور مٹی برابر ہوں۔''

کسی بزرگ سے تصوف کے بارے میں سوال کیا گیا۔ تو انہوں نے جواب دیا۔ ''تصوف یہ ہے کہ مخلوق کی ہم نوائی سے دل صاف ہو۔ طبعی اخلاق کو چھوڑ دیا جائے۔ بشری صفات فنا کر دیئے جائیں۔ نفسانی خواہشوں کو چھوڑ کر روحانی صفات پیدا کی جائیں، نیز حقیقی علوم سے تعلق پیدا کر کے، شریعت کے مسائل میں رسول کریمؐ کی پیروی کی جائے۔

صفاتِ اولیاء

حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں: میں نے شام کے کسی ساحل پر ایک عورت کو دیکھا۔ میں نے پوچھا۔ ''آپ کہاں سے تشریف لائی ہیں؟'' اس نے جواب دیا۔ '' میں ان لوگوں کے پاس سے آئی ہوں۔ جو خوابگاہوں سے اپنے پہلو جدا رکھتے ہیں۔'' میں نے پوچھا۔ ''آپ کہاں جا رہی ہیں؟'' اس نے کہا۔ ''میں ایسے لوگوں کے پاس جا رہی ہوں۔ جن کو اللہ کے ذکر سے نہ تجارت اور نہ خرید وفروخت غافل کرتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''آپ ان کی صفت بیان کیجئے۔'' اس پر اس نے چند اشعار پڑھے جن کا ترجمہ مندرجہ ذیل ہے:

(۱) وہ ایسے لوگ ہیں جو صرف خدا سے وابستہ ہیں۔ اس کے علاوہ اور کسی سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

(۲) ان کا اصل مقصد صرف ان کے مولیٰ اور سردار کی ذات ہے۔ لہٰذا اس بے نیاز خدائے واحد کو اصل مقصد بنانا کس قدر عمدہ کام ہے (۳) انہیں دنیا کے جھگڑوں، اس کی عزت، اولاد، کھانے، پینے اور دوسری لذتوں سے کوئی سروکار نہیں (۴) نہ انہیں عمدہ لباس پہننے کا شوق ہے، نہ اور کسی شہر میں جا کر ان کی روح کوئی خوشی محسوس کرتی ہے (۵) تاہم وہ روحانی منازل طے کرنے میں جلدی کرتے ہیں۔ تاکہ دائمی قربت الٰہی کی مسافت کو کم کرسکیں (۶) وہ تالابوں اور وادیوں کے قریب بسے ہوئے ہیں۔ نیز اونچے اونچے پہاڑوں میں بھی تمہیں ان کی کافی تعداد ملے گی۔"

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں: صوفی زمین کی مانند ہے جس پر ہر بری چیز پھینک دی جاتی ہے، مگر اس کے اندر سے وہ عمدہ شکل میں تبدیل ہوکر نمودار ہوتی ہے۔" آپ نے یہ بھی فرمایا۔ "صوفی زمین کے مشابہ ہے، جسے نیک و بد دونوں روندتے ہیں، وہ بادل کی مانند بھی ہے۔ جو ہر چیز کو سایہ عطا کرتا ہے، یا وہ بارش کی مثال ہے۔ جو ہر چیز کو سیراب کرتی ہے۔"

تصوف کی جامع تعریف

تصوف کی ماہیت اور حقیقت کے بارے میں مشائخ کرام کے اقوال ایک ہزار سے بھی زیادہ ہیں۔ تمام کو نقل کرنا موجب طوالت ہوگا۔ لہٰذا ہم ایک ایسا ضابطہ اور اس کی جامع تعریف بیان کرتے ہیں۔ جو تصوف کے تمام معانی اور تشریحات پر حاوی ہو۔ کیونکہ الفاظ خواہ مختلف ہوں، مگر ان کا مفہوم قریب قریب یکساں ہے۔ لہٰذا ہماری تعریف یہ ہے۔ "صوفی وہ ہے جو ہمیشہ تزکیہ نفس کرتا رہے اور اپنے قلب کو نفسانی آلائشوں سے صاف کرکے، ہمیشہ اپنے اوقات کو کدرتوں سے پاک وصاف رکھے۔ چونکہ وہ ہر وقت اپنے مولیٰ کے سامنے سرنیاز خم کرتا رہتا ہے، اس لیے اس کی یہ نیازمندی اس کا دل صاف کرکے کدورتوں کو دور کرتی ہے، تاہم جب کبھی

نفسانی حرکات وصفات نمودار ہوتی ہیں تو وہ صوفی صافی اپنی بصیرت کاملہ سے اسے بھانپ لیتا ہے، اس وقت وہ خدا کی طرف راہِ فرار اختیار کرتا ہے۔ لہٰذا تصفیہ قلب کے ذریعے اس کی دلجمعی ہوتی ہے اور نفسانی حرکات سے اس کے دل کو پریشانی اور کدورت لاحق ہوتی ہے، اس وجہ سے وہ خدا سے اپنا قلبی تعلق قائم کرتا ہے، جو اس کے قلب کو اس کے نفس پر حاوی رکھتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

کونوا قوامین لله شهدآء بالقسط . (پارہ ۶: رکوع ۶:۳)

تم اللہ کے لیے کھڑے ہوجاؤ۔ اور انصاف کے گواہ بنو۔

"اس آیت میں قوامیت سے مراد نفس پر غالب ہونا ہے اور یہی صوفیانہ اخلاق ہے۔

کسی بزرگ کا مقولہ ہے۔ "تصوف سراپا اضطراب ہے، اگر اس میں سکون وانجماد آجائے تو تصوف برقرار نہیں رہے گا۔"

اس مقولہ میں یہ راز مضمر ہے کہ روح کی کشش، ہمیشہ بارگاہ الٰہی کی طرف ہوتی ہے، یعنی صوفی کی روح ہمیشہ بلند مقامات قرب الٰہی تک پہنچنے کی تگ ودو کرتی ہے، مگر اس کا نفس اپنی وضع کے مطابق عالم سفلی میں تہ نشین ہونا چاہتا ہے۔ اور پیچھے کی طرف لوٹتا ہے، اس لیے صوفی کو (روح ونفس کی اس کش مکش میں) مسلسل جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ وہ ہمیشہ خدا کا محتاج ہوکر اس کی پناہ ڈھونڈتا ہے اور اپنے نفس کی اچھی طرح دیکھ بھال کرتا رہتا ہے۔

بہرحال جو کوئی ہماری تشریح پر غور کرے گا، اسے مشائخ کے تمام متفرق اشارات اس میں یکجا نظر آئیں گے۔

شیخ ابو زرعہ طاہر بن محمد بن طاہر نے اپنے مشائخ کی اسناد کے حوالہ سے حضرت انس بن مالک کی یہ حدیث ہم سے بیان کی ہے۔

"رسول اللہ ﷺ غلام کی دعوت قبول فرماتے تھے۔ گدھے کی سواری کرتے

تھے۔ اور اون پہنتے تھے۔"

تصوف سے اشتقاق

اس حدیث کی بنا، پر ایک جماعت کی یہ رائے ہے کہ انہیں صوفیہ کا نام ان کے ظاہری لباس پر دیا گیا ہے۔ کیونکہ انہوں نے صوف (اون) کا لباس پہننا پسند کیا وہ زیادہ نرم وملائم ہوتا ہے۔ اور انبیاء علیہم السلام کا لباس بھی یہی ہوا کرتا تھا۔ اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث روایت کی گئی ہے کہ آپ نے فرمایا۔

"روحاء کی چٹان پر سے ستر پیغمبر برہنہ پا گزرے جو عبا پہنے ہوئے تھے، اور وہ حرم شریف کا قصد کئے ہوئے تھے۔"

کہا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اون اور بالوں کا لباس پہنتے تھے اور درخت سے پھل کھاتے تھے، ان کی پوشاک اون کی تھی۔ حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت فضالہ ابن عبیدؓ نے ان کی صفت اس طرح بیان کی ہے:

"جب وہ بھوک کے مارے زمین پر گر پڑتے تھے تو عرب بدو انہیں دیوانہ خیال کرتے تھے، ان کی پوشاک اون کی ہوتی تھی۔ بعض صحابیوں کے کپڑے جب پسینے سے شرابور ہوجاتے تھے تو ان میں سے بھیڑ کی ایسی بدبو آنے لگتی تھی، جب کہ وہ بارش میں بھیگ جائے۔ یہاں تک کہ بعض صحابی تنگ آ کر یہ کہتے تھے۔

"مجھے ان کی بدبو بری لگتی ..." "کیا تمہیں ان کی بدبو بری نہیں لگتی ہوگی۔ جب کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو خطاب کرتے ہوں گے۔"

وہ اون کا لباس اس لیے پسند کرتے تھے۔ کہ انہوں نے دنیا کی زیب وزینت کی چیزیں چھوڑ دی تھیں۔ اور صرف اپنی بھوک رفع کرنے اور ستر عورت برقرار رکھنے پر قانع تھے، وہ آخرت کے کاموں میں اس قدر مستغرق تھے کہ اپنے نفس کو لذت وراحت پہنچانے کی طرف ان کا دھیان بھی نہیں جاتا تھا۔ بلکہ ہر وقت اپنے مولیٰ کی خدمت میں مشغول رہتے تھے۔ ان کی تمام تر توجہ آخرت کے کاموں

کی طرف مبذول رہتی تھی۔

یہ وجہ تسمیہ لفظی اشتقاق کے لحاظ سے بہت مناسب ہے۔ کیونکہ محاورہ میں تصوف کے معنی اونی پوشاک کے آتے تھے۔ جیسا کہ یہ کہا جاتا ہے۔ تقمص (اس نے قمیص پہنی)۔

نام کے ترجیحی اسباب

صوفیائے کرام مختلف حالات میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور بلند سے بلند تر مقامات کی طرف ترقی کرتے رہتے ہیں۔ کوئی وصف اور تعریف انہیں مقید ومحدود نہیں کر سکتی۔ کیونکہ مزید علم وحال کے دروازے ہر وقت ان کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔ ان کا باطن معدن حقیقت اور مجمع العلوم ہے۔ اس لیے کسی حال کے ساتھ انہیں مقید کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ ان کی وجدانی کیفیات گوناگوں ہیں۔ لہٰذا ظاہری لباس کے ساتھ انہیں منسوب کرکے انہیں صوفی کہنے لگے۔ اس لفظ سے ان کی حالت اور ان کے اوصاف کی زیادہ وضاحت ہوتی ہے۔ کیونکہ اونی لباس پہننا قدیم زمانے ہی سے ان کے اسلاف کا طریقہ رہا، جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ ان کا حال وہی ہے۔ جو مقربین بارگاہ خداوندی کا ہے۔

چونکہ قرب الٰہی کی طرف منسوب ہونا اور اس کی طرف اشارہ کرنا، ایک مشکل کام ہے، اس لیے ان کے حال کو چھپانے اور ان کے باعزت مقام کو اشاروں کی کثرت سے اور اس کے تذکرہ کو عوام الناس کی زبانوں سے محفوظ رکھنے کے لیے لباس کی مناسبت سے ان کا یہ نام رکھا گیا ہے یہی ادب کا تقاضا تھا۔ اور صوفیائے کرام کا بنیادی اصول بھی یہی ہے کہ ظاہر وباطن اور قول وفعل میں ادب ملحوظ خاطر رہے۔

زہد کا مفہوم

صوفی کے لفظ سے ایک دوسرے مفہوم کا بھی پتہ چلتا ہے، وہ یہ ہے کہ اس میں زہد اور دنیا سے بے رغبتی کا مفہوم پوشیدہ ہے۔ اس میں نفسانی خواہش سے پرہیز اور نرم ونازک پوشاک نہ پہننے کی طرف اشارہ ہے۔ تاکہ ایک مبتدی مرید، جو ان کے طریقے کو پسند کرتا ہو، اور ان کے گروہ میں شامل ہونا چاہتا ہو، زہد وتقشف اور سادگی کا عادی بن جائے، اسے یہ بھی علم ہوجائے گا کہ پوشاک کی طرح اس کے کھانے پینے کا ڈھنگ بھی سادہ ہونا چاہیے۔ اسی صورت میں وہ اس کے نام پر غور کرکے) تصحیح بصیرت کے بعد ہی اس حلقہ میں شامل ہوگا۔ اس طرح ایک مبتدی اس کے نام ہی سے اس کی اصل حقیقت سمجھ سکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی دوسرا نام رکھا جاتا تو مبتدیوں کو اصل حقیقت کے سمجھنے میں دشواری ہوتی۔ اس لیے یہ نام بہتر ہے۔

اس نام کے ترجیح دینے کی ایک دوسری وجہ یہ ہے کہ جب ان لوگوں کو صوفی کہا جاتا ہے تو (روحانی حیثیت سے) یہ زبردست دعویٰ ہے۔ مگر جب لوگوں کو یہ بتایا جائے کہ ان کا نام صوفی اس وجہ سے رکھا گیا ہے کہ وہ اونی پوشاک پہنتے ہیں۔ تو وہ (بزرگی کے) دعویٰ سے دور ہوجاتے ہیں۔ اور ہر وہ چیز جو (ریاکاری کے) دعویٰ سے دور ہو وہ ان کے حال سے زیادہ مناسب ہے۔

تواضع کا مفہوم

علاوہ ازیں اونی پوشاک پہننا، ان کی ظاہری حالت کو ظاہر کرتا ہے۔ جب کہ ان کے حال اور دیگر روحانی مقامات کا ان کے باطن سے تعلق ہے۔ لہٰذا ظاہری حالت کے مطابق نام رکھنا زیادہ مناسب ہے، بلکہ یہ نام تواضع کا اظہار بھی کرتا ہے۔

''صوفی'' نام کی ایک وجہ تسمیہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے، کہ چونکہ صوفیائے کرام نے تواضع، انکساری، گمنامی اور پوشیدگی کو زیادہ پسند کر رکھا ہے، اس وجہ سے

گرے پڑے چیتھڑوں اور پھینکے ہوئے صوف (صوفہ) کی مانند ہیں، جنہیں کوئی پسند نہیں کرتا۔ اور نہ ان کی طرف متوجہ ہوتا ہے، لہٰذا صوفہ کی نسبت سے انہیں صوفی کہا جاتا ہے۔ جیسے کوفہ کی صفت نسبتی کوفی ہے، یہ بعض اہل علم کا قول ہے، اس کا مفہوم بھی اس کے لفظی اشتقاق کے مناسب ہے۔

بہرحال اونی پوشاک ہمیشہ سے زاہد وعابد اور نیک بندوں کی پوشاک رہی ہے۔ جیسا کہ ہمیں شیخ ابو زرعہ طاہر نے اپنے مشائخ کی اسناد کے حوالوں سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی یہ حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ ''جب حضرت موسیٰ نے خدا سے کلام کیا تھا، اس وقت وہ سراپا اونی لباس پہنے ہوئے تھے۔ ان کا جبہ، پاجامہ، چادر اور آستین سب اون کی تھی۔ ان کے جوتے بغیر رنگے ہوئے چمڑے کے بنے ہوئے تھے۔

صف سے مشتق

یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ان کا نام صوفی اس لیے رکھا گیا ہے کہ وہ اپنی بلند ہمتی، خدا سے اپنے دلی تعلق اور اس کے سامنے باطنی اسرار پیش کرنے کی وجہ سے خدا سے روبرو صف اول میں ہیں (اس کی مزید توضیح کے سلسلے میں) یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ نام دراصل صفوی تھا، جو ثقیل ہونے کی وجہ سے صوفی بن گیا۔

صُفہ سے اشتقاق

یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ صوفی کی نسبت صفہ سے ہے، جو رسول اللہ کے زمانے میں غریب مہاجروں کا ایک چبوترہ تھا۔ انہی کے بارے میں خداوند تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

للفقر آء الذین احصروا فی سبیل اللہ لایستطیعون ضربا فی الارض.

(پارہ ۳: رکوع ۵:۱۷)

یہ ان غریبوں کے لیے ہے جو خدا کی راہ میں محصور ہوئے اور وہ زمین پر سفر کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔

اصحابِ صفہ

اگرچہ لفظی اشتقاق کے لحاظ سے یہ وجہ تسمیہ درست نہیں، مگر مفہوم کے لحاظ سے صحیح ہے، کیونکہ صوفیہ کا حال ان کے مشابہ ہے، وہ بھی اصحاب صفہ کی طرح آپس میں الفت ومحبت کے ساتھ اکٹھے رہتے ہیں۔ اصحاب صفہ تقریباً چار سو فرد تھے۔ مدینہ منورہ میں ان کا کوئی کنبہ نہ تھا، وہ سب مسجد نبوی میں اکٹھے ہوئے۔ جیسا کہ صوفیہ خانقاہوں میں رہتے تھے۔ یہ اصحاب صفہ نہ زراعت کرتے تھے نہ دودھ دینے والے مویشی رکھتے تھے۔ نہ تجارت کرتے تھے۔

وہ دن کو ایندھن جمع کرتے اور گٹھلیاں پھوڑتے، رات کو عبادت کرتے، قرآن مجید سیکھتے اور اس کی تلاوت کرتے تھے، خود رسول اللہؐ ان کے غمخوار تھے اور لوگوں کو ان کی امداد پر آمادہ فرماتے تھے، آپ ان کے پاس بیٹھ کر، ان کے ساتھ کھانا کھایا کرتے تھے۔ مندرجہ ذیل آیات کریمہ انہی کی شان میں نازل ہوئی ہیں۔

ولاتطرد الذین یدعون ربهم بالغداة والعشی یریدون وجهه. (پارہ ۷ - رکوع ۱۲ : ۲)

اور اے پیغمبر ان لوگوں کو مت نکالو جو اپنے پروردگار کو صبح شام پکارتے ہیں اور اس کی رضامندی کے خواہاں ہیں۔

واصبر نفسک مع الذین یدعون ربهم بالغدوة والعشی. (پارہ ۱۵، رکوع ۱۶ : ۵)

تم خود ان لوگوں کے ساتھ صبر کے ساتھ رہو کرو جو اپنے پروردگار کو صبح شام پکارتے تھے۔

یہ آیت کریمہ ابن ام مکتوم کے بارے میں نازل ہوئی۔

عبس وتولی ان جاءه الاعمی (پارہ ۳۰: سورہ عبس)

آپ نے ترشری اختیار کی اور منہ پھیر لیا اسی وجہ سے کہ آپ کے پاس ایک اندھا آیا تھا۔

یہ بھی اصحاب صفہ میں سے تھے۔ ان کی وجہ سے آنحضرتؐ معتوب ہوئے۔

آپ جب ان لوگوں سے مصافحہ فرماتے تھے۔ تو ان کے ہاتھوں سے اپنا ہاتھ جلد نہیں کھینچ لیتے تھے (معاشی کفالت کے لیے) آپ نے انہیں خوشحال لوگوں میں تقسیم کردیا تھا، کسی کے حصے میں تین تھے اور کسی کے حصے میں چار تھے۔ مگر حضرت سعد بن معاذ ان میں سے اسی (۸۰) آدمیوں کو لے جا کر کھانا کھلاتے تھے۔

اہل صفہ کا فقر

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں۔ میں نے اہل صفہ کے ستر آدمیوں کو دیکھا، جو ایک ہی کپڑے میں نماز پڑھتے تھے، ان میں کچھ لوگوں کے کپڑے گھٹنوں تک نہیں پہنچتے تھے۔ جب ان میں سے کوئی رکوع کرتا تھا تو اپنے ہاتھ سے کپڑے کو پکڑ لیتے تھے کہ ایسا نہ ہو کہ ستر کھل جائے۔

اہل صفہ میں سے ایک آدمی نے بیان کیا۔ ''ہم اکٹھے ہوکر رسول اللہ کے پاس آئے اور عرض کیا۔ یا رسول اللہ! کھجوروں (کو کھاتے رہنے) نے ہمارے پیٹ میں سوزش پیدا کردی ہے۔'' جب رسول اللہؐ نے یہ بات سنی تو آپ نے ممبر پر چڑھ کر فرمایا۔

''لوگوں کا کیا حال ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ کھجوروں نے ہمارے پیٹ کو جلا دیا ہے، کیا تمہیں یہ نہیں معلوم کہ کھجور اہل مدینہ کی خوراک ہے، انہوں نے ہماری اور تمہاری اسی خوراک کے ذریعے امداد کی۔ اس ذات کی قسم، جس کے قبضہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے، دو مہینے ہوئے رسول اللہ کے گھر سے روٹی پکانے کے لیے

کوئی دھواں نمودار نہیں ہوا۔ اور وہاں بھی سوائے پانی اور کھجوروں کے اور کچھ نہ تھا۔"

شیخ ابوالفتح محمد بن عبدالباقی نے اپنے مشائخ کی اسناد کے حوالوں سے حضرت ابن عباسؓ کی یہ حدیث ہم سے بیان کی ہے، وہ فرماتے ہیں "رسول اللہ ﷺ ایک دن اصحاب صفہ کے پاس کھڑے تھے۔ آپ نے ایک طرف ان کی غریبی اور مفلسی ملاحظہ فرمائی اور دوسری طرف سے یہ دیکھا کہ ان کے قلوب پاکیزہ اور مسرور تھے، اس وقت آپ نے فرمایا "اے اصحاب صفہ! تمہیں خوشخبری ہو، تم میں سے جو کوئی اس حالت پر قائم رہا، جس حالت میں تم آج ہو اور اپنی حالت پر خوش وخرم رہا تو قیامت کے دن وہ میرا ساتھی ہوگا۔"

کہا جاتا ہے کہ خراساں میں انہی میں سے کچھ لوگ غاروں میں رہتے تھے۔ وہ بستیوں اور شہروں میں آباد نہ ہوئے، اسی لیے وہ خراسان میں شگفتیہ کے نام سے مشہور تھے۔ شگفت اس غار کا نام تھا، جہاں وہ رہتے تھے۔ اہل شام انہیں جوعیہ کہتے تھے (کیونکہ وہ بھوکے رہتے تھے)۔

قرآن کریم میں خداوند تعالیٰ نے نیک بندوں کی جماعتوں کا بار بار ذکر کیا ہے، ایک جماعت کو ابرار کے نام سے موسوم کیا گیا اور دوسری جماعت کو مقربین کہا گیا۔ انہی لوگوں کو صابرون وصادقون، ذاکرون اور محبوں کے الفاظ سے بھی موسوم کیا گیا ہے۔ بہرحال صوفی کا لفظ ان تمام مذکورہ متفرق اسماء پر حاوی ہے۔

صوفی کے نام کی ابتداء

بہرحال یہ واقعہ ہے کہ یہ نام رسول اللہؐ کے زمانے میں نہیں رکھا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ تابعین کے زمانہ میں رکھا گیا، حضرت حسن بصری سے یہ روایت منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا "میں نے خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے ایک صوفی کو دیکھا۔ اسے میں نے کچھ دینا چاہا، مگر اس نے نہ لیا اور کہنے لگا "میرے پاس چار وانگ ہیں، جو میرے لیے کافی ہوں گے۔" اس روایت کی تائید حضرت سفیان کے اس

قول سے ہوتی ہے کہ انہوں نے فرمایا "اگر ابوہاشم الصوفی نہ ہوتے تو میں ریاکاری کی دقیق باتوں سے واقف نہ ہوتا۔" اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ نام قدیم زمانہ سے مشہور ہے۔

کچھ لوگوں نے یہ کہا ہے کہ یہ نام دوسو ہجری تک مشہور نہ ہو سکا۔ کیونکہ رسول اللہ کے زمانے میں آپ کے اصحاب اپنے ساتھیوں کو صحابی کے نام سے پکارتے تھے، کیونکہ اسے آپ کی صحبت میں رہنے کا شرف حاصل تھا۔ لہٰذا اس صحبت کی طرف اشارہ کرنا ہر اشارہ سے بہتر تھا۔

آپ کے عہد مبارک کے خاتمہ کے بعد جو اہل علم ہوتے وہ تابعی کہلانے لگے، مگر جب عہد رسالت کے بعد کافی عرصہ گذر گیا۔ اور آسمانی وحی اور نور مصطفوی کو پوشیدہ ہوئے ایک زمانہ گذر گیا، تو اس وقت خیالات میں اختلاف ہونے لگا۔ اور لوگوں کے راستے جدا ہوگئے۔ اور ہر اہل رائے اپنی رائے میں آزاد ہوگیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نفسانی خواہشوں نے علمی فضا کو مکدر کر دیا۔ یہاں تک کہ متقی اور پرہیزگاروں کی عمارتیں ہلنے لگیں اور نمائندوں کے عزائم بھی متزلزل ہونے لگے، جہالت کا غلبہ ہوگیا اور اس کے کثیف پردے دلوں پر چھاگئے، یہاں تک کہ اکثر لوگوں کو دنیا اور اس کی چیزیں خوش نما دکھائی دینے لگیں۔

ایسے زمانے میں مذکورہ بالا حالات کو دیکھتے ہوئے ایک جماعت دنیا سے الگ ہو کر، نیک کاموں میں مشغول ہوگئی، ان کے عزائم میں خلوص اور دین کی طاقت تھی۔ انہوں نے دنیا اور اس کی محبت سے منہ موڑا، تنہائی اور گوشہ نشینی کو غنیمت جانا، اپنی جماعت کے لیے کچھ زاویے (خانقاہیں) بنالیے، جہاں کبھی کبھی جمع ہوجاتے تھے، مگر اہل صفہ کی تقلید کرتے ہوئے اکثر تنہا رہتے تھے۔ دنیاوی اسباب کو انہوں نے چھوڑ رکھا تھا۔ اور رب الارباب کی طرف لو لگائی تھی۔ ان کے نیک اعمال نے بلند احوال کی صورت میں اچھا ثمر دیا، بلکہ ان کا دماغ اور ان کی قوت ادراک صاف

ہوکر علوم الٰہی کو قبول کرنے کے قابل ہوگئی۔

اس طرح ان کو ظاہری زبان کے بعد ایک دوسری زبان ملی اور گذشتہ عرفان کے بعد ایک نیا عرفان کامل حاصل ہوا، بلکہ سابقہ ایمان کے بعد ایک تازہ ایمان حاصل ہوا، جیسا کہ حضرت حارثہ نے فرمایا ہے۔ ''جب مجھے غیر معمولی ایمان کے مرتبے کا کشف حاصل ہوا تو اس وقت میں صحیح معنوں میں مومن بنا۔'' لہٰذا ان مراتب تک پہنچنے کے بعد وہ نئے علوم سے واقف ہوئے، جن کے لیے نئے نئے اشارے کرنے پڑے۔ اس لیے انہیں نئی نئی اصطلاحات وضع کرنی پڑیں، جو ان کے جانے پہچانے خیالات کی ترجمانی کرسکیں اور ان کے حال اور وجدانی کیفیات کو ظاہر کرسکیں (اس طرح علم تصوف کی بنیاد پڑی) اور ان بزرگان سلف سے ان کے جانشینوں نے یہ علم حاصل کیا۔ یہاں تک کہ ہر زمانے میں اس نے ایک باقاعدہ اور مستقل علم اور رسوم کی صورت اختیار کرلی۔ چنانچہ صوفی کا نام بھی ان میں رائج ہوگیا۔ ان لوگوں نے خود بھی اپنا نام یہی رکھا اور (اپنے حلقہ کے دوسرے لوگوں کو بھی) اسی نام سے موسوم کیا۔

یہ نام ان کی نشانی ہے۔ علم الٰہی ان کی صفت ہے۔ عبادت ان کا حلیہ ہے، تقویٰ اور پرہیزگاری ان کا شعار ہے اور حقیقت کے حقائق ان کے اسرار و رموز ہیں۔ وہ اپنے قبیلوں سے الگ ہیں، مگر غیرت کے گنبد میں بسنے والے اصحاب فضیلت ہیں، حیرت کے ملکوں کے باشندے ہیں، ہرگھڑی فضل الٰہی ان کے شامل حال ہے، ان کی آتش شوق و مستی ہر وقت شعلہ زن ہے اور (کیا کچھ اور ہے؟) کی صدا لگا رہی ہے۔

اے خدا تو ہمارا بھی انہی کے زمرہ میں حشر کر اور ہمیں بھی ان کے حالات عطا فرما۔

مخدوم جہاں شیخ احمد یحیٰ منیریؒ

تصوف اور اس کی حقیقت

(۱)

زیر نظر مضمون حضرت احمد یحیٰ منیریؒ کی کتاب ''مکتوبات صدی'' سے لیا گیا ہے۔ حضرت احمد یحیٰ منیریؒ ہندستان کے اکابر بزرگوں کی صف میں شامل ہیں۔ پیدائش اور وصال کی تاریخ ٦٦١ھ اور ٧٨٢ھ ہے۔

اللہ کی محبت کے سلسلہ میں آپ کے مجاہدے اور ریاضتیں بہت زیادہ تھے، چالیس سال تک خلوت میں رہے۔

اس کے بعد دین کی جو خدمت سرانجام دی، وہ اسلامی تاریخ کے روشن اوراق میں شامل ہے۔ آپ کی کتابوں کا شمار کئی درجنوں میں ہوتا ہے، ''مکتوبات صدی'' آپ کی وہ کتاب ہے کہ اسے شریعت و معرفت کا خزانہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ (مرتب)

اے میرے بھائی شمس الدین، اللہ تم کو سیدھا راستہ دکھائے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ شریعت اس راہ کا نام ہے جس کو انبیاء علیہم السلام اپنی امت کے لیے مقرر فرماتے ہیں۔ اس کام میں اللہ ان کا مددگار اور پشت پناہ ہوتا ہے۔ کل نبیوں کا ہمیشہ یہی معمول رہا کہ خلق اللہ کو انہوں نے پہلے توحید کی طرف بلایا۔ اس دعوت میں سب انبیاء برابر ہیں۔ سبھوں کی ایک پکار ہے۔ ایک دین ہے ایک معبود ہے۔ باتفاق ایک زبان ہو کر سبھوں نے اپنی اپنی امتوں کو یہی کہا۔ والھکم اله واحد۔ اللہ ایک اور اکیلا ہے۔ اور یہی فرمایا فاتقوا اللہ واطیعون. اللہ سے ڈرو اور اسی کی

بندگی کرو۔ حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے سے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے عہد مبارک تک، کل نبیوں کی خدائی باتوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ کیونکہ وحی الٰہی کے موافق دعوتِ خلق ہوا کرتی تھی۔ وحی الٰہی کے الفاظ ومعانی بواسطۂ حضرت جبریل علیہ السلام، نبیوں نے سنا سمجھا اور ان کو دل میں جگہ دی۔ ان کی سماعت اس سے بہرہ اندوز ہوتی رہی۔ ان کی عقل اس سے انوار کا اقتباس کرتی رہی۔ سب نبی اصل دعوت میں ہم خیال ہیں۔ ہاں، لغات وعبارات واستعارات وارکان شرائع میں البتہ اختلافات ہیں۔ دعوتِ توحید کے علاوہ دوسری دعوت عبودیت کی ہوتی ہے چونکہ انبیاء علیہم السلام خلائق کے طبیب ہیں، ہر زمانے میں وحی الٰہی کے موافق اپنی امت کے لیے حسب مصلحت وقت قاعدۂ ملت وضع فرماتے ہیں۔ پس خدائی پیام، جو نبیوں تک پہنچیں اور آپ حضرات نے ان کو قبول کیا ان کا نام وحی دعوت ہے اور جو لوگ سنتے ہیں اور اتباع کرتے ہیں، ان کو امت کہتے ہیں۔

اور اوامر ونواہی واصول وفروع دعوت کو شریعت کہتے ہیں۔ اور اس راہ میں چلنے کو اطاعت کہتے ہیں۔ جملہ احکام گردن پر رکھنے کو اسلام کہتے ہیں۔ اسلام پر ثابت قدم رہنے کو دین کہتے ہیں۔ اب تم غالباً اس کو سمجھ گئے ہونگے، کہ شریعت دین کی ایک راہ کا نام ہے، جو پیغمبروں کے ذریعہ سے قائم ہوتی ہے۔ لغت میں کشادہ راہ کو شارع کہتے ہیں۔ راہ شریعت کو بھی خدا نے ایسا کشادہ بنایا ہے کہ اس سے ہزاروں راستے نکلتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے اور اس طرف اشارہ کیا ہے۔ ستفرق امتی علیٰ ثلث وسبعین فرقة کلها هالكة الا واحدة فانها ناجية. میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی۔ جس میں بہتر گمراہ ہیں اور ایک نجات پانے والا ہے۔ ناجی فرقہ اہل سنت والجماعت کا ہے۔ اور اس کی تین قسمیں ہیں۔ صوفیائے کرام، محدثین، فرخندہ فرجام، فقہائے عظام طریقت کی راہ بھی شریعت ہی سے نکلی ہے۔ شریعت وطریقت میں جو فرق ہے، اس کو ہم بیان

کرتے ہیں۔ تم اسی سے سمجھتے جاؤ۔ شریعت میں توحید، طہارت، نماز، روزہ، حج، جہاد، زکوٰۃ اور دوسرے احکامِ شرائع ومعاملات ضروری کا بیان ہے۔ طریقت کہتی ہے کہ ان معاملات کی حقیقت دریافت کرو۔ ان مشروعات کی تہ تک پہنچو، اعمال کو قلبی صفائی سے آراستہ کرو۔ اخلاق کو نفسانی کدورتوں سے پاک کرو، جیسے ریا کاری ہے، ہوائے نفسانی ہے، ظلم وجفا ہے، شرک وکفر ہے وغیرہ وغیرہ۔ اچھا، اس طرح نہ سمجھے ہو تو یوں سمجھو۔ ظاہری طہارت، ظاہری تہذیب سے، جس امر کو تعلق ہے وہ شریعت ہے۔ تزکیۂ باطن تصفیۂ قلب سے، جس کو لگاؤ ہے وہ طریقت ہے۔ کپڑے کو دھوکر ایسا پاک بنا لینا کہ اس کو پہن کر نماز پڑھ سکیں، یہ فعل شریعت ہے۔ اور دل کو پاک رکھنا، کدورتِ بشری سے یہ فعل طریقت ہے، ہر نماز کے لیے وضو کرنے کو شریعت کا ایک کام سمجھو اور ہمیشہ باوضو رہنے کو طریقت کا دستور العمل تصور کرو۔ نماز میں قبلہ رو کھڑا ہونا شریعت ہے۔ اور دل سے اللہ کی طرف متوجہ ہو جانا طریقت ہے، حواس ظاہری سے جن معاملات دینی کا تعلق ہے، اس کی رعایت ملحوظ رکھنا شریعت ہے۔ اور جن معاملات دینی کو قلب وروح سے تعلق ہے، اس کی رعایت کرنا طریقت ہے۔ انبیاء علیہم السلام کا یہی معمول رہا کہ دین کا جو کام خود کرتے ہیں، وہی امت کو بھی حکم دیتے۔ مگر بعض اخلاق واعمال ایسے مہتم بالشان وکوہ وقار ہیں کہ اگر امت پر ان کا بوجھ ڈال دیا جائے تو ضعیف الحال امت پس جائے۔ اس لیے آسانی کے خیال سے امت کو ان کی تکلیف نہیں دیتے، اپنا وِرد خاص بنا لیتے ہیں۔ اور معمول کرلیتے ہیں جیسے نماز تہجد، صدقہ نہ لینا، سیر ہو کر نہ کھانا، دنیا سے اعراض کرنا، جس سے زندگی باقی رہے، اتنے ہی کھانے پر قناعت کرنا، مکان ولباس بھی محض بقدر ضرورت رکھنا وغیرہ وغیرہ۔ خلاصہ یہ ہوا کہ جس امر کے لیے امت کو مکلّف بنایا جائے، وہ شریعت ہے۔ اور جو کام ایسا ہے کہ تخفیف امت کے لیے انبیاء علیہم السلام اپنی ذات کو اس کا پابند کرلیں۔ اور لازمۂ احوال بنالیں، وہ

طریقت ہے، جو اعمال خاص انبیاء علیہم السلام کے ہیں ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم امت کے لیے ممنوع ومحظور ہے۔ اس میں جان وایمان کا خطرہ ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم نے تخصیص کردی ہے کہ خالصة لک من دون المؤمنین. آپ کے لیے یہ خاص ہے اور مومن کے لیے نہیں دوسری قسم وہ ہے کہ سنتِ پسندیدہ ہے۔ جو شخص اس کو اختیار کرے گا، درجۂ عوام سے زمرۂ خاص میں داخل ہوگا۔ عالی مرتبہ ہوگا، کمال ترقی ہوگی، سنو، شریعت میں اگر صحیح عذر ہو تو رخصت ہوجاتی ہے، جیسے بجائے وضو اور غسل تیمم کی اجازت ہے۔ سفر میں روزہ نہ رکھنا جائز ہے، وغیرہ وغیرہ۔ مگر طریقت کہتی ہے کہ رخصت ضعیف حالوں کے لیے ہے۔ مناجات عاجزوں پر تخفیف کے لیے ہے۔ چنانچہ اربابِ طریقت قوت وہمت جد ومبالغت سے کام لیتے ہیں۔ رخصت ومباح کی راہ سے اپنے کو باز رکھتے ہیں۔ حلال چیزوں کو بھی ڈر ڈر کے استعمال کرتے ہیں۔ حرص وطمع سے کنارے رہتے ہیں۔ شریعت میں راحت وآسایش کی ڈیوڑھی پر روک تھام ہے، خصوصا نفس امارہ سے بہت بچاؤ ہے، دیکھو، اگر مرید اپنے کو مباحات کی اجازت دیگا تو اس کا نفس دلیر ہوجائے گا۔ رفتہ رفتہ وہ مشتبہات کو بھی مباحات کے سلسلے میں لے آئے گا۔ پھر اس پر قناعت نہ کرے گا، آگے بڑھ کر محرمات میں مبتلا کردے گا۔ یہاں تک کہ دین بھی برباد ہوجائے گا۔ اتنی تقریر کے بعد، ہمیں امید ہے کہ تم شریعت وطریقت کو خوب سمجھ گئے ہوگے۔ شریعت کی ضرورت اور طریقت کے فوائد کا بھی تم نے اندازہ کرلیا ہوگا۔ برادر عزیز، بغیر شریعت کے طریقت کا قصد کرنا، ویسا ہی ہے کہ ایک شخص کوٹھے پر جانا چاہے، سیڑھی کو توڑ ڈالے اور دیوار پکڑ کر اوپر چڑھے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ دوچار ہاتھ بمشکل اوپر جائے گا، پھر پھسل پھسل کر گرے گا، یا یوں سمجھو کہ ایک شخص کو یہ خبط سمائے کہ ہم پتھر ایسا اچھال سکتے ہیں کہ نظر سے غائب ہوجائے، ہزار زور خرچ کرے گا، کوشش کا خاتمہ کردے گا ناکامیاب رہے گا۔ بمشکل اچھالے گا، دھم سے

آتا رہے گا۔ بغیر شریعت جسم خاکی پتھر سے بدتر ہے۔ وہ شخص فضائے طریقت میں اڑ نہیں سکتا، یہ کوشش لاحاصل ہوگی۔ یا یوں سمجھو کہ ایک شخص حج کو جائے، خلاف سمت کعبہ کے رخ کرے، سالہا سال بھی چلتا رہے گا تو بیت اللہ شریف تک نہ پہنچے گا۔ کیونکہ ہر مقصد کے لیے راستہ مقرر ہے۔ ہر قصد کے لیے شرط ہوا کرتی ہے۔ ہر صحبت کے لیے اہلیت اور نسبت کا ہونا ضروری ہے۔ قصد وصحبت کے لیے، شرط ونسبت جملۂ احکام شریعت ہیں۔ جب مرید راہِ شریعت میں واضح ہوتا ہے، حقوقِ شرعی کو بقدرِ امکان ادا کرتا ہے، اس وقت توفیق خیر اس کی رفیق ہوتی ہے، عوام کے دائرے سے وہ نکلتا ہے۔ سلوکِ طریقت اختیار کرکے، خواص کے ہمراہ ہوجاتا ہے برادرِ عزیز، اب بلاشک تم نے شریعت وطریقت کو پہچان لیا ہوگا۔ تم کو چاہیئے کہ گرتے پڑتے مطابعت وموافقت میں، ان پاک بزرگوں کے جو صاحبِ شریعت وطریقت گزرے ہیں، حتی الوسع دو ایک قدم بھی چلو اور مفلس وبےنوا کی طرح درگاہ میں اس بادشاہِ بےکس نواز وعاجز افراز کے باوجود، اس دوری وحجاب کے بھی عرض کرنے سے باز نہ آؤ۔ اور اس بات پر پکا عقیدہ رکھو کہ خزانۂ فضل میں جو کیمیائے لطف ہے اس کا ایک ذرہ بھی اگر مشرکوں کے شرک پر کافروں کے کفر پر چھڑک دیں تو توحید ہی توحید نظر آئے۔ اور قدحِ غیب میں جو شربتِ جان پرور ہے، اس کا ایک قطرہ بھی اگر خلق کے حلق میں ٹپکا دیں تو ایسے شیر وشکر ہوکر سب مل جائیں کہ مخالف ومنکر کا وجود ہی غائب ہوجائے۔ وہ تم کو اس عنایت کی نظر سے دیکھتا ہے، جو تم پر ازل میں ہوچکی ہے۔ آب وخاک ہونے کی حیثیت سے نہیں دیکھتا۔ اگر تمہاری آلودگی پر اس کی نظر ہوتی تو سمجھ لو کہ یہی سہی پونجی بھی غائب تھی۔ مگر وہاں کی مقبولیت کوئی معمولی بات ہے۔ اگر تمہارا بال بال شیطان مجسم بن جائے اور ہر ہر عضو فرعون کی طرح دعوئ باطل پیش کرے اور ہر ذرہ وجود نمرود کا جانشین ہوکر بیٹھے۔ اور چاروں طرف تمہارے دوزخ کی آگ شعلہ زن ہو، تم کچھ کہہ سکتے ہو کہ

تمہارا حال اس وقت کیا ہو، قسم خدا کی اگر تم پر اس کی نظر عنایت ہے، تو کوئی چیز، کوئی شخص تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ والسلام

(۲)

میرے بھائی شمس الدین، اللہ تم کو بزرگ بنائے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ شریعت وحقیقت دو لفظ معنی خیز ہیں، جو صوفیوں کے یہاں مستعمل ہیں۔ جس طرح شریعت میں اعمالِ ظاہر، جب درست ہوجاتے ہیں تو انسان اہلِ حقیقت طلب ہوجاتا ہے۔ اسی طرح انکشافِ احوالِ باطن کے بعد، آدمی اہلِ حقیقت کہلاتا ہے۔ یہ تو اظہر من الشمس ہے کہ ظاہر کو باطن کے ساتھ ایک خاص قسم کا لگاؤ ہے جب اصل پر غور کروگے تو دونوں کو الگ الگ نہ پاؤگے۔ دیکھو، ایمان کے لیے اقرار باللسان وتصدیق بالقلب شرط ہے۔ نہ تو صرف تصدیق سے ایمان کامل ہوگا۔ نہ فقط اقرار سے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے۔ کلمۂ توحید میں لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ دو جملے ہیں۔ حقیقت کے رموز واشارات لا الہ الا اللہ میں مستتر ہیں۔ اور شریعت کی جلوہ گری محمد رسول اللہ سے ہے۔ صحبت ایمان دونوں جملوں پر موقوف ہے۔ اب اگر کوئی چاہے کہ صرف ایک جملہ سے، ایمان کی منزل طے کرے تو بالکل ناممکن ہے۔ ہاں حکم میں البتہ شریعت حقیقت سے جدا ہے۔ زبان سے اقرار کرنا اور شے ہے۔ دل سے تصدیق کرنا اور چیز ہے۔ اقرار وتصدیق میں جو فرق ہے، وہی فرق شریعت وحقیقت میں ہے۔ مگر علما سے ظاہر کا خیال ہے کہ شریعت عین حقیقت ہے اور حقیقت عین شریعت۔ یہ سمجھنا مغالطہ سے خالی نہیں۔ اس عقیدے میں بہت بڑا نقصان یہ ہے کہ انسان باطنی ترقی سے محروم رہ جاتا ہے۔ اگرچہ مومن باقی رہتا ہے، اس میں کچھ کلام نہیں۔ اس سے زیادہ افسوس کے قابل ان لوگوں کی حالت ہے، جو شریعت کی راہ کی پروا نہیں کرتے اور اہلِ حقیقت بن کر بیٹھے ہیں۔ دعویٰ ان کا یہ ہے کہ

جب حقیقت منکشف ہوگئی تو شریعت کی ضرورت کیا باقی رہی؟ نعوذ باللہ من ذلک. یہ مذہب ملحدانہ ہے۔ ایسے مذہب واعتقاد پر خدا کی پھٹکار ہو۔ تھوڑی تفصیل حقیقت وشریعت کی اور سنو تو سمجھ جاؤ گے۔ حقیقت کی تعریف یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے تاقیام قیامت، نہ اس میں ردو بدل ہوا، نہ ہو سکتا ہے۔ حکم اس کا ایک طرح پر جاری ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کی معرفت ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ شریعت کی توصیف یہ ہے کہ اس میں تغیر وتبدل ہوتا رہا۔ جیسے اوامر ونواہی، ایک نبی کے وقت میں بعض چیز حلال، دوسرے نبی کے وقت میں حرام۔ یا ایک شخص کے لیے حلال، دوسرے کے لیے حرام۔ مگر کوئی وقت ایسا نہیں ہے کہ حقیقت موجود نہ ہو۔ شریعت کو بندے کے افعال سے تعلق ہے۔ حقیقت خدا کی ذات پاک سے وابستہ ہے والذین جاهدوا فینا لنهدینهم سبلنا. (جن لوگوں نے ہمارے لیے مشقت اٹھائی، ہم ان کو اپنا راستہ دکھادیتے ہیں)۔ اس آیت پاک میں مجاہدہ اصل شریعت ہے۔ اور ہدایت حقیقت ہے۔ بندہ نے جب احکامِ ظاہر کی محافظت کی، تو اللہ تعالیٰ نے احوالِ باطن کی محافظت فرمائی۔ شریعت کو تعلق کسب سے ہوا۔ حقیقت سے وہبی شان ظاہر ہوئی۔ شریعت کی مثال مادہ کی ہے۔ اور حقیقت کی مثال قلب کی۔ مادہ کا قوام قلب سے، اور قلب کی منزل مادہ ہے۔ شریعت قالب کے درجہ میں ٹھہری، حقیقت بمنزلۂ جان۔ جس طرح زندگی بغیر جان وقالب دونوں کے ناممکن ہے۔ اسی طرح ایمان کی بقا بے شریعت وحقیقت محال ہے۔ اگر سچ پوچھو تو یہ دولت یہ نعمت، اس گروہ صوفیہ کے سوا اور کہاں، شریعت وحقیقت دونوں معاملات ان کے نہایت سجل سراپا درست، یہ زبانی جمع خرچ نہیں ہے بلکہ اظہارِ حقیقت حال ہے۔ اور سنو، علم حقیقت کے تین رکن ہیں۔ خدا کی ذات کا علم، وحدانیت کے ساتھ اور اس کو بے شبیہ وبے نظیر جاننا۔ خدا کی صفات کا علم مع احکام خداوندی۔ خدا کے افعال وحکمت کا علم۔ اسی طرح علمِ شریعت کے بھی تین رکن ہیں۔ کتاب اللہ، سنت رسول اللہ۔

اجماع امت۔ اب ہم صاف صاف یہی کہیں گے کہ بغیر شریعت ورزی اہل حقیقت ہونے کا دعویٰ کرنا سراسر زندیقیت ہے۔ اور حقیقت سے بے خبر رہ کر صاحب شریعت بن جانا شان منافقانہ ہے۔ دراصل دونوں لازم وملزوم ہیں۔ اسی لیے اولیاء اللہ کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ علم درسی یعنی علم شریعت سے آراستہ، مجاہدہ وریاضت میں صدق واخلاص کا گہرا رنگ عمل خالص کی نورانیت۔ رفتہ رفتہ یہی عمل صالح، ان کو علم وراثت کا مخزن بنا دیتا ہے۔ جس کو علم حقیقت کہتے ہیں۔ علم وراثت عطائے محض ہے۔ اس کو درس وتدریس سے کوئی سروکار نہیں۔ جیسا کہ وعدۂ لطیف سے ظاہر ہے۔ من عَلِمَ بما علَم ورثه الله علم مالم يعلم. جس نے جانا، وہی جانا، جو اس کو بتایا گیا ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ وارث بنا دیتا ہے، اس علم کا جس کو کوئی جانتا نہیں۔ اسی علم وراثت یعنی علم کی حقیقت کی بدولت ان بزرگان دین کے اعمال واقوال افعال واحوال میں ایسا نمایاں تغیر نظر آتا ہے کہ علمائے ظاہر دنگ ہوکر رہ جاتے ہیں۔ اور یہ باتیں ان کی سمجھ سے باہر ہوتی ہیں۔ اپنے مقام کی رو سے کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہیں۔ ان باتوں کا کہیں نشان نہیں پاتے۔ حیران ہو کر انکار کر بیٹھتے ہیں۔ اور بول اٹھتے ہیں کہ یہ بات خلاف روایت ہے۔ اس کا کہیں وجود ہی نہیں۔ معاذ اللہ! کتنا بڑا یہ ظلم ہے کہ ایک فقیر بے نوا کے گھر میں، جو چیز نہ ہو، وہ اس کا مدعی بن جائے کہ جو شے ہمارے پاس نہیں، وہ محمد شاہ بادشاہ کے محل میں بھی نصیب نہیں۔ ان کو اس کی خبر نہیں کہ سنت اللہ کس طور پر جاری ہے۔ سنو! اللہ تعالیٰ ہرگز پسند نہیں کرتا کہ اپنے دوستوں کو مقام سری میں پہنچا کر، غلط الہام اور غلط مکاشفات میں ان کو مبتلا کر دے، کیونکہ ان بزرگوں کا دل جب انوار سری سے متجلی ہو جاتا ہے، تو اس پر جو بات ظاہر ہوتی ہے، سب حق کی طرف سے ظاہر ہوتی ہے۔ گویا ان کی زبان ان کے سر کی متبع ہوتی ہے۔ اور سر کو حق سے خاص تعلق ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں جو بات ان بزرگوں سے سرزد ہوگی وہ راست وصواب ہوگی۔

مثنوی

باعلم وعمل زبان شان راست　　میزان صفت اند بے کم وکاست

باحق جمع وزخود پریشان　　لا یعرفہم شعارِ ایشان

(علم اور عمل کے ساتھ ان کی زبانیں سچی ہیں۔ یہ لوگ ٹھیک ترازو کی طرح ہیں۔ اپنے سے جدا اور خدا سے ملے ہوئے ہیں۔ ان کی روش ایسی ہے کہ ان کو کوئی پہچان نہیں سکتا) لیکن ہم کو تم کو جو ان کی باتیں خلاف روایت اور خلاف کتاب وسنت معلوم ہوتی ہیں، یہ ہماری کج فہمی کا باعث ہے۔ دیکھو، جو شخص احول (بھنگا) ہوتا ہے، وہ ایک کو دو دیکھتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ جو ہم دیکھ رہے ہیں، یہی ٹھیک ہے۔ موحدان حقیقی کے نزدیک جتنے ظاہر بیں ہیں، سب کے سب احول روزگار ہیں، ہزار وہ کہا کریں کہ ہم سچ کہہ رہے ہیں، مگر ماننے کی بات نہیں، گویا دعوے راست بیانی کج فہمی کی دلیل ہے۔ چنانچہ یہ حال دیکھ کر بزرگانِ دین نے یہ روش اختیار کی ہے کہ اہلِ ظاہر کی بکواس کا خیال نہیں کرتے۔ معاف فرماتے ہیں۔ قاعدے کی بات ہے کہ اگر نابینا سے کوئی لغزش ہو جاتی ہے تو آنکھ والے ضرور چشم پوشی کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں قرآن شریف کا حکم بھی یہی ہے کہ: واعرض عن الجاهلين (جاہلوں سے الگ ہو جاؤ)۔ قطع نظر ان باتوں کے اس قدر شور وغوغا کا ایک خاص سبب بھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ جو لوگ اس علم تصوف کے جاننے والے تھے، رخصت ہو گئے اور طریقت کی روش کا ٹھیک ٹھیک چلنا مفقود ہو گیا۔ ہاں، شاذ ونادر کی بات دوسری ہے، خیر جب یہ ہوا کہ اہل حقیقت چھپ گئے اور جو خزانہ علم ان کے پاس تھا، وہ دفن کر دیا گیا۔ اب جو اس معرکہ کا مرد میدان بنتا ہے اور اس مذہب کا دعویٰ کرتا ہے، حقیقت حال یہ ہے کہ معنی حقیقت سے وہ خود بے خبر ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ عام خلق اللہ نے اس مذہب ہی سے انکار کر دیا، کہنے لگے کہ علم تصوف کی کوئی اصلیت ہی پائی نہیں جاتی۔ سچ ہے کہنا ان کا، کیونکہ جب اہل حقیقت نہ

رہے اور اس کا علم نہ رہا، تو اس مذہب کو بیان کون کرتا ہے۔ چنانچہ علم حقیقت پر عمل کرنا بھی اٹھ گیا۔ عمل علم کے بعد کی چیز ہے۔ اور علم کا حصول بیان پر موقوف ہے۔ افسوس صدافسوس، نہ اہل حقیقت رہے نہ علم رہا، نہ بیان رہا، نہ عمل رہا۔ یہ مرض صرف علم حقیقت ہی کو دامن گیر نہ ہوا، بلکہ علم شریعت بھی انہیں بلاؤں میں گھر گیا ہے۔ ہم تمہارے لیے، بہت زیادہ مناسب سمجھتے ہیں کہ تم اپنا عقیدہ ان بزرگان دین کی طرف سے بہت پاک وصاف رکھو۔ اور دل میں سمجھو کہ یہ حضرات کبھی خلافِ شریعت کوئی کام نہیں کرتے۔ جو شخص آدابِ شریعت سے ایک ادب بھی ترک کرنا پسند نہ کرے، وہ فرض وواجب کیوں کر ترک کرے گا۔ سیکڑوں حکایتیں آداب شریعت میں، ان بزرگان دین کی اس قدر مشہور ومعروف ہیں کہ زیادہ بیان کی ضرورت نہیں۔ ایک بزرگ کہا کرتے تھے کہ ہم خدا سے عمر ابدی چاہتے ہیں تاکہ تمام خلق بہشت کی ناز ونعمت میں مشغول رہے اور ہم دنیا کی بلاؤں میں گرفتار رہ کر، آدابِ شریعت میں ثابت قدمی کی منزلیں طے کرتے رہیں۔ سچ ہے، شریعت کی قدر جو یہ بزرگان دین جانتے ہیں، کوئی کیا جانے گا۔ اور آداب شریعت کا جوان کو خیال ہے کیا کسی کو خیال ہوگا۔ اللہ اکبر اتنی بڑی فقر کی دولت آخر کس کے طفیل میں ان کو ملی ہے۔ اسی پاک شریعت کے طفیل میں۔ سنو بھائی! شریعت ہو یا حقیقت۔ دونوں منزلیں کڑی ہیں۔ مگر دل ہارنا چہ معنی دارد، راہ طلب میں بھی کوئی سستی کرتا ہے۔ کامیابی عطائے محض ہے۔ عمل پر موقوف نہیں۔ اہل معرفت کا قول ہے کہ ملائکہ مقربین یہ سمجھے ہوئے تھے کہ ہماری اطاعت وفرمانبرداری اکرام ونوازش خاص کا سبب ضرور ٹھہرے گی۔ خلاف ورزی ایسی شے ہے، جس سے عزت وقدر جاتی رہتی ہے، اس لیے خدائے قدوس کے حضور میں بے محابا یہ بول اٹھے کہ ہم مطیع ہیں۔ آدم عاصی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو دکھایا کہ ایسا سمجھنا غلط فہمی ہے۔ ہماری نوازش واکرام کا اگر سبب ہے تو ہمارا فضل وکرم ہے۔ کسی کی اطاعت کسی کی عبادت نہیں۔

بھائی دیکھتے نہیں ہو کہ ساتوں آسمان وزمین کے فرشتوں کو جو اطاعت سے آراستہ تھے، ان کو یہ حکم ہوا کہ آدم کو سجدہ کریں۔ کون آدم؟ وہ آدم جو عبادت کی عین سے بھی سروکار نہیں رکھتا اور اطاعت کی ط سے بھی جس کو واسطہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا کیا معاملہ ہے۔ تم یہ سن کر حیران ہو گے کہ قصہ کیا ہے۔ ایسا کیوں ہوا۔ بھائی، تم کہاں ہو، اس سے بڑھ بڑھ کر معاملات ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ مگر ہمیں نہیں خبر کہاں ہے؟ اس کی قدرت کا اس کو ایک ادنیٰ کرشمہ سمجھو کہ اگر وہ چاہے تو ایک لحظہ میں ہزاروں آدمؑ اور ہزاروں عالم پیدا کر کے رکھ دے اور سیکڑوں کو حبیب، سیکڑوں کو اپنا خلیل بنالے۔ ہم جو کہہ رہے ہیں، یہ بات دیکھنے میں ایک پہاڑ سی معلوم ہوتی ہوگی۔ مگر یقین جانو کہ جو قدرت عرش سے فرش تک اور عُلا سے ثریٰ تک بے تکلف حکمران ہے۔ واللہ ایسے ایسے کاموں کو ایک ذرہ حقیر کے برابر بھی نہیں سمجھتی۔ والسلام۔ (ماخوذ مکتوبات صدی)

اولیاء کرام کی فضیلت

ابن جوزی کی نظر میں

ابن جوزی، امت کی ممتاز فاضل شخصیت ہیں، وہ فقیہ تھے، محدث تھے، واعظ تھے، نیز بہت ساری کتابوں کے مصنف ہیں "تلبیس ابلیس" کتاب میں انہوں نے اہل تصوف کی شدید مخالفت کی ہے، لیکن تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ انہیں ایک دور میں ایک ایسی بیماری لاحق ہوگئی تھی، جس کی وجہ سے مزاج میں عدم اعتدال اور اشتعال غالب ہوگیا تھا، "تلبیس ابلیس" ان کی اس دور کی لکھی ہوئی کتاب ہے۔ ابن جوزی حضرت شاہ عبدالقادر جیلانیؒ کے دور کی شخصیت ہیں، حضرت جیلانیؒ کا جنازہ نماز انہوں نے ہی پڑھائی تھی۔ان کی زیر نظر تحریر سے ان کی نظر میں اہل اللہ کی وقعت کا اندازہ ہوتا ہے۔(مرتب)

اولیاء اور صلحاء ہی مقصودِ کائنات ہیں اور یہی حضرات حصول علم کے بعد، اس کی حقیقت پر عامل ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "جس نے میرے کسی ولی سے عداوت کی، تو میں اس سے اعلان جنگ کرتا ہوں اور میرے بندہ نے میرے فرض کی ادائیگی سے زیادہ کسی اور چیز کے ذریعہ میرا قُرب نہیں حاصل کیا، اور میرا بندہ برابر نوافل کے ذریعہ میرا قُرب حاصل کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، پس جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، تو میں اس کا کان ہوجاتا ہوں، جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ ہوجاتا ہوں، جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ ہوجاتا ہوں، جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پَیر ہوجاتا ہوں، جس سے وہ چلتا ہے، اور اگر

وہ مجھ سے سوال کرے تو میں ضرور اس کو دوں اور اگر مجھ سے پناہ مانگے، تو میں ضرور اس کو پناہ دوں اور میں کسی چیز میں، جس کو کرنے والا ہوتا ہوں، تردد نہیں کرتا، جیسا کہ مومن کی جان (قبض کرنے) میں تردد کرتا ہوں، جب کہ وہ موت کو ناگوار سمجھتا ہے اور میں اس کی تکلیف کو پسند نہیں کرتا۔ (بخاری شریف)

اور حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں اور آپ حضرت جبرئیل سے اور وہ اپنے پروردگار عزوجل سے، کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "جس نے میرے ولی کی اہانت کی تو اس نے مجھے جنگ کا چیلنج دیا اور میں کسی چیز میں جس کو کرنے والا ہوتا ہوں، تردد نہیں کرتا، جیسا کہ مومن کی جان قبض کرنے میں، کہ میں اس کی تکلیف کو پسند نہیں کرتا اور اس سے کوئی چارہ بھی نہیں، اور میرے بعض مومن بندے، ایک نوع کی عبادت کرنا چاہتے ہیں، لیکن میں اس کو اس سے روک دیتا ہوں، تاکہ اس کے اندر عُجب نہ داخل ہوجائے اور وہ اس کو تباہ کردے، اور میرے بندہ نے میرے فرض کی ادائیگی کے برابر کسی اور چیز سے میرا قُرب حاصل نہیں کیا، اور ہمیشہ میرا بندہ نفل ادا کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں اور میں جس سے محبت کرتا ہوں، تو اس کا کان اور اس کی آنکھ اور اس کا ہاتھ اور اس کا مددگار ہوجاتا ہوں، وہ مجھ کو پکارتا ہے، تو میں اس کی پکار کو قبول کرتا ہوں، اور وہ مجھ سے سوال کرتا ہے، تو میں اس کو دیتا ہوں اور وہ میرے ساتھ خلوص اختیار کرتا ہے، تو میں اس کے ساتھ خیر کا معاملہ کرتا ہوں، اور میرے بعض مومن بندے ایسے ہیں کہ ان کے ایمان کو فقر وافلاس ہی درست رکھ سکتا ہے، اور اگر میں اس کو کشادگی عطا کردوں، تو وہ اس کو تباہ کردے، اور میرے بعض بندے ایسے ہیں کہ جس کے ایمان کو غنا اور تونگری ہی درست رکھ سکتا ہے اور اگر میں اس کو مفلس کردوں تو وہ اس کو تباہ کردے، اور میرے بعض مؤمن بندے ایسے ہیں، کہ جس کے ایمان کو بیماری ہی درست رکھ سکتی ہے اور اگر میں اس کو صحت عطا

کردوں تو وہ اس کو تباہ کردے، اور میرے بعض مومن بندے ایسے ہیں، کہ جس کے ایمان کو صحت ہی درست رکھ سکتی ہے اور اگر میں اس کو بیمار کردوں تو وہ اس کو تباہ کردے، میں چونکہ اپنے بندوں کے احوالِ قلوب کا علم رکھتا ہوں، اس لئے اسی کے مطابق ان کے ساتھ معاملہ کرتا ہوں۔ یقیناً میں علیم اور خبیر ہوں۔

اسی روایت کو عبدالکریم جزری نے، حضرت انسؓ سے مختصرا روایت کیا ہے، جس میں ہے کہ میں اپنے اولیاء کی مدد کرنے کے لئے سب سے زیادہ جلدی کرتا ہوں، میں ان کے واسطے غضبناک شیر سے بھی زیادہ غضب کرتا ہوں۔

اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "ان من عباداللہ من لو اقسم علی اللہ لا یره" (بیشک اللہ کے بعض بندے ایسے ہیں کہ اگر اللہ پر قسم کھالیں تو اللہ اس کو ضرور پورا کردے)۔ (بخاری، مسلم، ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ، احمد)

عطاء بن یسار سے روایت ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے پروردگار تیرے وہ لوگ کون ہیں، جو تیرے اہل ہیں، جن کو تو اپنے عرش کے سایہ میں جگہ دیگا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وہ وہ لوگ ہیں، جن کے ہاتھ بے گناہ ہیں، جن کے دل پاک ہیں۔ جو میرے حلال کے سبب باہم محبت کرتے ہیں۔ وہ وہ لوگ ہیں کہ جب میرا ذکر کیا جاتا ہے، تو ان کا بھی ذکر کیا جاتا ہے اور جب ان کا ذکر کیا جاتا ہے، تو میرا بھی ذکر کیا جاتا ہے اور ہم ان کا ذکر کرتے ہیں اور وہ وہ لوگ ہیں، جو باوجود تکلیف کے پوری طرح وضو کرتے ہیں، میرے ذکر کی طرف ایسے ہی رجوع کرتے ہیں، جس طرح گدھ اپنے گھونسلوں کی طرف، میری محبت پر ایسے ہی فریفتہ ہوتے ہیں، جیسے بچہ لوگوں کی محبت پر اور میرے حرام کو جب حلال سمجھا جانے لگتا ہے، تو وہ ایسے ہی غضبناک ہوتے ہیں، جس طرح جنگ کے وقت چیتا۔

وہب بن منبہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جب

حضرت موسیٰ اور ان کے بھائی حضرت ہارون کو فرعون کے پاس بھیجا، تو فرمایا کہ اس کی زینت ومتاع تم لوگوں کو تعجب میں نہ ڈالے اور تم دونوں اس کی طرف اپنی آنکھیں نہ اٹھانا اس لئے کہ وہ دنیوی زندگی کی رونق اور دنیا دار خوشحالوں کی آرائش ہے۔ اور اگر میں تم دونوں کو دنیوی زینت سے آراستہ کرنا چاہوں، تا کہ فرعون اس کو دیکھ کر یقین کرلے، کہ اس کی قدرت اس سے بالکل عاجز ہے، جو تم دونوں کو عطا کی گئی ہے، تو ضرور آراستہ کردوں۔ لیکن میں تم کو اس سے روکتا ہوں اور اس کو تم سے پھیرتا ہوں، اور میں اپنے اولیاء کے ساتھ اسی طرح کیا کرتا ہوں۔ اور پہلے ہی میں نے ان کے لئے خیر مقرر کر رکھا ہے، پس میں ان کو دنیا کی نعمت وآسائش سے ہٹاتا ہوں، جس طرح مہربان چرواہا اپنی بکریوں کو ہلاکت والی چراگاہوں سے ہٹاتا ہے اور میں ان کو اس کی خوشحالی اور عیش سے اس طرح بچاتا ہوں، جس طرح مہربان چرواہا، اپنے اونٹوں کو گندی جگہوں سے بچاتا ہے اور یہ اس لئے نہیں کہ میں ان کو کم درجہ کا سمجھتا ہوں، بلکہ اس لئے تا کہ وہ میرے اعزاز میں سے اپنا حصہ صحیح وسالم رہ کر، پورا پورا حاصل کرلیں اور دنیا ان کو کوئی تکلیف نہ پہنچا سکے اور نہ خواہش نفسانی ان پر کوئی زیادتی کر سکے۔

اور جان لو کہ زہد فی الدنیا سے بڑھ کر کسی اور زینت سے بندے آراستہ نہیں ہوتے، اس لئے کہ وہ متقیوں کی زینت ہے، ان کے اوپر اس کا لباس ہے، جس سے وہ پہچانے جاتے ہیں، یعنی سکینہ اور خشوع، سجدہ کے اثر سے ان کے چہروں میں نشانی ہے، یقیناً یقیناً یہی میرے اولیاء ہیں، جب تم ان سے ملو، تو ان کے سامنے تواضع اختیار کرو اور اپنے قلب وزبان ان کے تابع رکھو اور جان لو! کہ جس نے میرے کسی ولی کی اہانت کی یا اس کو خوفزدہ کیا، تو اس نے مجھ کو جنگ کا چیلنج دیا اور مجھ سے مقابلہ کیا اور میرے سامنے اپنی ذات پیش کی اور مجھ کو اس کی طرف بلایا اور میں اپنے اولیاء کی مدد کے لئے سب سے زیادہ جلدی کرتا ہوں، کیا مجھ سے

جنگ کرنے والا گمان کرتا ہے کہ میرے مقابلہ میں کھڑا ہوسکتا ہے؟ یا مجھ سے دشمنی
کرنے والا گمان کرتا ہے کہ مجھ کو عاجز کردے گا؟ یا میرے مقابلہ پر آنے والا کیا
گمان کرتا ہے، کہ مجھ سے آگے بڑھ جائے گا یا مجھ سے گزر جائے گا؟ بھلا یہ کیسے
ممکن ہے، جب کہ میں خود ان کا بدلہ لینے والا ہوں، دنیا میں بھی اور آخرت میں
بھی، ان کی نصرت دوسرے کے سپرد نہ کروں گا۔

اور وہب بن منبہ ہی سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ، حواریوں نے کہا
کہ اے عیسیٰ! اللہ کے وہ اولیاء کون ہیں، جن پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین
ہوتے ہیں؟ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا یہ وہ لوگ ہیں، جنہوں نے دنیا کے
باطن کو دیکھا جبکہ لوگوں نے دنیا کے ظاہر کو دیکھا اور جنہوں نے دنیا کے آجل کو
دیکھا، جب کہ لوگوں نے اس کے عاجل کو دیکھا، پھر اس میں سے اس حصّہ کو فنا
کردیا، جس سے ان کو خوف ہوا کہ وہ ان کو ہلاک کردے گا اور اس حصّہ کو چھوڑ دیا،
جس کو انہوں نے جانا کہ وہ ان کو چھوڑ دے گا، پس وہ جس کو زیادہ سمجھے تھے وہ کم
نکلا اور جس کو وہ محفوظ کئے ہوئے تھے، وہ فوت ہوگیا اور جس کو پاکر وہ خوش ہوئے،
وہ رنج وغم کا سبب ہوگیا، پھر اس دنیا سے حاصل شدہ چیز میں سے، جس نے ان کا
مقابلہ کیا، اس کو انہوں نے چھوڑ دیا اور جو اس پر ناحق بلند ہوئی اس کو پست کردیا،
دنیا ان کے پاس پرانی ہوئی، لیکن وہ نئی نہیں بناتے اور دنیا ان کے درمیان ویران
ہوئی، لیکن وہ اس کو آباد نہیں کرتے اور دنیا ان کے سینوں میں مرگئی، لیکن وہ اس کو
زندہ نہیں کرتے، وہ اس کو منہدم کرتے ہیں اور اس سے اپنی آخرت کی تعمیر کرتے
ہیں اور وہ اس کو بیچتے ہیں اور اس سے وہ چیز خریدتے ہیں، جو باقی رہے انہوں نے
اس کو چھوڑ دیا اور اس کے چھوڑنے پر وہ خوش ہیں اور انہوں نے اس کو فروخت کردیا
اور اس میں وہ نفع میں ہیں۔ انہوں نے دنیا داروں کو دیکھا کہ پچھاڑے پڑے
ہوئے ہیں اور طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا ہیں، تو انہوں نے موت کے ذکر کو

زندہ کیا اور حیات کے ذکر کو مردہ کردیا، وہ اللہ اور اللہ کے ذکر سے محبت کرتے ہیں
اور اس کے نور سے روشنی حاصل کرتے ہیں، ان کا عجیب حال ہے اور ان کے پاس
جو علم ہے، وہ بھی عجیب ہے، ان کے ساتھ کتاب قائم ہے اور وہ کتاب کے ساتھ
قائم ہیں، ان کے ساتھ کتاب ناطق ہے، اور وہ کتاب کے ساتھ ناطق ہیں، انہی
سے کتاب کا علم ہے اور وہی کتاب کے عالم ہیں، انہوں نے جو کچھ حاصل کرلیا ہے،
اس کے علاوہ کسی چیز کو وہ لائق تحصیل نہیں سمجھتے اور جس کے امیدوار ہیں، اس کے
علاوہ وہ کسی چیز کو امان نہیں سمجھتے اور جس سے وہ ڈرتے ہیں، اس کے علاوہ کسی چیز کو
خوف کی چیز نہیں سمجھتے۔ (احمد)

حضرت کعبؓ نے فرمایا کہ نوح علیہ السلام کے بعد ہمیشہ دنیا میں چودہ
حضرات ایسے رہیں گے، جن کے سبب سے عذاب ہٹایا جائے گا۔ (احمد) اور سفیان
بن عیینہ نے فرمایا کہ "عند ذکر الصالحین تنزل الرحمة" (صلحاء کے ذکر کے
وقت، رحمت نازل ہوتی ہے) محمد بن یونس کہتے ہیں کہ میں نے صلحاء کے ذکر سے
زیادہ قلب کے لئے نفع بخش کوئی چیز نہیں دیکھی۔ (صفة الصفوة ج۱)

ف: علامہ ابن جوزیؒ، جن کو عموماً خشک کہا جاتا ہے، وہ کتنے شدومد سے اولیاء
کی صفت وفضیلت اور ان کے ذکر کی اہمیت وضرورت کو بیان فرما رہے ہیں، جو
آب زر سے لکھے جانے کے لائق ہے۔ اب بھی ہم تسلیم نہ کریں، تو محل تعجب ہے
واللہ ولی التوفیق.

اہل تصوف کے حالت استغراق

کے وقت کے مشاہدات

اور ان کی نوعیت

ابن خلدون فلسفۂ تاریخ کے امام سمجھے جاتے ہیں۔ موجودہ دور کے سب سے بڑے فلاسفر ٹائن بی نے اپنی فلسفہ تاریخ کی کتاب میں ان کی تعریف کے لئے سات صفحات مخصوص کئے ہیں۔ سارے مغربی فلاسفر، ان کی تعریف میں رطب السان ہیں، اس سلسلہ میں ابن خلدون کی منفرد کتاب ''مقدمہ ابن خلدون'' کے نام سے ہے، جس میں انہوں نے قوموں، ملتوں، ملکوں اور مختلف طبقات کے عروج وزوال اور مختلف فنون کے ارتقا وزوال کے اسباب پر علمی بحث کی ہے اور ان اصولوں کی نشاندہی کی ہے جو ان فنون وغیرہ میں قدرت کی طرف سے کار فرما ہیں۔ تصوف کے موضوع پر ان کا درج ذیل مضمون مقدمہ ابن خلدون کی تلخیص پر مشتمل ایک کتاب سے لیا گیا ہے۔ (مرتب)

یہ علم بھی منجملہ ان شرعی علوم کے ہے، جو عصرِ نبوت کے بعد ظہور پذیر ہوئے۔ جہاں تک اس گروہ کا تعلق ہے، جسے صوفیاء کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، ذوق عبادت کے اظہار کے لیے، سلف وصحابہ کے زمانہ میں بھی برابر موجود رہا ہے۔ یعنی صحابہ وتابعین کی تاریخ میں اکثر یہ ملتا ہے کہ یہ لوگ حق وہدایت کے اس طریق پر گامزن ہیں۔ عبادت کے لیے وقف ہیں۔ دنیا اور اس کے زخارف سے روگرداں ہیں اور خلوتوں میں اللہ کے ذکر سے رطب اللسان ہیں۔

لیکن دوسری صدی ہجری میں، جب لوگ دنیا پر ٹوٹ پڑے اور اس کی لذتوں پر والہ وشیدا ہوئے، تو ایک جماعت خصوصیت سے صوفیاء کے نام سے موسوم ہوئی۔ جنہوں نے عبادت اور بندگی کو اپنا شعار ٹھہرایا۔

وجہ تسمیہ۔ کیا تصوف کا اشتقاق لفظ صوف سے ہے؟

قشیری کہتے ہیں کہ لفظ صوفی کا اشتقاق، عربیت کے نقطۂ نظر سے صفایا صفہ سے درست نہیں۔ نہ قیاس لغوی ہی اس کی تائید کرتا ہے۔ صوف (پشمینہ) سے بھی اس کی بناوٹ صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ ان لوگوں کا ہمیشہ صوف (پشمینہ) پہننا غیر اغلب ہے۔

ہمارے نزدیک یہ بات زیادہ قرین قیاس ہے کہ صوفی کا اشتقاق صوف ہی سے ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اول اول جب دوسرے لوگوں نے لباسِ فاخرہ پہننا شروع کیا، تو انہوں نے پشمینہ کو ترجیح دی، تاکہ ان میں اور لوگوں میں امتیاز ہو سکے، جن کی توجہات دینی کو دنیا کی لذتوں نے اپنی جانب کھینچ لیا پھر جب زہد اور مخلوق سے علیحدگی وانفرادی عبادت و ذوق ہی ان کا شیوہ قرار پایا، تو ترقیات روحانی ان کے ساتھ مخصوص ہوگئیں اور یہی اختصاص ان کی پہچان ہوئی۔

انسان کا شعور — ادراکات کی ایک اور قسم

یہ ترقیات کیا ہیں؟ اس کی تفصیل انسان کے اس تصور سے معلوم ہوگی، جو ان کے پیش نظر ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ خود یہ ادراکات کیا ہیں؟ ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک نوع ان ادراکات کی ہے، جن کا تعلق علوم ومعارف اور یقین وظن کی کیفیتوں سے ہے اور دوسری قسم ان ادراکات پر مشتمل ہے، جو حزن وفرح اور نشاط یا فرح وغم کا احساس، اس بات پر موقوف ہے کہ جو چیز احاطہ احساس میں آ رہی ہے، اس کا مزاج کیسا ہے، کیا وہ لذت آفریں ہے یا اس سے غم ابھرتا اور پیدا ہوتا ہے۔

پھر ادراکاتِ انسانی انھیں دو قسموں میں دائر وسائر نہیں، بلکہ ایک قسم اور ہے، جو مجاہدہ وریاضت کی رہینِ منت ہے اور یہ ادراکات بھی، اسی طرح نشاط وفرحت کا باعث ہوتے ہیں۔ جس طرح یہ سابق الذکر ادراکات، یعنی ایک طالب وسالک جب ریاضت کرے گا اور عبادت وذوق میں قدم بڑھائے گا تو لامحالہ اس پر مسرت وشادمانی کے دروازے کھلیں گے۔ اور ایک مقام سے دوسرے مقام تک روح کی پرواز ہوگی۔ یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے بالآخر سالک، توحید ومعرفت کی اس سرحد تک پہنچ جائے گا، جو مطلوب اور غایت اصلی ہے۔

اعمال، مجاہدہ اور ریاضت کے بعد، ان مراتب ونتائج کا حصول اتنا ضروری ہے کہ اگر سالک ان سے محروم رہے، تو یہ جان لے کہ کہیں مجاہدہ وریاضت میں خلل واقع ہوگیا ہے۔

فقہاء اور صوفیاء میں اعمال کے اعتبار سے، ایک باریک فرق ہے۔ فقیہ اعمال کو اطاعت وامتثال کی ترازو پر تولتا ہے اور یہ دیکھتا ہے کہ عبادات صحیح طریق سے ادا ہو پائیں یا نہیں۔

صوفیاء عبادات کو اذواق ومواجید کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں، کہ روح کو ان سے لذت وارتقاء نصیب ہوا یا نہیں۔ گویا ان کا طریقہ سراسر محاسبہ نفس کا طریق ہے۔

نفس وروح کا یہ ارتقاء جاری رہتا ہے اور سالک کے سامنے، ایک مقام کے بعد دوسرا مقام آتا رہتا ہے، جیسے یہ مجاہدہ وریاضت سے، یکے بعد دیگرے ان کو طے کرتا رہتا ہے۔

صوفیاء کی متعین اصطلاحات کیوں کر مشہور ہوئیں؟

اہل تصوف کے کچھ اپنے مخصوص آداب ہیں، اور متعین اصطلاحات ہیں، جن کا ان میں زیادہ رواج ہے۔ کیونکہ قاعدہ یہ ہے، کہ جب کبھی نئے معانی کا ظہور

ہوگا، ہم مجبور ہوں گے کہ ان کے لیے کوئی ایسی اصطلاح وضع کریں، جو ان کو پوری طرح ادا کرسکے۔ صوفیاء کو چونکہ مجاہدہ اور محاسبہ نفس کے سلسلہ میں، نئے نئے اذواق ومواجید کی طرف بڑھنے اور ترقی کرنے کا موقع ملا اور عجیب عجیب کیفیتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس لیے ان کے ہاں الگ قسم کی اصطلاحات چل پڑیں۔

پھر جب علوم کی تدوین ہوئی اور فقہاء نے فقہ، اصول اور کلام وتفسیر پر باقاعدہ کتابیں لکھنا شروع کیں، تو اس مسلک کے لوگوں نے بھی قلم اٹھایا اور تدوین وتالیف کی طرح ڈالی۔

قشیری نے تو کتاب ''الرسالہ'' اور سہروردی نے ''عوارف المعارف'' میں اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ زہد وورع کیا چیز ہے؟ محاسبہ نفس کا کیا تقاضا ہے؟ اور اخذ وترک یا امر ونہی میں کیوں کر اقتداء کی جائے؟

لیکن غزالی نے احیاء میں ان مضامین پر اضافہ کیا۔ انہوں نے جہاں زہد وورع کی حقیقتوں کو بیان کیا، وہاں ان کی اصطلاحات سے بھی بحث کی، اور یہ بھی بتایا کہ اس گروہ کے سنن وآداب کیا ہیں؟ گویا وہ چیز جو محض طریق عبادت وزہد سے تعبیر تھی، اس نے اب علم وفن کی شکل اختیار کرلی۔

ریاضت ومجاہدہ کی ایک ہی لگی بندھی شکل نہیں

چونکہ تعلیم وتربیت کے انداز اس گروہ میں مختلف رہے ہیں۔ ریاضت کی بھی کوئی ایک ہی شکل نہیں، جو متفق علیہ ہو۔ غرض بہر آئینہ یہ ہے، کہ قوی جسم کے تقاضوں کو مضمحل کردیا جائے اور روح کو اس کی صحیح صحیح غذا بہم پہنچائی جائے۔ پھر جب یہ ہو لیتا ہے کہ روح اپنی غذا کو پالے تو موجودات کا کوئی گوشہ بھی، اس کی دسترس سے باہر نہیں رہتا اور ازسمک تابہ سماک، ہر ہر چیز کی حقیقت اس پر کھل جاتی ہے۔

ادراکات کی یہ نوعیت ہمیشہ صحیح نہیں ہوتی، الا یہ کہ اس کے ساتھ ذکر وعمل کی استواری بھی ہو

کشف کی یہ کیفیت اپنے نتائج کے اعتبار سے، ہمیشہ صحیح اور کامل نہیں ہوتی، جب تک کہ استقامت اور ذکر کی استواری سے یہ پیدا نہ ہو۔ کیونکہ کبھی کبھی فاقہ اور خلوت سے ایسے لوگوں کو بھی کشف عطا ہوجاتا ہے، جو دینی اعتبار سے کسی مقام پر فائز نہیں ہوتے، جیسے جادوگر وغیرہ۔

اس کی حقیقت کو آئینہ کی مثال سے سمجھنے کی کوشش کیجیے کہ، جو چیز بھی اس کے سامنے آئے گی، اس میں منعکس ہوگی۔ اور اس کی ایک صورت اس میں ہوگی۔ اب اگر یہ آئینہ مسطح نہیں ہے، بلکہ محدب یا مقعر ہے، تو اس کا اثر اس نقش اور عکس پر بھی پڑے گا۔ اس لیے اس کا ٹیڑھا اور ترچھا ہونا لازمی ہے۔ صحیح اور کامل انعکاس اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے، کہ جب آئینہ مسطح اور ہموار ہو۔ نفس کو بھی بس اسی حیثیت سے دیکھیے۔ اگر اس میں استقامت واستواری ہے، تو ریاضت سے اس میں حقائق اشیاء کا انعکاس ٹھیک طرح سے ہوجائے گا، ورنہ نہیں۔ متاخرین نے جب کشف کی اس نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کی، جس سے روح، عرش، کرسی اور حقائق موجودات پر روشنی پڑتی ہے، تو قصور مدراک کے سبب اس میں ناکام رہے۔ اصحاب فتویٰ کے تو ان کے بارہ میں دوگروہ ہوگئے۔ ایک نے ان کی تصدیق کی، اور دوسرے نے جھٹلایا اور تکذیب کی۔

اس سلسلہ میں زیادہ الجھاؤ کی دراصل یہ بات ہے کہ دلیل وبرہان کی فرمانروائی یہاں نہیں چلتی۔ کیونکہ یہ ایسے حقائق ہیں، جو سراسر وجدانیات سے متعلق ہیں۔

فرغانی نظریۂ وجود

وجود اور مراتب وجود میں جو نسبت ہے، اس کی تعیین و وضاحت کرتے ہوئے، الفرغانی شارح قصیدہ ابن الفارض نے، جو روش اختیار کی ہے، اس سے مسئلہ میں اور بھی غموض پیدا ہوگیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمارے گرد وپیش پھیلی ہوئی تمام کائنات وحدنیت سے صادر ہوتی ہے، جو احدیت کا مظہر ہے اور ان دونوں کے صدور کا سرچشمہ وہ ذات گرامی ہے، جو عین وحدت ہے۔ اس صدور اور ظہور کو ان کی اصطلاح میں تجلی سے تعبیر کرتے ہیں۔

پہلی تجلی ان کے نزدیک خود ذاتِ گرامی کا اضافۂ ایجاد واظہار پر آمادہ ہونا ہے۔ اسی کو تجلی الذات علیٰ نفسہ بھی کہتے ہیں۔ اس سے اس کمال کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے، جو اس حدیث سے مترشح ہوتا ہے۔

کنت کنزا مخفیا فاحببت ان اعرف بین الناس فخلقت الخلق لیعرفونی۔

میں پہلے کنزِ مخفی تھا، پھر میں نے چاہا کہ لوگ مجھے پہچانیں، تب میں نے کائنات کو لباسِ وجود بخشا، تاکہ لوگ میرے کمالاتِ ربوبیت پہچانیں۔

تجلی اول کے، جس میں ذاتِ گرامی، ایجاد واظہار پر آمادہ ہوتی ہے، ان کے ہاں کئی نام ہیں، اسے عالمِ معانی بھی کہتے ہیں اور الحضرۃ الکمالیہ اور حقیقتِ محمدیہ کے لفظ سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں، اسی کی وسعتوں میں حقائق صفات، لوح وقلم، انبیاء اور اولیاء کے تمام باکمال بزرگوں کا سلسلہ پنہاں ومضمر تھا۔ پھر ایک خاص ترتیب سے، جو ان کا ظہور وصدور ہوا تو یہ اسی اجمال حقیقتِ محمدیہ کی درحقیقت تفصیل تھی۔

ان حقائق سے کچھ دوسرے حقائق ابھر کر کے سامنے آئے، اس مقام کو اس گروہ کی اصطلاح میں مرتبہ مثال کہتے ہیں۔

مرتبہ مثال سے عرش صادر ہوا۔ اس کے بعد اسی کا ظہور ہوا۔ پھر افلاک منت پذیر وجود ہوئے۔ پھر عالمِ عناصر پیدا ہوا۔ اور اس کے بعد جا کر کہیں عناصر میں ترکیب وتالیف کا دور دورہ ہوا۔

لیکن صرف عالمِ رتق میں، اس کے بعد جب یہ حقائق اس وجود میں متجلی ہوئے، تو یہ عالمِ فتق پیدا ہوا۔

الفرغانی کی اس تعبیر کو جس مدرسۂ خیال سے موسوم کیا جاتا ہے، اس کا معروف نام مذہب اہل التجلی والمظاہر ہے۔ ظاہر ہے کہ مراتبِ وجود کے بارہ میں یہ تعبیر ایسی ہے، جس کو اہلِ نظر نہیں سمجھ پاتے۔ ایک تو اس بناء پر کہ یہ کلام اور پیرایہ بیان غامض ہے۔ دوسرے اس بناء پر کہ اہلِ مشاہدہ ووجدان کے طریق فہم میں اور ان لوگوں کے اندازِ فکر میں جو صرف دلائل پر بھروسہ رکھتے ہیں، بڑا فرق ہے۔

پھر یہ ترتیب ایسی ہے، جس سے ظاہر شریعت کا بھی انکار لازم آتا ہے۔

ایک اور مدرسۂ خیال

ایک طائفہ اور ہے۔ اس نے توحید مطلقہ میں، یہ عجیب وغریب رائے اختیار کی ہے کہ نفس وجود ایک ہے۔ اجمال وتفصیل میں فرق، قوی اور ان کے اظہار ونمود کا ہے۔ مثلاً وجود ہی میں ایسے قوی تھے، جنہوں نے تفصیل اور پھیلاؤ میں تمام حقائق موجودات کا قالب اختیار کیا۔ پھر یہ حقائق اپنے مضمرات میں ایسے قوی کو متضمن تھے، کہ ان سے عناصر نے نشو وارتقاء کی منزلیں طے کیں اور عناصر ایسے قوی اور صلاحیتوں پر مشتمل تھے کہ ان سے معدنیات کا نظام پیدا ہوا۔ اسی طرح معدنیات نے حیوانات کو اور حیوانات نے انسان کو جنم دیا۔ اور پہلے سے یہ کڑیاں اپنی ماسبق کڑیوں میں، بصورت جمال مندرج وپنہاں تھیں۔

آخر میں فلک کا مرتبہ ہے، جو انسان اور انسان سے مافوق ذوات کا سرچشمۂ ظہور ہے۔

لیکن وہ قوت، جو ان تمام موجودات کو گھیرے ہوئے ہے، وہ بغیر تفصیل کے ذاتِ الٰہی ہے، جو ہر ہر جہت سے کائنات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ جہت ظہور سے بھی اور جہت خفاء سے بھی۔ صورت کے پہلو سے بھی اور مادہ کے پہلو سے بھی۔ فرق واعتبار، بساطت وتفصیل کا ہے۔ یعنی حقیقتِ واحدہ بسیط ہے اور یہ عالمِ رنگ وبو مفصل ہے۔

اس ذاتِ الٰہی کو کائنات سے کیا نسبت ہے؟ اس کی تعیین میں کبھی تو یہ گروہ، یہ کہتا ہے کہ جو تعلق جنس کا نوع کے ساتھ ہے، بعینہ ذاتِ الٰہی اور کائنات کے درمیان بھی یہی تعلق ہے۔ کبھی اس کو کل وجزء کے رشتہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ غرض بہر آئینہ یہ ہے، کہ ترکیب وکثرت کو کوئی اہمیت نہ دی جائے۔ کیونکہ اس کو محض وہم وخیال کی خلاقیوں نے پیدا کیا ہے۔

ابن وہقان کا نظریہ کیا تمام موجودات ہمارے ادراک کی کرشمہ سازی کا نتیجہ ہے؟

ابن وہقان نے اسی مسلک کو ایک دوسرے انداز سے بیان کیا ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ جس طرح الوان کے بارہ میں، حکماء کی یہ رائے ہے کہ ان کا اپنا کوئی وجود ہی نہیں۔ بلکہ ان کا وجود سراسر ضوء اور روشنی کے ساتھ مشروط ہے۔ اگر روشنی موجود ہے، تو ان کی بھی جھلک اور چمک دمک ہے۔ اور روشنی موجود نہیں، تو الوان بھی معدوم ہیں۔ ٹھیک اسی طرح موجودات کا احساس بھی مدرکات بشری کے ساتھ مخصوص ہے۔ اگر ادراک وتعقل کی کارفرمائیاں پائی جاتی ہیں، تو یہ زمین، آسمان، گرمی سردی، صلابت اور نرمی، سب کچھ لباس وجود سے آراستہ ہے۔ اور اگر مدرک انسانی ہی نہیں پایا جاتا، تو یہ سب چیزیں بھی یکسر معدوم ہو جاتی ہیں۔ گویا اصل میں تو حقیقت بسیط اور واحد ہی ہے، تفصیل کی یہ رنگارنگی اور کثرت مدرکات انسانی کی

کرشمہ سازی کا نتیجہ ہے۔

اس رائے کو ہم بدرجہ غایت ساقط سمجھتے ہیں۔ کیونکہ یہ مشاہدات وتجربات کے منافی ہے۔ ہم ایک شہر سے دور ہوتے ہیں، جو ہماری نظروں سے اوجھل ہوجانے کے باوجود بھی صفت وجود سے متصف رہتا ہے۔ آسمان ہم پر یقیناً سایہ فگن ہے۔ نجوم وکواکب ہم سے کہیں دور ہیں اور موجود ہیں۔

محققین صوفیاء کا کہنا ہے، کہ مقام جمع میں اس وحدت کا گمان ہوتا ہے۔ لیکن سالک ومرید جلد اس مقام سے ترقی کرکے، اس مقام تک پہنچ جاتا ہے، جسے مقام فرق وامتیاز کہنا چاہیے۔ یہی ایک عارف ومحقق کا مقام ہے۔

مذاہب وجود میں متاخرین صوفیاء کا غلو اور اس کا تاریخی سبب

ان کے بعد متاخرین صوفیاء، جنہوں نے کہ ایسے کشوف پر بحث کرنا شروع کی۔ اور ان مسائل میں غور وفکر کی طرح ڈالی۔ جن کا تعلق مابعد الطبیعیات سے ہے۔ اس میں انہوں نے خاص غلو سے کام لیا۔ یہاں تک کہ حلول و وحدت تک کے قائل ہوگئے۔ اور اس پر کتابوں پر کتابیں لکھ ڈالیں۔ چنانچہ ہروی نے کتاب المقامات میں اس کی تصریح کی ہے اور ان کی پیروی میں ابن العربی، ابن سبعین اور ان دونوں کے شاگرد ابن العفیف، ابن الفارض، اور نجم اسرائیلی نے یہی کچھ کہا۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ متاخرین صوفیاء کو ان روافض کے ساتھ میل جول کا اکثر موقع ملا، جو حلول اور آئمہ کی الوہیت کے قائل تھے۔ اس لیے یہ حضرات ایک دوسرے کے عقائد سے متاثر ہوئے۔

سلسلۂ اقطاب

صوفیاء کے اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ سلسلۂ اقطاب کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ قطب ان کی اصطلاح میں ایسا شخص ہے، جو تمام عرفاء کی سرتاج ہو اور

معرفت میں کوئی اس کا ہمسر نہ ہو۔ یہ جب مرجاتا ہے، تو اپنی مسند عرفان کو دوسرے قطب کے لیے خالی چھوڑ دیتا ہے، تا آنکہ اس پر بھی موت وارد ہو۔ اور یہ بھی یہ بار کسی دوسرے قطب کے کندھوں پر ڈال دے اور دنیا سے رخصت ہو۔

ابن سینا نے تصوف پر جو ابواب لکھے ہیں، ان میں انہوں نے اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے اور یہ دلیل پیش کی ہے کہ جناب حق، لوگوں کو رشد وہدایت کے تقاضوں سے محروم نہیں رکھتے۔ اس لیے یکے بعد دیگرے اقطاب کا تقرر فرماتے رہتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ دلیل خطابت کے قبیل سے ہے۔ اس میں نہ تو شرعی دلیل کا سا رنگ ہے اور نہ عقلی دلیل کی سی جھلک ہے۔ یہ بعینہ وہی بات ہے، جو شیعہ کہتے ہیں۔

قطب کے بعد ابدال کا ایک سلسلہ ہے اور یہ بھی وہی چیز ہے، جس کو شیعہ نقباء کے لقب سے ملقب کرتے ہیں۔

خرقہ کی حقیقت

خرقہ پہننے کا جو رواج ان میں چل پڑا ہے اور جس کو یہ حضرت علی کی طرف منسوب کرتے ہیں، اس میں بھی شیعیت ہے۔ ورنہ حضرت علیؓ خرقہ وتخلیہ میں یا حال وکوائف میں کسی کے حامل اختصاص نہیں تھے۔

ایک قدم اس سے بھی آگے بڑھ کر کہنا چاہیے کہ آنحضرتؐ کے بعد حضرت ابوبکر اور حضرت عمر، عبادت وزہد میں سب پر فوقیت رکھتے تھے اور اس پر بھی کوئی ایسی چیز ان سے ثابت نہیں، جو دوسروں سے مختلف ہو، بلکہ عام صحابہ ایک طرح سے زہد اور مجاہدہ میں اسوہ اور نمونہ تھے۔

مسائل تصوف کا صحیح تجزیہ

ان اقوال پر اکثر فقہاء اور اہل فتویٰ نے اعتراض کیا ہے اور ان کے مسلک کے تمام متعلقات کا رد کیا ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ان کے بارہ میں گفتگو کرتے وقت، اس چیز کا خیال رکھنا چاہیے کہ یہاں چار چیزیں بالکل الگ الگ ہیں، جو علی الترتیب تفصیل کی مقتضی ہیں۔ مثلاً:

(۱) مجاہدات اور ذوق ووجد، جو اس سے حاصل ہوتا ہے یا روز مرہ کی عملی زندگی میں محاسبہ نفس، جس سے کہ انسان ذوق سے بہرہ مند ہوسکتا ہے۔

(۲) کشوف اور حقیقت مدرکہ جس کا پورے عالم غیب سے لگاؤ ہے۔ یعنی صفات ربانی کی پردہ کشائی، عرش وکرسی کے اسرار، ملائکہ و وحی کی حقیقت، نبوت وروح کا معاملہ، ترکیب اور ترتیب وجود کا علم وغیرہ۔

(۳) تصرفات جو کرامات کے قبیل سے ہیں۔

(۴) شطحیات جن کو ظواہر پر محمول کرنے سے غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں اور اختلاف رائے ابھرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ لوگ انہیں ناپسند کرتے ہیں۔ اور کچھ اس لیے ان کی تحسین کرتے ہیں کہ ان کی نظر میں ان کی ایک عمدہ تاویل ہوسکتی ہے۔

مجاہدات پر کوئی گرفت نہیں، کشوف کے بارہ میں ایک الجھاؤ، کرامات کا انکار مکابرہ ہے، اور شطحیات قابل تاویل ہیں

اب جہاں تک مجاہدات اور محاسبہ نفس کا تعلق ہے اور ان اذواق وکیفیات کا تعلق ہے، جو اس کا لازمی نتیجہ ہیں، تو اس پر کوئی گرفت نہیں۔ ان کا حصول یقیناً بہت بڑی سعادت ہے۔

کشوف وغیرہ میں الجھاؤ یہ ہے کہ حقائق اشیاء کو جس پیرایہ میں دیکھا جاتا ہے، وہ سراسر وجدانی ہے۔ اور الفاظ کا جامہ چونکہ صرف محسوسات ہی کے لیے بنایا گیا ہے۔ اس لیے تعبیر میں ایک طرح کے تشابہ کا پیدا ہوجانا قدرتی ہے۔ لہٰذا اس بارہ میں ان حقائق تک ٹھیک ٹھیک رسائی وہی شخص حاصل کرسکتا ہے، جو اس وجدان سے مالا مال ہو۔ فاقد الوجدان کو یہاں بہرآئینہ معذور ہی سمجھا جائے گا۔

کرامات کا انکار بھی مکابرہ میں داخل ہے۔ کیونکہ اکابر صحابہ اور اکابر سلف سے ان کے صادر ہونے کا ثبوت برابر ملتا ہے۔

رہا شطحیات کا سوال، جس پر کہ اہل شرع کا زیادہ مواخذہ ہے۔ تو اس ضمن میں اس نکتہ کو یاد رکھنا چاہیے کہ یہ وہ لوگ ہیں، جو عالم حس سے کوسوں دور رہتے ہیں اور اس عالم غیب وسکر میں، ایسے ایسے واردات سے دوچار ہوتے ہیں کہ جن کو بیان کرنے کے لیے الفاظ کا جامہ تنگ ثابت ہوتا ہے۔ اس لیے ان کو اس باب میں مجبور اور معذور ہی خیال کرنا چاہیے۔ لیکن اگر کوئی شخص ان میں ایسا ہو کہ اس کے علم وفضل کا چرچا ہو اور یہ معلوم ہو کہ اطاعت پیروی میں اس کا ایک مقام ہے، تو اس کے الفاظ کے لیے عمدہ محمل ڈھونڈنا چاہیے۔

اور اگر اس کے علم وفضل اور اطاعت سے متعلق کچھ بھی معلوم نہ ہو، تو بھی اس کی تاویل کرنا چاہیے۔ بشرطیکہ کوئی چیز موجب تاویل ہو۔ اگر تاویل نہ ہوسکے تو البتہ اس سے مواخذ کرنا چاہیے۔

اسی طرح وہ شخص بھی مواخذہ کا استحقاق رکھتا ہے، جو مغلوب الحال نہیں، بلکہ عالم ہوش میں ہے۔ چنانچہ حلاج کے بارہ میں فقہاء نے جو قتل کا فتویٰ دیا تو اسی بناء پر کہ اس نے جو کلمات کہے، وہ عالم ہوش میں کہے۔

سلف اور اکابر صوفیاء کو کشوف وغیرہ سے کوئی سروکار نہ تھا۔ ان کا

وتیرہ صرف اطاعت اور پیروی کرنا تھا

جہاں تک سلف کا تعلق ہے، ان کو اس سے کچھ شغف نہ تھا۔ ان کا کام محض یہ تھا کہ شریعت کی پیروی میں لگے رہیں اور سوا اتباع واقتداء کے اور کسی چیز سے واسطہ نہ رکھیں۔ ان کا خیال تھا کہ ادراک کی نوعیت ارتقاء وتقرب کی راہوں میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ اس لیے نہ صرف یہ کہ یہ اپنے کشوف، دوسروں پر ظاہر نہیں کرتے تھے، بلکہ ان پر غور وخوض کرنے سے بھی منع کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ کس کس حقیقت کو جانیے۔ اللہ کی مخلوق کا حال یہ ہے کہ حدو شمار سے باہر ہے۔ اس لیے اچھا یہی ہے کہ جس طرح ہم عالم حس میں کشف سے پہلے، اطاعت و پیروی کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہیں، اسی طرح کشوف کے بعد بھی اسی کو اپنا نصب العین ٹھہرائے رکھیں، اسی کی یہ تلقین کرتے تھے اور مرید وسالک کے لیے یہی زیبا بھی ہے۔

تصوف کے چار ادوار

حقیقت افروز نکات

حضرت شاہ ولی اللہ، ہندستان میں اسلام واسلامیت کے ایسے علمبردار ہیں، جن کے سارے مذہبی دبستان فکر کے افراد نام لیوا ہیں۔ ہندستان میں تجدید احیائے دین کے سلسلہ کی ساری کڑیاں ان کی ذات سے جاکر ملتی ہیں۔ ان کی فکر میں سیاست، معیشت، معاشرت اور معاشرتی اصلاح سب کو اہمیت دی گئی ہے۔

ان کی سیاسی فکر سے سیاسی ذوق رکھنے والے بعض دیندار اس غلط فہمی کا شکار ہونے لگتے ہیں کہ شاہ صاحب دین ومذہب کی ساری اصلاح اور ساری تعلیمات کو سیاسی نظام کی تبدیلی وبہتری سے وابستہ سمجھتے ہیں۔ وہ حکومت کی اسلامی بنیادوں پر تشکیل کے کام کو دین کا نصب العینی کام تصور کرتے ہیں۔ یہ خیال شاہ صاحب کی فکر سے نافہمی کا نتیجہ ہے، ایسا ہرگز نہیں، شاہ صاحب کی نظر میں حکومت سے دین وملت کی بہت سارے مصالح ضرور وابستہ ہیں، لیکن سیاست دین کا نصب العین ہرگز نہیں۔ اسی طرح معاشی نظام کو زیادہ اہمیت دینے والے بعض دیندار اس مغالطہ میں مبتلا رہتے ہیں کہ شاہ صاحب کی نظر میں دین کا مقصود معاشی نظام کی مساوات کی بنیاد پر تشکیل ہے نیز سرمائیداری وجاگیرداری کا خاتمہ ہے، شاہ صاحب کے حوالے سے یہ بھی بہت بڑا مغالطہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاہ صاحب کے فکر کی بنیاد اللہ سے تعلق کے استحکام اور محبت خداوندی پر مبنی ہے، چنانچہ ان کی اسی پرسنٹ

کتابیں اور کتابوں کا مواد اسی مرکزی نکتہ کے گرد گھومتا ہے، شاہ صاحب،
اسلام کی روح اور جوہر اسی مرکزی نکتہ کو قرار دیتے ہیں۔ اگرچہ وہ اسلام کے
دوسرے اجزاء کو ان کی فرضیت کی مناسبت سے اہمیت دیتے ہیں، لیکن وہ
دین کا نصب العین عبادت وعبودیت کے فرائض کی بجا آوری کو ہی سمجھتے
ہیں۔ (مرتب)

مجھ فقیر کو اس حقیقت سے بھی آگاہ کیا گیا ہے کہ تصوف کے طریقوں میں
سے اب تک چار بڑے بڑے تغیرات ہو چکے ہیں۔

(۱) تصوف کا پہلا دور

رسول اللہ ﷺ اور ان کے صحابہ کے زمانے میں چند نسلوں تک اہل کمال کی
بیشتر توجہ زیادہ تر شریعت کے ظاہر اعمال کی طرف رہی۔ ان لوگوں کو باطنی زندگی کے
جملہ مراتب شرعی احکام کی پابندی کے ذیل ہی میں حاصل ہو جاتے تھے۔ چنانچہ ان
بزرگوں کا "احسان"، یعنی حاصل تصوف یہ تھا کہ وہ نمازیں پڑھتے تھے، ذکر وتلاوت
کرتے تھے، ان میں سے کوئی شخص ایسا نہ تھا جو سر نیچے کیے بحرِ تفکرات میں غرق نظر
آتا۔ یہ بزرگ خدا تعالیٰ سے قرب وحضوری کی نسبت اعمال شریعت اور ذکر واذکار
کے سوا کسی اور ذریعہ سے حاصل کرنے کی سعی نہ کرتے۔ بے شک ان اہل کمال
بزرگوں میں سے جو محقق ہوتے، ان کو نماز اور ذکر واذکار میں لذت ملتی اور قرآن
مجید کی تلاوت سے وہ متاثر ہوتے۔ مثلاً وہ زکوٰۃ محض اس لیے نہ دیتے کہ زکوٰۃ دینا
خدا کا حکم ہے بلکہ خدا کے حکم کی بجا آوری کے ساتھ ساتھ وہ اپنے آپ کو بخل کے
روگ سے بچاتے اور جب وہ اپنے آپ کو دنیاوی کاموں میں بے حد منہمک پاتے
اور انہیں اس کا احساس ہوتا تو وہ دل کو کاروبار دنیا سے ہٹانے کے لیے زکوٰۃ دیتے
اور اسی طرح شریعت کے دوسرے احکام کو بجالانے میں بھی ان کی یہی کیفیت ہوتی
تھی۔ الغرض یہ بزرگ شخص خدا کا حکم سمجھ کر شرعی احکام ادا نہ کرتے بلکہ اس کے

ساتھ ساتھ ان شرعی احکام کی بجا آوری سے ان کے باطنی تقاضوں کی تسکین بھی
ہوتی تھی۔ ان میں سے کوئی شخص نہ بے ہوش ہوتا اور نہ اسے وجد آتا۔ اور نہ وہ
جوش میں آکر کپڑے پھاڑنے لگتا۔ اور نہ شطح یعنی خلاف شرع کوئی لفظ اس کی زبان
سے نکلتا۔ یہ بزرگ تجلیات استتار اور اس قسم کے دوسرے مسائل پر مطلق گفتگو نہ
کرتے تھے۔ یہ بزرگ بہشت کی رغبت وآرزو رکھتے اور دوزخ سے خائف
وہراساں رہتے۔ کشف وکرامات اور خوارق ان سے بہت کم ظاہر ہوتے۔ اور سرمستی
اور بے خودی کی کیفیت بھی شاذ ونادر ہی ان پر طاری ہوتی۔ اور اگر کبھی کبھی یہ
باتیں ان سے صادر بھی ہوتیں تو قصداً نہیں، بلکہ محض اتفاق سے ایسا ہوتا۔ بات یہ
ہے کہ وہ نفسی کیفیات جن کا نتیجہ کرامات وخوارق اور سرمستی وبے خودی کی قبیل کی
چیزیں ہوتی ہیں۔ یہ کیفیات ان بزرگوں کے اندر اتنی راسخ نہ ہوئی تھیں کہ وہ ملکہ
بن جاتیں۔ چنانچہ اس ضمن میں جب کبھی ان سے کوئی ایسی بات ظاہر ہوئی تو یا تو
اس کی صورت یہ تھی کہ وہ جس چیز کو از روئے ایمان صمیم قلب سے مانتے تھے وہ چیز
بے اختیار ان کی زبان پر آجاتی، جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ نے مرض الموت میں اپنے
تیمارداروں سے فرمایا تھا کہ "طبیب ہی نے مجھے بیمار کیا ہے۔" یا یہ ہوتا کہ یہ بزرگ
خواب میں بعض چیزوں کو دیکھ لیتے یا فراست سے نامعلوم چیز کو معلوم کر لیتے۔ لیکن
یہ چیزیں ایسی نہ ہوتیں کہ عوام کی ان تک رسائی نہ ہو سکتی۔ قصہ مختصر اس دور میں
جسے تصوف یا "احسان" کا پہلا دور کہنا چاہیے۔ اہل کمال کا غالب طور پر یہی حال
رہا۔

(۲) تصوف کا دوسرا دور

حضرت جنید جو گروہ صوفیاء کے سرخیل ہیں، ان کے زمانے میں یا ان سے
کچھ پہلے تصوف کے ایک اور رنگ کا ظہور ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں یہ ہوا کہ اہل
کمال میں سے ایک عام طبقہ تو اسی طریقہ پر کاربند رہا جس کا ذکر پہلے دور کے ن

میں ہو چکا ہے۔ لیکن ان میں سے جو خواص تھے انہوں نے بڑی بڑی ریاضتیں کیں اور دنیا سے بالکل قطع تعلق کر لیا اور مستقل طور پر وہ ذکر وفکر میں لگ گئے۔ اس سے ان کے اندر ایک خاص کیفیت پیدا ہوگئی۔ اس کیفیت سے مقصود یہ تھا کہ دل کو تعلق باللہ کی نسبت حاصل ہوجائے چنانچہ یہ لوگ اس نسبت کے حصول میں لگ گئے۔ وہ مدتوں مراقبے کرتے اور ان سے تجلی استغناء الٰہی اور وحشت کے احوال وکوائف ظاہر ہوتے اور وہ اپنے ان احوال کو نکات اور ارشادات میں بیان بھی کرتے۔ ان اہل کمال میں سے سب سے صادق وہ بزرگ تھے جنہوں نے اپنی زبان سے وہی کہا، جو خود ان پر گذرا تھا۔ یہ لوگ سماع سنتے، سرمستی وبے خودی میں بے ہوش ہوجاتے، کپڑے پھاڑتے اور رقص کرتے۔ یہ کشف واشراف کے ذریعہ دوسروں کے دلوں کی باتیں بھی معلوم کر لیتے تھے۔ انہوں نے دنیا سے اپنا رشتہ توڑ کر پہاڑوں اور صحراؤں میں پناہ لی اور گھاس اور پتوں پر زندگی گذارنے اور گدڑیاں پہننے لگے۔ نفس وشیطان کے مکروں اور دنیا کے فریبوں کو یہ خوب سمجھتے تھے اور ان سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے یہ لوگ مجاہدے بھی کرتے تھے۔ الغرض اس دور کے اہل کمال کا تصوف یہ تھا کہ وہ خدا کی عبادت دوزخ کے عذاب سے ڈر کر یا جنت کی نعمتوں کے طمع میں نہ کرتے تھے بلکہ ان کی عبادت کا محرک خدا کے ساتھ ان کی محبت کا جذبہ ہوتا۔

لیکن تصوف کے اس دور میں ''توجہ'' کی نسبت اپنے درجہ کمال تک نہیں پہنچی تھی۔ ''توجہ'' سے یہاں مراد نفس کا پوری طرح حقیقت الحقائق یعنی ذات خداوندی کی طرف متوجہ ہونا ہے۔ اور وہ اس طرح کہ نفس اللہ کے رنگ میں کلیتہً رنگا جائے اور وہ دنیا کی عارضی اور فانی چیزوں پر پوری طرح غالب آجائے۔ تصوف کے اس دور میں ''توجہ'' کی نسبت دوسری چیزوں سے ملی جلی ہوئی تھی۔ چنانچہ اس زمانہ میں ان اہل کمال میں سے کوئی شخص ایسا نہ تھا جس نے کہ خاص ''توجہ'' کو ان معنوں

میں اپنا نصب العین بنایا ہو کہ وہ ہمیشہ اسی کی بات کرتا اور اسی طرح اس کا ہر اشارہ ہوتا۔ یا اس زمانے میں یہ صورت ہوتی کہ ان میں سے کسی شخص نے ''توجہ'' کی نسبت حاصل کرنے کی راہ بتائی ہوتی۔

اصل بات یہ ہے کہ ان بزرگوں پر طاعت کا رنگ غالب تھا اور طاعت کے انوار سے وہ سرشار تھے۔ بے شک انہیں ''توجہ'' کی نسبت حاصل ہوتی۔ لیکن گاہے گاہے جیسے کہ بجلی کی چمک کہ ابھی ہے اور ابھی نہیں۔

شب خیال طرہ شوخ بدل پیچیدہ رفت
ساعتے ہم چوں شب قدر از برم جوشیدہ رفت

(۳) تصوف کا تیسرا دور

سلطان الطریقہ شیخ ابوسعید بن ابی الخیر اور شیخ ابوالحسن خرقانی کے زمانے میں طریق تصوف میں ایک اور تغیر رونما ہوتا ہے۔ اس دور میں اہل کمال میں عوام تو حسب سابق شرعی اوامر واعمال پر ٹھہرے رہے اور خواص نے باطنی احوال وکیفیات کو اپنا نصب العین بنایا اور جو خواص تھے، انہوں نے اعمال واحوال سے گذر کر ''جذب'' تک رسائی حاصل کی اور اس ''جذب'' ہی کی وجہ سے ان کے سامنے ''توجہ'' کی نسبت کا راستہ کھل گیا اور اسی سے تعینات کے سب پردے ان کے لیے چاک ہوگئے۔ اور انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ وہی ایک ذات جس پر تمام اشیاء کے وجود کا انحصار ہے اور وہی ذات سب اشیاء کی قیوم ہے۔ یہ لوگ اس ذات میں گم ہوگئے اور اس کے رنگ میں ان کے نفوس رنگے گئے۔ چنانچہ اس حال میں نہ ان کو اوراد ووظائف کی چنداں ضرورت رہی اور نہ انہیں مجاہدے اور ریاضتیں کرنے اور نفس اور دنیا کے فریبوں کو جاننے کی سدھ بدھ رہی۔ ان کی تمام تر کوشش کا مقصد یہ ٹھہرا کہ جس طرح بھی ہو ''توجہ'' کی نسبت کی تکمیل کریں۔

''توجہ'' کے علاوہ باقی جو نسبتیں ہیں یہ لوگ انہیں نورانی حجاب سمجھتے تھے۔ اس

عہد میں توحید وجودی اور توحید شہودی میں فرق نہیں کیا جاتا تھا۔ درحقیقت ان بزرگوں کی اصل غایت یہ تھی کہ ذاتِ الٰہی میں اپنے وجود کو گم کر کے اس مقام کی کیفیات سے لذات اندوز ہوں۔ چنانچہ وہ اس بحث میں نہیں پڑتے تھے کہ کائنات کا وجود الٰہی سے کیا علاقہ ہے؟ اور انسان خدا کی ذات میں کیسے گم ہوتا ہے؟ اور فنا و بقا کے کیا حقائق ہیں؟

(۴) تصوف کا چوتھا دور

آخر میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی اور ان سے پیچھے کا زمانہ آتا ہے۔ اس عہد میں ان اہل کمال بزرگوں کے ذہنوں میں مزید وسعت پیدا ہوتی ہے اور یہ لوگ کیفیات و احوال کی منزل سے آگے بڑھ کر حقائق تصوف کی بحث و تحقیق کرنے لگتے ہیں۔ ذات واجب الوجود سے یہ کائنات کس طرح صادر ہوئی۔ ان بزرگوں نے ظہور وجود کے مدارج اور تنزلات دریافت کیے اور اس امر کی تحقیق کی کہ واجب الوجود سے سب سے پہلے کس چیز کا صدور ہوا اور کس طرح یہ صدور عمل میں آیا۔ الغرض یہ اور اس طرح کے دوسرے مسائل ان لوگوں کے لیے موضوع بحث بن گئے۔

تصوف کے ان چاروں دوروں میں جو بھی اہل کمال بزرگ گذرے ہیں، گو وہ اپنے ظاہری اعمال و احوال میں الگ الگ نظر آتے ہیں۔ لیکن جہاں تک ان کی اصل کا تعلق ہے میرے نزدیک وہ سب ایک ہیں۔ باقی اللہ تعالیٰ ان کے حال کو ہم سب سے بہتر جانتا ہے۔ ان بزرگوں میں سے جب کسی نے اس دنیا سے انتقال فرمایا تو جو باطنی کیفیت اس بزرگ نے اپنی ہمت اور ریاضت سے دل میں پیدا کر لی تھی وہ کیفیت موت کے بعد بھی اس بزرگ کے نفس میں جاگزیں رہی۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ کوئی آئینہ یا پانی کا حوض ہو اور اس میں آفتاب کا عکس پڑ رہا ہو۔ ان بزرگوں کے طفیل مبدا اول یعنی خدا تعالیٰ تک پہنچنے کا راستہ قریب ہو گیا۔

اور ان کے فیوض اور برکات کے انوار سے عالم علوی اور عالمِ سفلی کی فضا منور ہو گئی جیسے کہ ہماری اس آسمانی فضا میں جب مرطوب ہوا اور بادل پھیل جاتے ہیں، تو اس کا اثر زمین پر بھی پڑتا ہے۔ اسی طرح ان نفوس قدسی کی کیفیات بھی دنیائے قلوب پر اپنا اثر ڈالتی رہتی ہیں۔

الغرض تصوف کے یہ چاروں طریقے خدا تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہیں۔ اور ملاءِ اعلیٰ میں بھی ان سب کی منزلت مسلم ہے۔ ارباب تصوف پر بحث کرتے وقت ہمیشہ اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ ان بزرگوں کے ہر طبقے کے اقوال اور احوال کو ان کے زمانے کے ذوق کے مطابق جانچا جائے۔ اس سلسلہ میں یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ ہم ایک عہد کے ارباب تصوف کے اقوال اور احوال کو دوسرے عہد کے معیاروں سے ناپتے پھریں۔

اتباع شیخ، کن معاملات میں

حدود وآداب کا تعین

مولانا عبدالماجد دریابادی نے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے دریافت کیا تھا کہ شیخ سے وابستگی کے بعد مرید کے لئے روحانیت اور باطنی امور کی اصلاح کے علاوہ کن کن معاملات میں شیخ کا اتباع ضروری ہے حضرت مولانا نے اس جواب میں یہ خط لکھا ہے جو اس موضوع پر منفرد نوعیت کا جواب ہے۔ (ادارہ)

اتباع شیخ سے متعلق، غالباً میرے کل معروضات ذہن میں جمع اس لیے نہیں رہے، کہ شاید ایک جلسہ میں مجمعتا بیان نہیں کیے گئے۔ اب اس کا خلاصہ عرض کرتا ہوں، شیخ کا اتباع نہ عقائد میں ہے، نہ کشفیات میں، نہ جملہ مسائل میں، نہ معاشی امور میں، صرف تربیت وتشخیص امراض وتجویز تدابیر، اور ان مسائل میں ہے، جنکا تعلق اصلاح وتربیت باطنی سے ہے۔ وہ بھی اس وقت تک، جب تک کہ انکا جواز مرید وشیخ کے درمیان متفق علیہ ہو۔ اور اگر شیخ اور مرید کے درمیاں اختلاف ہو تو شیخ سے مناظرہ کرنا، تو خلاف طریق ہے، اور امتثال امر خلافِ شریعت ہے، ایسی صورت میں ادب کا تقاضہ یہ ہے، کہ علماء سے استفتاء کرکے، یا اپنی تحقیق سے، حکم متعین کرکے، شیخ کو اطلاع کرے کہ "میں فلاں عمل کو جائز نہیں سمجھتا اور ہمارے سلسلہ میں اسکی تعلیم ہے، مجھے کیا کرنا چاہیے" اس پر اگر شیخ پھر بھی وہی حکم دے، تو اس شیخ کو چھوڑ دینا چاہیے۔ اور اگر وہ ترک کی اجازت دے، تو یہ بھی اس کی متابعت ہے۔ اتباع کامل کا مفہوم یہی، یعنی جو مرض نفسانی اس نے تجویز کیا ہو، یا جو تدبیر اس نے تجویز کی ہو، یا جو عمل مشروع، جسکا مشروع ہونا شیخ ومرید کے درمیاں متفق علیہ ہو،

تجویز کیا ہو، ان چیزوں میں اتباع کامل کرے اور ان میں اپنی رائے کو ذرا بھی دخل نہ دے اور باقی صورتیں اتباع سے مراد نہیں۔ امید ہے کہ اس سلسلہ میں سارے شبہات کا جواب ہوگیا ہوگا۔ اگر کوئی شبہ باقی ہو، تو تعیین وتصریح کے ساتھ تحریر فرمائیں۔

بحث کا خلاصہ، اس باب میں یہ ہے کہ اتباع کا موقعہ ومحل معلوم نہ ہونے کی وجہ سے، یہ سارے شبہات پیدا ہوئے ہیں۔ میں اسکا محل وقیود وحیثیت متعین کیے دیتا ہوں۔ سو محل تو اس کا صرف شیخ کی وہ قولی تعلیمات ہیں، جن کا تعلق تربیت واصلاح باطن سے ہے۔ اور قید اس کی یہ ہے کہ وہ فعل جسکی تعلیم کی جارہی ہے، شرعاً جائز ہو، اور جسے طالب بھی جائز سمجھتا ہوں، اور حیثیت اسکی شیخ و مصلح ہونا ہے، یعنی مصلح ہونے کی حیثیت سے، صرف تعلیمات سلوک میں اسکے اقوال پر عمل کرنا شرط نفع ہے۔

اب ان قیود کے فوائد بتاتا ہوں۔ "قولی تعلیمات" کی قید سے خود شیخ کے افعال بھی نکل گئے۔ خواہ وہ افعال طالب کے اعتقاد میں جائز ہوں، جیسے شیخ پانچ سو رکعات نفل روزانہ پڑھتا ہو، یا صوم داؤدی ہمیشہ رکھتا ہو۔ اس میں اتباع ضروری نہیں۔ اور خواہ وہ افعال طالب کے اعتقاد میں جائز نہ ہوں، خواہ مختلف فیہ ہونے کے سبب، جیسے شیخ فاتحہ خلف الامام پڑھتا ہو، اور طالب اس کو مکروہ جانتا ہو۔ خواہ شیخ غلطی سے اس فعل ناجائز میں مبتلا ہو، جیسے غیبت کرتا ہے۔ اس میں اتباع جائز بھی نہیں۔

اور اس قید سے شیخ کے کشفیات نکل گئے، بالخصوص جبکہ طالب کا کشف اسکے خلاف ہو۔ اس طرح سے سارے اصولی وفرعی مسائل، جنکا تعلق تربیت سے نہیں، خارج ہوگئے، البتہ ان میں جو امور شرعاً بھی ضروری ہیں، وہ لازم العمل ہیں، گو شیخ نہ بھی کہے۔ اور اگر شیخ حکم دے، تو یہ حکم امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی حیثیت سے ہوگا، مصلح ہونے کی حیثیت سے نہ ہوگا، اور ان کے خلاف کرنا، شریعت کی مخالفت

ہوگی، نہ کہ شیخ کی مخالفت۔ البتہ مخالفت شریعت کی بناء پر شیخ ایسے طالب سے قطع تعلق کرسکتا ہے اور یہ قطع تعلق شیخ کے ساتھ خاص نہیں۔ ہر مسلمان کو اسکا حق حاصل ہے، اسکا تعلق مسئلۂ متابعت شیخ سے کچھ نہیں۔

اسی طرح اس قید سے معاشی مسائل بھی نکل گئے۔ مثلاً شیخ کسی طالب سے کہے، کہ تم اپنی لڑکی کا رشتہ میرے لڑکے سے یا کسی اور سے کردو۔ یہ بھی مناسبت کا محل نہیں۔

اور قید جواز کا فائدہ یہ ہے کہ جس چیز کی تعلیم کرتا ہے، وہ اگر شرعاً ناجائز ہو، اس میں اتباع جائز بھی نہیں، خواہ وہ اجماعاً ناجائز ہو، جیسے کوئی معصیت۔ خواہ ناجائز اختلافات ہو، جیسے مسائل مختلف فیہا کی کوئی خاص شق، جو طالب کے اعتقاد میں جائز نہیں۔

اب اسکے متعلق سارے سوال حل ہو گئے۔ سو یہ تو طے ہوگیا کہ بعض امور میں محل متابعت نہیں، بعض میں تو متابعت واجب نہیں، جیسے معاشی امور۔ اور بعض میں جائز بھی نہیں، خواہ انکا عدم جواز متفق علیہ ہو، جیسے معاصی، خواہ مختلف فیہ ہو، جیسے مسائل اختلافیہ، جو طالب کے اعتقاد میں جائز نہیں۔ اب یہ بات باقی رہی کہ جو امور محل متابعت نہیں۔ ان میں اگر شیخ حکم دے، تو اگر وہ شرعاً جائز اور طالب کی قدرت میں ہیں، تو مروت کا تقاضا یہ ہے کہ ان میں متابعت کی جائے، جیسے شیخ اپنا کوئی ذاتی کام یا کوئی خاص خدمت کرنے کی فرمائش کرے۔ اور اگر وہ شرعاً ناجائز ہے، خواہ واقع میں بھی، خواہ اس کے اعتقاد میں یہی ادب سے عذر کردے۔ اور اگر وہ اصرار کرے تو اس سے تعلق قطع کردے، مگر گستاخی وایذاء کا معاملہ کبھی نہ کرے۔

یہ تو اس وقت ہے، جب وہ خلاف شرع کا حکم دے۔ اور اگر طالب کو ایسا حکم نہ دے، مگر خود کسی لغزش میں مبتلا ہو، تو اگر اس میں تاویل کی گنجائش ہے، تو تاویل کرلے اور اس سے قطع تعلق نہ کرے اور اگر تاویل کی گنجائش نہیں، تو اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر کبھی کبھار اسکا صدور ہوجاتا ہو، تو بشریت واحتمال توبہ پر محمول

کرکے تعلق قطع نہ کرے، اور اگر اصرار ہے، تو اگر وہ گناہ ہے تو قطع تعلق نہ کیا جائے، اور جو کبیرہ اور فسق وفجور یا ظلم وخیانت کے درجہ میں ہے، تو تعلق قطع کردے۔ مگر ان سب حالات میں اسکے لیے دعائے صلاحیت کرتا رہے، کہ حقوق احسان میں سے ہے۔ ارادہ تھا، خلاصہ کو مختصر لکھنے کا، مگر وہ اصل سے بھی زیادہ مبسوط ہوگیا۔ واللہ اعلم۔ (ماخوذ ہفت روز ''سچ''، لکھنو ۲۹ دسمبر ۱۹۳۳ء)

صوفیانہ تجربات کا تجزیہ

علامہ اقبال کے خطبات پر مشتمل کتاب ''تشکیل الٰہیات جدید'' الٰہیات کے مسائل پر عالمی سطح کے فلاسفروں کے غوروفکر کے لئے لکھی گئی ہے، اس لئے کتاب کی زبان ادق ہے۔ کتاب کی اس مشکل کی وجہ سے متعدد دانشوروں نے ان خطبات کو ہضم کرکے، ان کی تلخیص اپنی زبان میں پیش کی ہے۔ اس سلسلہ کی سب سے بہتر کاوش پروفیسر محمد عثمان صاحب کی ہے۔

ذیل میں تصوف کے موضوع پر علامہ کے جو افکار پیش کئے گئے ہیں۔ وہ اسی کتاب سے ماخوذ ہیں۔ تصوف کے موضوع پر علامہ اقبال کے خیالات سے آشنائی کے لئے ملاحظہ ہو، ہماری کتاب ''علامہ اقبال کا فلسفۂ عشق اور اس کے اسرار ورموز'' (مرتب)

۱۔ پہلی قابل ذکر بات اس تجربے کی سرعت ہے، جو حقیقت اس کے ذریعے سے آپ پر منکشف ہونا ہوتی ہے، فی الفور صادر ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کیفیت شاعر، فلسفی اور صاحب تخیل سائنسدان کی کیفیت سے ملتی جلتی ہے۔ عقل وتخیل کے ذریعے سے، بعض حقائق بعض لوگوں پر یکدم منکشف ہوجاتے ہیں، جیسے کسی موجد کے ذہن میں یکدم کوئی خیال بجلی کی طرح کوند جاتا ہے یا کسی شاعر کا تخیل، ایک لمحے میں کسی نادر خیال سے آشنا ہوجاتا ہے۔ صوفی کے تجربے کی تیزی اور سرعت اس میں ہے، کہ خدا تعالیٰ کے وجود اور قرب کا احساس اسے آناً فاناً گھیر لیتا ہے۔ خدا کی ذات، کوئی ریاضی کا سوال یا باہم مربوط تصورات کا سلسلہ نہیں، کہ پچھلی کڑیوں کو جانے بغیر اگلی کڑیوں کا جاننا غیر ممکن ہو۔ خدا کی ذات ایک ایسی حقیقت ہے، جو

ایک نادر خیال یا عظیم سچائی کی طرح صاحبِ حال پر یک لخت منکشف ہوتی ہے۔

۲۔ دوسرا نکتہ یہ ہے، کہ صوفیانہ تجربے کی وحدت ناقابل تجزیہ ہے۔ جب میں ایک میز دیکھتا ہوں، تو میرے تجربے کے بے شمار پہلو میرے میز دیکھنے کے واحد تجربے میں ناقابل تقسیم طور سے سموئے جاتے ہیں۔ میں اپنے تجربے کے بے انتہا پہلوؤں میں سے، چند کو منتخب کرکے اور ان کو زمان ومکان کی ایک خاص رعایت سے ترتیب دے کر، میز کا مشاہدہ کرتا ہوں، لیکن اس عمل کا تجزیہ میرے لیے ممکن نہیں۔ صوفی کے لیے اس کی واردات بھی اصلا ایسی ہی ناقابل تجزیہ ہوتی ہے، تاہم یہ صورت ذہن کی متعدد دوسری صورتوں سے مختلف نہیں اور تجربے کا ناقابل بیان ہونا، اس کے غیر یقینی ہونے پر دلالت نہیں کرسکتا۔ عام حالات میں مشاہدۂ حسن اور بعض دوسری لطیف کیفیاتِ قلب کا بیان بھی تو از حد محال ہے۔

۳۔ تیسرا نکتہ یہ ہے کہ صوفی کے لیے صوفیانہ کیفیت، ایک دوسری بے مثل ہستی سے قرب ووصال کی ایک ایسی گھڑی ہے، جہاں اس کی اپنی شخصیت عارضی طور پر محذوف ہوجاتی ہے، لیکن یہ انہماک یا استغراق اس تجربے کی سچائی کو کم کرنے کی دلیل ہرگز نہیں بن سکتا، اس لیے کہ سائنس اور علم کے دوسرے شعبوں میں بھی، ایسے انہماک اور کھوجانے کی مثالیں مہیا کی جاسکتی ہیں۔ یہ انہماک اور اپنے گم ہوجانے کا یہ احساس، دراصل خدا تعالیٰ کے وجود کی ایک زندہ اور قوی دلیل ہے۔ کیا کوئی غیر حقیقی شے کسی حقیقی شے پر یوں غالب آسکتی ہے؟

۴۔ چونکہ صوفیانہ تجربے کا جوہر، براہِ راست تجربے ہی سے سمجھ میں آسکتا ہے، لہٰذا اس کا ابلاغ دوسروں تک اس کیفیت کا پہنچانا ممکن نہیں ہوتا۔ صوفیانہ تجربہ، خیال کی نسبت احساس سے زیادہ ملتا جلتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفی یا پیغمبر کے روحانی تجربے کو احکام یا اصولوں کے رنگ میں تو پیش کیا جاسکتا ہے، لیکن خود تجربے کے تمام کیف وکم کو بیان کرنا، غیر ممکن ہوتا ہے، تاہم اس تجربے کا احساس یا جذبے

سے زیادہ تعلق ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ اس میں علم بخشی کا کوئی عنصر نہیں ہوتا۔ احساس بنیادی طور سے علم ہی کی ایک لطیف صورت ہے اور صوفیانہ .... میں علم بخشی کا یہ پہلو بدرجۂ غایت موجود ہوتا ہے، جس طرح خیال بغیر لفظ کے جنم نہیں لیتا، اسی طرح اعلیٰ روحانی تجربے میں، احساس اور فکر ناگزیر طور سے باہم منسلک ہوتے ہیں، اور صوفیانہ کیفیت ایک ناقابل بیان طور سے خیال کی صورت میں ڈھل جاتی ہے۔

۵۔ ہستیٔ باری تعالیٰ کے قرب ووصال کے شعور میں، صوفی سلسلۂ روز وشب کو بے حقیقت سمجھنے لگتا ہے، لیکن زمان ومکان سے اس کا تعلق منقطع نہیں ہوتا۔ اپنی کیفیتِ قلب کی تمام ندرت اور عظمت کے باوجود اس کا یہ تجربہ ایک عام انسانی اور زمینی تجربہ ہی ہوتا ہے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ صوفی اور پیغمبر، دونوں اپنے قلب و روح کی اس کیفیت سے باہر آتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ پیغمبر کا اس روحانی واردات سے واپس آنا، انسانوں کی دنیا کے لیے بے پایاں امکانات کا حامل ہوتا ہے۔ (فکر اسلامی کی تشکیل نو۔ علامہ اقبال کے خطبات کا مطالعہ، پروفیسر محمد عثمان صفحہ ۴۱ تا ۴۳)۔

مسلمانوں کو مسلمان بنانے میں تصوف کا کردار

علامہ اقبال سے رسالہ طریقت کا انٹرویو

فوق: صوفیوں سے اسلام کو کیا فائدہ پہنچا؟

اقبال: اہل تصوف، خصوصا ہندوستان کے صوفیائے عظام نے، اسلام کو وہ رونق بخشی اور بجائے تیر وتلوار کے محض حسن عمل اور اخلاق محمدیؐ کے ذریعے اس کی وہ اشاعت کی کہ ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں میں چھ کروڑ یقیناً ان ہی بزرگوں کے فیوض وبرکات کا نتیجہ ہیں۔

فوق: صوفیوں سے مسلمانوں کو کیا فائدہ پہنچا؟

اقبال: مسلمانوں کی اخلاقی زندگی پر، صوفیائے کرام نے بہت بڑا اثر ڈالا۔ تمام ایسے اوصاف جو اخلاقی پہلو سے انسانیت کا خاصہ ہیں، محض ان ہی بزرگوں کی تعلیم وتربیت کا نتیجہ ہیں۔ انہوں نے انسانوں کو انسان اور پھر مسلمانوں کو مسلمان بنایا۔

فوق: پولیٹکس کو ان سے کیا فائدہ ہوا؟

اقبال: صوفیوں کا گروہ پولیٹیکل معاملات سے ہمیشہ علیحدہ رہا ہے۔ تصوف کا مقصد تزکیۂ نفس، اصلاح باطن اور نفس کشی ہے۔ اس لیے اس نے ملکی الجھنوں میں بہت کم بلکہ بالکل دخل نہیں دیا۔ البتہ بعض بعض سلاطین کو جو اپنے شاندار فرائض سے غافل ہوکر، ملک میں فتنہ وفساد کا باعث ہوتے رہے ہیں، تادیبی ہدایات فرماتے رہے ہیں، جیسا کہ تاریخوں کے مطالعہ اور صوفیائے اسلام کے حالات سے اکثر ظاہر ہوتا ہے۔

فوق: اسلامی تصوف دنیاداری کے متعلق کیا تعلیم دیتا ہے؟

اقبال: اسلامی تصوف کی یہی تعلیم ہے، کہ وہ دین کے ساتھ دنیا بھی رکھے۔
اسلام رہبانیت کے خلاف ہے اور گھر بار، اہل وعیال کو ترک کر کے، جنگلوں
اور بیابانوں میں زندگی بسر کرنے کو ناپسند کرتا ہے۔ اسلامی تصوف ایسے یوگ کو، جو
صرف اپنی ذات کے لیے ہو، ایک بے فیض اور خشک چشمہ سے تشبیہ دیتا ہے، بیشک
یکسوئی حاصل کرنے کے لیے خلوت وعزلت نشینی کی ضرورت ہے، لیکن تمام لوگ
اس کے اہل نہیں ہوتے۔ دراصل ترک دنیا ایک برا نمونہ ہے اہل دنیا کے لیے، بلکہ
یہ صریح خلاف ورزی ہے، الٰہی قانون کی جو انسانی نسل کے بڑھتے رہنے اور اس
کے پھلنے پھولنے کا متمنی ہے۔

فوق: عرس کی رسم کب سے جاری ہے؟

اقبال: عرب اور دیگر ممالک اسلامیہ کی تو خبر نہیں، لیکن ہندوستان کے عرسوں
کے متعلق یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ہندوؤں میں چونکہ یاترا کی رسم عرصہ دراز سے
چلی آ رہی ہے، اور وہ دور دراز ممالک سے بعض خاص تیرتھوں کی یاترا کے لیے جایا
کرتے تھے، اس لیے جب وہ رفتہ رفتہ مشرف بہ اسلام ہونے لگے، تو ان کو اسلام
سے مانوس کرنے کے لیے ایسے طریقے اختیار کیے گئے، جو ان کے مذہبی اور قومی
شعائر سے کسی قدر مشابہ تھے۔ یہ میرا قیاس ہے، یقین نہیں ہے۔

فوق: عرس کا مقصد کیا ہے؟

اقبال: عرس کا مقصد تو دراصل یہ ہے کہ جس بزرگ کا عرس ہو، اس کے سبق
آموز حالات بیان کیے جائیں۔ لوگوں کو اس کے اچھے عمل کی تقلید و پیروی کی ترغیب
دی جائے۔ لیکن افسوس ہے کہ موجودہ عرسوں کا بیشتر حصہ اپنے اصلی مقصد سے دور
ہٹ چکا ہے۔

فوق: صوفی لوگ موجودہ زمانے کی جدوجہد میں، ہمارے لیے کس طرح مفید
ہو سکتے ہیں؟

اقبال: اہل تصوف خصوصاً ان بزرگوں کا، جو صاحب اثر ہیں اور اپنے
عقیدتمندوں کا بہت بڑا حلقہ رکھتے ہیں۔ یہ نہایت ضروری فرض ہے کہ وہ اپنے
معتقدوں اور ارادت مندوں کو، اپنے اثر میں رکھیں اور ان کی زندگی کو مذہبی اور
اخلاقی پہلو سے ایک کامیاب زندگی بنا دیں۔ سوشل ترقی کے لیے جدوجہد کرنا بھی
ایک قسم کی بیداری ہے اور یہ بیداری جب کبھی ہوگی، حضرات صوفیہ کے پاک نفوس
سے ہوگی۔

فوق: اولیاء کی کرامتوں کے متعلق کیا خیال ہے؟

اقبال: میں کرامتوں کا قائل ہوں اور میرا خیال ہے کہ وہ پاک نفوس، جن کو
اللہ تعالیٰ نے خاص دل ودماغ عطا کیا ہے اور جو تزکیۂ نفس میں صاحب کمال ہیں،
تیراز کمان رفتہ اور آب از جو رفتہ واپس لا سکتے ہیں۔

اولیاء راہست قدرت از الٰہ
تیر جستہ باز گردانند ز راہ!

فوق: قبروں پر جانا چاہیے یا نہیں؟

اقبال: اگر مراد اس سے قبر پرستی ہے، یعنی صاحبان قبور سے حاجات طلب کی
جائیں تو میں اس کے سخت خلاف ہوں، بلکہ اس کو سخت گناہ سمجھتا ہوں۔ اور اگر
قبروں پر جانے سے مطلب فاتحہ پڑھنا، عبرت حاصل کرنا اور موت کو یاد کرنا ہے، تو
میرے نزدیک اس میں کوئی ہرج نہیں، بلکہ ایسا ضرور ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ اس
بات کا بھی قائل ہوں کہ قبرستانوں خصوصاً کسی صاحب دل کے مزار پر جانے سے
صفائی باطن ہو سکتی ہے۔

فوق: پیر کی ضرورت ہے یا نہیں؟

اقبال: پیر یا مرشد کی سخت ضرورت ہے، اس کے بغیر انسان کوئی صحیح اور کامل
راستہ نہیں دیکھ سکتا۔ روحانی فائدہ تو ان بزرگوں سے صرف انہیں لوگوں کو ہوگا، جو

اہل دل ہیں۔ جن کے دل میں درد ہے، جن کے قلب میں گرمی اور جس کی روح میں تڑپ ہے۔ لیکن کم سے کم اخلاقی فائدہ تو ہر مرید حاصل کر سکتا ہے۔ پیر کی صحبت سے (بشرطیکہ پیر دکانداری نہ کرتا ہو) ہر مرید اپنا اخلاق سنوار سکتا ہے، اور جس کا اخلاق درست ہے، جس کے افعال ٹھیک ہیں اور جس کے ''اعمال حسنہ'' کہے جاتے، اس سے بڑھ کر اور کون بہترین انسان ہو سکتا ہے۔

فوق: ازمنہ سلف کے سے، اب پیر کیوں نہیں ہوتے؟

اقبال: اس کی وجہ یہ ہے کہ سوسائٹی اوصاف سے مبرا ہے، جن سے ایسے نیک وجود پیدا ہو سکتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں بڑے بڑے عالم اور فلاسفر اور موجد پیدا ہوتے ہیں، اور بلکہ دنیا کی کاروباری زندگی میں مشینوں، انجنوں اور نت نئی ایجادوں کے ذریعے، جس قدر انقلاب ان لوگوں نے پیدا کیا ہے، اس نے تمام دنیا اور بالخصوص اہل ہند کو عالم حیرت میں ڈال دیا ہے، مگر اس پر کبھی غور کیا گیا ہے کہ یورپ اور امریکہ کے عالموں، فلاسفروں اور موجدوں کی طرح اور ممالک میں ایسے لوگ کیوں پیدا نہیں ہوتے۔ اس کے جواب میں سوائے سوسائٹی کے تاثرات کے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا، جہاں علم وہنر کا چرچا نہیں، جہاں دماغوں سے سوچنے اور غور کرنے کا کام نہیں لیا جاتا، وہاں ایک فلاسفر، ایک عالم اور ایک موجد کس طرح پیدا ہو سکتا ہے۔

لیکن بعض مستثنیات بھی ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ دکھانے کے لیے، بعض دفعہ ایسے امور کا اظہار بھی کر دیتا ہے، کہ سوسائٹی کا اثر بالائے طاق رہ جاتا ہے اور انسان کو اپنی عاجزی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے، مثلاً گوتم بدھ کا ایک بادشاہ کے گھر پیدا ہونا اور پھر فقیری اختیار کر لینا۔ سوسائٹی کے اثر پر اگر غور کیا جائے تو گوتم بدھ کے گرد وپیش جس قسم کی سوسائٹی تھی، وہ دکھ، بیماری، فقر وفاقہ اور دردِ دل سے بالکل لاعلم اور عیش وعشرت اور تفریح ومسرت میں مست ومحو رہا کرتی تھی۔ ایک

بادشاہ کا بیٹا دکھ محسوس کرتا ہے۔ ایک عالم کی تکلیفوں کو اپنی ذاتی تکلیف سمجھتا ہے اور اسی قلق سے مضطرب ہو کر، سلطنت ترک کر دیتا ہے۔

عرب جیسے جاہل اور اجڈ ملک میں، جہاں دنگا فساد، خون خرابہ، لڑکیوں کا قتل اور دنیا جہاں کے دیگر عیوب ایک معمولی بلکہ تفریح کی بات سمجھے جاتے تھے۔ وہاں ایک شخص درگاہِ رب العزت سے اس قسم کا غیر معمولی دل ودماغ لے کر آتا ہے، جو ایک عالم میں نہ مٹنے والا انقلاب، اور دلوں سے نہ محو ہونے والی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ میری مراد آنحضرت ﷺ سے ہے، جو دنیا کے سب سے بڑے آدمی اور اللہ تعالیٰ کی رحمت خاص کا ایک روشن نمونہ ہیں، ان کے گرد وپیش اور نواحیات میں، جس قسم کے حالات تھے، ان کا خاکہ مولانا حالی نے اپنی ایک نظم میں اتارا ہے۔

مختصر یہ کہ اہل عرب بات بات پر لڑتے تھے اور لڑائی کا سلسلہ صدیوں تک جاری رکھتے تھے۔ ایک خدا کی جگہ کئی کئی خدا اور اپنے ہی ہاتھ کے بنائے ہوئے بت، پوجتے تھے۔ شخصیت پرستی کا دور دورہ تھا۔ شراب اور فواحشات کی گرم بازاری تھی۔ انصاف اور قانون کا نام ونشان نہیں تھا۔ ان حالات کی موجودگی میں ایسے رحمت للعالمین کے وجود ذی وجود کی کس طرح توقع ہو سکتی تھی، جس نے عرب، جاہل عرب کو وہ قابل فخر خطہ بنا دیا کہ آج تمام دنیا کے مسلمان، سرزمین عرب کو دنیا کا بہترین وافضل ترین ٹکڑا تصور کرتے ہیں اور مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ پر جان فدا کرنے کو تیار ہیں۔ (محمد دین فوق ایڈیٹر رسالہ ''طریقت'' نے علامہ سے انٹریوں لیا۔ بحوالہ اقبال اور لذت پیکار صفحہ ۱۳۲ تا ۱۳۷)۔

اصلاح نفس کے لئے

عالم ربانی کی ضرورت

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اپنے رسالہ "سچائی" اور "صدق" و "صدق جدید" کے ذریعہ مادیت پرستی کی عالمگیر تحریک کی ہر لہر کا جس ہمت، استقامت، بصیرت اور مستقل مزاجی سے مقابلہ کیا ہے، اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ ان کی تحریروں نے پچاس سال تک برصغیر ہند کے مسلمانوں کی بہتر رہنمائی کی ہے۔ ان کی تفسیری خدمات بھی ناقابل فراموش ہیں، قرآن مجید کی اردو اور انگریزی میں تفسیر انکا اہم کارنامہ ہے۔

برصغیر ہند میں ۱۹۲۵ء سے لے کر ۱۹۷۷ء تک معاشرہ کی سطح پر جو بھی فتنے اٹھے، موصوف نے اپنے رسالہ کے ذریعہ ان کے خلاف قلمی جہاد کیا۔

مولانا کا درج ذیل مضمون "سچائی" ۱۹۲۸ء کے شمارے سے ماخوذ ہے۔ (مرتب)

•

ایک صاحب کا ایک بہت طویل مراسلہ آیا ہے۔

مراسلہ کا زیادہ حصہ حسب ذیل ہے:

"مدت سے ایک ضمیری الجھن میں مبتلا ہوں، اور کوئی روحانی طبیب مجھے ملتا نہیں۔ بحیثیت مسلمان، پیری مریدی سے متعلق آپ کے حقیقت آگیں، خیالات سے مستفیض ہونا چاہتا ہوں۔ خوش نصیبی یا بدنصیبی سے میرے خاندان میں دونوں شغل ہوتے ہیں۔ مجھے کسی اللہ والے سے نسبتِ ارادت حاصل نہیں۔ بہت گناہگار ہوں،

مگر قلب وضمیر کی حالت بحمداللہ بہت کچھ قابل اطمینان ہے......

اسلامی نقطۂ نظر سے پیری مریدی کے اغراض ومقاصد کیا ہیں؟

ملتِ مرحومہ کے لیے من حیث الاسلام یہ کہاں تک لازمی ہے؟ کیا قرن اول میں جو یقیناً اسلام کا عہد سعادت تھا، ایسی مثالیں ملتی ہیں؟ عہد نبوت وعہد صحابہ کے بعد دورِ تابعین میں بھی کیا پیری مریدی کی کثرت اور ناخوش آیند بہتات تھی؟ تمسک بالکتاب والسنتہ کے بعد کیا یہ بھی لازمی ہے کہ کسی رسمی پیر کی پیروی کی جائے؟ ایک مسلمان امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا پابند، اللہ سے ڈرتا سچ بولتا، مشائخ کرام صلحائے امت کا ادب واحترام رکھتا ہے، لیکن عرف عام میں مرید نہیں، کیا عنداللہ وہ اس کا ذمہ دار ہے، اگر بیعت کا مقصد دعوت الی الحق، رشد وہدایت وغیرہ ہے، تو آجکل پیروں کی جماعت عموماً یہ خدمات کہاں تک انجام دے رہی ہے۔ پھر محترم علمائے امت کی موجودگی میں، اس جماعت کی ضرورت ہی کیا ہے؟ پھر صوفیۂ کرام کی جماعت میں اگر کچھ صاحبان علم وعمل افراد ہیں بھی، تو ان میں ایسوں کا تو بالکل پتہ نہیں، جو بلاخوف لومۃ لائم اظہار حق میں بیباک ہوں......

صحابۂ کرام کے اسوۂ حسنہ محفوظ ہیں۔ کیا اُن سے اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے، کہ مسلمانوں کی دو جماعتیں ہونی چاہییں، ایک دین کی رہنمائی کے لیے اور دوسری دنیا کی۔ یا یوں کہا جائے کہ ایک مسلمانوں کے قلب وضمیر کی اصلاح کرے اور دوسری شریعت کے ظاہری احکام کی طرف رہنمائی؟ پھر اگر کوئی مسلمان اپنی فطری صلاحیت سے اپنے اخلاق کی اصلاح کرنا چاہے تو کیا یہ ممکن نہیں؟

جناب رسالتمآب ﷺ کے ارشاد گرامی من مات لیس فی عنقه بیعة مات میتة الجاهلیة. کا کیا مفہوم ہے؟ امام سے مراد امیر امت، قائد عسکر، مرشدِ طریقت امام جماعت۔ لیکن اول الذکر دوصورتوں میں ہندوستان کے سات کروڑ حلقہ بگوشان اسلام کے لیے صورتِ تشفی کیا ہے؟

مشائخ کرام، سورہ فتح کی آیتہ کریمہ ان الذین یبایعونک سے استدلال
فرماتے ہیں اور بیعت طریقت کو لازمی بتاتے ہیں۔ کیا موجودہ بیعتوں کو کوئی نسبت
اس بیعت سے ہے! اسلام میں بیعت کی مختلف صورتیں ہیں، متداول بیعتیں کس شق
میں داخل ہیں؟ ایک بیعت اس خیال سے بھی کی جاتی ہے کہ چاہے تمام عمر کچھ بھی
کرتے رہیں، لیکن اگر کسی سلسلہ میں داخل ہو گئے، تو ہمارے تمام اگلے پچھلے گناہ
معاف کردیے جائیں گے .... اب واقعی بیعت کی دوصورتیں رہ گئیں۔ کسی
مسلمان کا اپنے گناہوں سے پشیمان ہونا، اور کسی محترم شخصیت کے ہاتھ پر ترک گناہ
کا عہد کرنا..... مگر ظاہر ہے کہ آجکل یہ خیال سرے سے پیش نظر ہی نہیں۔ اب رہی
دوسری صورت اور وہی یقیناً مبارک ہے۔ یعنی کسی مسلمان کو پورا پورا پابند شریعت اور
متبع سنت پائے اور اس کے قدم بہ قدم چل کر، اپنی دنیا وعاقبت سنوارے۔ لیکن
جناب محترم مجھ سے کہیں زیادہ باخبر ہیں۔ کہ آج مسلمان اس پر کہاں تک عامل ہیں
..... جامعہ عثمانیہ کے ایک ممتاز فاضل سے تبادلۂ خیال کا اتفاق ہوا، انکی تقریر کا
ماحصل یہ نکلا، کہ مسلمان ان معاملات میں بھی دوسرے اقوام کے عقائد وخیالات
سے متاثر ہوئے، اور انہوں نے کچھ تاریخی شہادتوں سے استناد کیا۔"

مراسلہ نویس کے دل میں جو خیالات اور سوالات پیدا ہوئے ہیں، بہتوں
کے ذہن انہیں الجھنوں میں مبتلا ہیں، اور سچ یہ ہے کہ کس سے وہ جوابات اور اپنی
تشفی چاہتے ہیں، وہ خود بھی نہ ابھی تک کسی کا مرید ہے، اور نہ ان الجھنوں سے
آزاد ہو چکا ہے۔ بیمار کے علاج کے لیے ضرورت طبیب کی ہے۔ نہ کہ کسی دوسرے
بیمار کی۔ تاہم بعض پُرانے مریض، طبیبوں کی باتیں سنتے سنتے خود بھی کچھ نیم طبیب
سے ہوجاتے ہیں، اور گوخود بدستور بیمار چلے جاتے ہیں، لیکن اپنے ان تجربوں سے
نئے مریضوں کی ایک گونہ ہمدردی و دلدھی کر سکتے ہیں۔

سب سے پہلے ایک اہم حقیقت کو پیش نظر کر لینا چاہیے، جو اگرچہ بالکل

صاف، واضح، اور غیر اختلافی ہے، لیکن اکثر ذہن سے نکل جاتی ہے، اور اسی کے نظر
انداز ہوجانے سے طرح طرح کی غلط فہمیاں اور الجھنیں پیدا ہوجاتی ہیں۔ وہ
حقیقت یہ ہے، کہ خالص دینی علوم بھی آج جن با آئین وباضابطہ صورتوں میں
موجود ہیں، اور جو مصطلحات ان میں رائج ہیں، عہد رسالتمآب ﷺ میں، ان میں
سے کوئی شے بھی نہ تھی، اور اس خاص لحاظ سے یہ سب "بدعت" ہی ہیں۔ خود سنت
رسولؐ ہی کو لیجیے۔ آج فن احادیث وسنن ایک مستقل ومخصوص فن ہے، جس میں
صدہا اصطلاحات ہیں، جسکے اصول پر تصانیف کا ایک دفتر ہے، جس کی مختلف شاخیں
اور شعبے ہیں، اور جس کے سیکھنے کے لیے برسوں کی محنت اور اساتذۂ کاملین کی ہدایت
کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ عہد رسالتؐ میں یہ کچھ بھی نہ تھا، رسول اللہؐ کی معمولی
سادہ گفتگو کا نام "حدیث" اور روزانہ زندگی کا نام سنت تھا۔ بااینہمہ محدثین کرام کی
کاوشوں کو کوئی شخص "بدعت" کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ یہی حال ائمہ تفسیر کی نکتہ
سنجیاں اور ائمہ فقہ کے قیاس، اجتہاد، واستنباط کا ہے۔ لغوی معنی کے لحاظ سے یہ سب
کچھ بدعت ہی ہے، لیکن اگر حقیقتہ بخاری ومسلم، ابوحنیفہ ومالک رحمتہ اللہ علیہم، کی
جانفشانیوں سے یکسر قطع نظر کرلی جائے، تو شریعت اسلام کے پاس باقی کیارہ
جائے گا؟ خود صحیفۂ ربانی تک، اس ہیئت وترتیب وتدوین کے ساتھ مکتوبی صورت
میں، عہد رسالت میں کہیں یکجا موجود نہ تھا۔

بات بالکل صاف اور موٹی ہے، لیکن ذہن انسانی کا خاصہ ہے، کہ اکثر سامنے
کی چیزوں کو بالکل بھلائے رکھتا ہے، اور دور دور کی باریکیوں میں الجھنے لگتا ہے۔
غرض جو حال فقہ کا ہے، تفسیر کا ہے، حدیث کا ہے، ٹھیک وہی حال تصوف وسلوک کا
ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں نہ لفظ "تصوف" موجود تھا۔ "لفظ" صوفی
اور نہ "احوال" و "مقامات" "اذکار" و "اشغال" کی وہ سیکڑوں دوسری اصطلاحیں، جن
میں موجودہ تصوف بھرا پڑا ہوا ہے۔

"پیری" و "مریدی" کے الفاظ بھی اس زمانہ میں ناپید تھے۔ پس جہاں تک لفظ واصطلاح کا تعلق ہے، یہ دعویٰ بالکل درست ہے، کہ تصوف اور پیری مریدی بدعت ہے۔ لیکن اس معنی میں خود فن حدیث بھی بدعت ہے، کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں نہ کوئی فن "اسماء الرجال" تھا، نہ "جرح" و "تعدیل" کے اصول وقواعد مدون تھے، نہ "ضعیف" و "موضوع" کی اصطلاحیں وضع ہوئی تھیں، اور نہ کوئی دماغ "متواتر" و "صحیح"، "حسن" و "غریب" کی بحثوں سے آشنا ہوا تھا، لیکن لفظ واصطلاح کی بحث سے گزر کر، اگر اصل حقیقت تک پہونچنا مقصود ہے، تو جس طرح ہر صحابی، بزم رسول ؐ کا ہر صحبت یافتہ، دربار رسول ؐ کا ہر حاضر باش، مفسر تھا، محدث تھا، اور فقیہ تھا، اسی طرح صوفی بھی تھا۔ اور بلا استثناء ہر صحابیؓ مرید تھا۔ سب کے پیر، مرشد کل، سرکار رسالت ؐ تھے۔

کہا جاتا ہے کہ تمسک بالکتاب والسنۃ کے بعد، کسی رسمی پیر کے مرید ہونے، کی ضرورت کیا رہتی ہے"؟ سارا مغالطہ سوال کے لفظ "رسمی" میں موجود ہے۔ "رسمی" تو کسی شے کی بھی ضرورت نہیں۔ نہ رسمی اسلام کی، نہ رسمی اتباع رسول ؐ کی، نہ رسمی تمسک بالکتاب کی۔ لیکن حقیقی اسلام، حقیقی ایمان، حقیقی تمسک بالکتاب، والسنۃ، بغیر کسی زندہ شخصیت کے توسط کے ممکن کیونکر ہے؟ اور اسی زندہ شخصیت کا اصطلاحی نام "پیر" ہے، "مرشد" ہے، "صاحب بیعت وارشاد" ہے۔ ابوبکر وعمر، عثمان وعلی، حسن وحسین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین سے بہتر فطری صلاحیت واستعداد کس میں موجود ہو سکتی ہے، پھر جب ان کے لیے ایک زندہ شخصیت (ﷺ) کا اتباع ناگزیر رہا، تو اور کسی کو کب مفر ہو سکتا ہے؟ حدیث کی جن کتابوں کو ہم سرچشمۂ تقدیس سمجھ رہے ہیں، انکے نقوش وحروف، انکے کاغذ کی سفیدی اور الفاظ کی سیاہی میں کیا رکھا ہوا ہے، ان میں جو کچھ تقدس ہے، وہ سارے کا سارا اسی بنا پر تو ہے، کہ انکے اندر کسی زندہ شخصیت کی روح کس حد تک محفوظ ہے، یہ روح مردہ کاغذ کے مردہ طومار میں تو

محفوظ ہوجائے، اور زندہ انسان کے زندہ قلب میں نہ محفوظ ہو سکے! یہ روح الماریوں کے سفینوں میں تو منتقل ہوجائے، اور پاکوں اور پاکبازوں کے سینوں کو منور نہ کر سکے!

قرآن، رسول کا تو کلام نہیں، اللہ ہی کا کلام ہے، اور بندوں کی ہدایت ہی کے لیے نازل ہوا ہے۔ یہ بھی ہم سب کا ایمان ہے، اور خود قرآن بار بار اس کا دعویٰ کرتا ہے، کہ اس میں ساری ضروری ہدایات، تفصیل وتشریح کے ساتھ موجود ہیں۔ باانہمہ یہ نہ ہوا، کہ قرآن براہ راست تمام بندوں کے پاس پہونچ جاتا۔ منکرین اور مومنین اسے آسمان سے اترتا ہوا اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے، کسی اونچے پہاڑ کی چوٹی پر رکھا ہوا مل جاتا، یا ایک روز جب صبح ہوتی تو اس کا ایک ایک نسخہ ہر شخص کے سرہانے رکھا ہوا موجود ہوتا! اس طرح کی تو کوئی چیز بھی نہ ہوئی۔ بلکہ اللہ نے اسکے بالکل برعکس طریقہ یہ اختیار کیا، کہ پہلے ایک انتہائی بدکار قوم کے درمیان ایک پاک اور برگزیدہ ہستی پیدا کی، چالیس برس کی عمر تک اس شخصیت کو اس قوم کے درمیان ہر قسم کے سابقہ کے ساتھ رکھا، اور اس کی طبیعت وسیرت کے ایک ایک جزئیہ کی جانچ اور پرکھ کا پورا موقع دیا۔ جب یہ سب مراتب طے ہو چکے، اسوقت کہیں جاکر پیام کا نزول شروع ہوا، لیکن اسوقت بھی "پیام" کے پیش کرانے سے قبل "پیام بر" کی شخصیت ہی کو پیش کرایا گیا، اور جب قوم اس شخصیت کے صادق وامین ہونے کا اقرار کر چکی، تب اس سچے کی زبان سے سچی باتیں کہلائی جانی شروع ہوئیں۔ اس پر بھی سارے پیام کو یک بیک اور دفعۃً نہیں پیش کر دیا گیا، بلکہ پیامبر کی شخصیت پر مختلف اور متعدد دور حاوی کر کے ...... ۲۳ برس کی طویل مدت میں، بہت ہی تدریج کے ساتھ اس پیام کو پہونچایا گیا۔ پس نظری اور ربانی طریقہ تو یہی ہے، کہ پہلے پیامبر پھر پیام، پہلے طبیب پھر نسخہ، پہلے ہادی پھر ہدایت۔ اب اگر ہم اس ترتیب کو الٹ دینا چاہیں، اگر ہادی سے بے نیاز ہوکر ہدایت تک، اور شخصیتوں

سے قطع نظر کر کے محض اصول وسائل تک، پہونچ جانا چاہیں، تو یہ ترتیب ربانی سے جنگ کرنا ٹھہری۔

یہ نہ خیال گذرے، کہ یہ طریق دعوت وہدایت صرف وحی الٰہی کے ساتھ مخصوص تھا، بلکہ رسول اللہؐ نے اپنے بعثت کے بعد اپنے قصدوارادہ کے ساتھ یہی طریقہ اختیار کر رکھا ہے۔ آپ نے یہ نہ کیا، کہ قرآن مجید کے نسخوں کی نقلیں کثرت سے کرا کے محض انہیں، اطراف ملک میں بھیجد یا ہوتا، یا اپنے اقوال وسنن کو ضبط تحریر میں لا کر ملک میں ان کے نسخوں کی اشاعت کر دی ہوتی۔ بلکہ آپ نے صحابیوں کی جماعت پیدا کی، اشخاص پیدا کیے، جو اپنی زندگیوں میں آپ کی تعلیم اور آپ کے عمل کے عملی نمونہ تھے، اور دین کی روشنی آپ نے ان زندہ شخصوں کے ذریعہ سے پھیلائی۔ اللہ کے رسولؐ نے یہ کبھی نہ کیا، کہ کسی گوشہ میں تشریف فرما ہو کر سکون وخاموشی کے ساتھ قلم وکاغذ لے کر تصنیف وتالیف میں مشغول ہو جاتے، اور حسن عمل وحسن اخلاق پر مقالات تیار فرمانے لگتے۔ بلکہ آپ نے اپنی نورانیت سے قلوب کو منور کرنا شروع کیا، اور اپنی پاکیزگی کے عکس سے دوسروں کے سینوں کو پاک بنا دیا۔ رسول خداؐ نے کچھ تصنیفات اپنی یادگار چھوڑیں؟ ہاں بے شبہ چھوڑیں، لیکن وہ کاغذ کے طومار، اور سیاہی کے ڈھیر نہیں، وہ گوشت وپوست کے بنے ہوئے جسم اور تقویٰ وطہارت میں ڈھلی ہوئی روحین تھیں۔ ان تصانیف کا شمار ہزارہا تک پہونچتا ہے، چند مشہور ترین کے نام ابوبکرؓ وعمرؓ، عثمانؓ وعلیؓ تھے، پھر یہ حضرات بھی کتابی تصنیف وتالیف پر ایک لمحے کیلئے متوجہ نہ ہوئے، انہوں نے بھی زندہ ہستیوں کو اپنے نمونہ پر ڈھالنا شروع کیا، اور اپنے شاگردوں کے جسموں میں اپنی روحیں پھونکنے کا عمل جاری رکھا۔ ''صحابہ''، ''تابعین''، اور ''تبع تابعین'' یہ سب کون تھے؟ شاگردوں کی جماعت ''مریدوں کی جماعت، بیعت کرنے والوں کی جماعت، ارادت رکھنے والوں کی جماعت۔

مادی علوم میں آج کون سا علم، اور دستکاری کے پیشوں میں آج کونسا پیشہ ایسا ہے، جس میں استاد کی مدد لازمی نہیں؟ پھر، روحانیت کا علم، جو ان تمام علوم سے زیادہ لطیف، تزکیۂ نفس کا فن، جو ان تمام فنوں سے زیادہ دشوار، اللہ کی معرفت، جو ہر شے سے زیادہ نازک ہے، ممکن ہے، کہ اسی میں ''استاد کی ضرورت نہ پڑے! اس سفر میں تو قدم قدم پر رہنما ناگزیر ہے۔ اسی رہنما یا ایسے استاد کا اصطلاحی نام پیر ومرشد ہے۔ کہا جاتا ہے، کہ علماء کے ہوتے ہوئے، پیروں کی ضرورت کیا ہے؟ لیکن یہ ''مولویوں'' اور ''پیروں'' کی موجودہ تفریق بھی تو ہماری آپ کی قائم کی ہوئی ہے، اسلام اس کا ذمہ دار کب ہے؟ اسلام تو ''صادقین'' ''متقین'' ''مومنین'' ''صالحین'' ''محسنین'' کی جو جماعت پیدا کرنا چاہتا ہے، اس میں اس تفریق کا گزر ہی نہیں۔ وہ ہستیاں تو علم وعمل، قول وفعل، فقہ وفقر، دونوں کی جامع ہوتی تھیں۔ یہ تفریق تو سیکڑوں دوسری تفریقوں کی طرح، دور انحطاط اور امت کی بدبختی وبداقبالی نے پیدا کر رکھی ہے، اور وہی اسکی ذمہ دار ہے۔

مریدی کا اصلی راز، پیر کی صحبت ہے۔ چنانچہ لفظ ''صحابی'' بھی ''صحبت'' ہی کی اہمیت کو واضح کر رہا ہے، اور پیر کے مفہوم کی جانب ابھی اشارہ ہو چکا ہے، یعنی وہ شخص جسکے نفس کا تزکیہ اس حد تک ہو چکا ہے، کہ وہ اپنی رفاقت سے دوسرے کے بھی نفس کا تزکیہ کر دے، وہ کامل جو دوسروں کو بھی کامل بنا سکے، مصلح جس کی، ہم نشینی دوسروں کی فطری صلاحیتوں کو ابھار دے۔ پس مرید ہونے کے معنی، اس سے زائد کچھ نہیں، کہ جس کے پاک وصالح ہونے پر بھروسہ ہو جسکے تزکیۂ نفس پر اعتماد ہو، یا بہ اصطلاح صوفیہ، اس سے قلب کو ارادت ہو، اسکی خدمت میں، اطاعت ونیاز مندی کے ساتھ حضوری کی جائے، اور یہ مریدی، کلام مجید کے حکم وکونوا مع الصادقین کی عین تعمیل ہے..... آیت کے الفاظ یہ ہیں، یا ایھاالذین آمنوا، اتقواللہ وکونوا مع الصادقین، محض ایمان کافی نہیں۔ ایمان والوں سے تو خطاب ہی ہے۔ ایمان تو

پہلے ہی قائم ہو چکا ہے۔ اب اس کے بعد حکم ہوتا ہے کہ اللہ سے تقویٰ اختیار کرو۔ صدق دل سے نمازیں پڑھو، روزے رکھو، ادائے حقوق کرو، وغیرہ۔ لیکن یہ سارے اعمال بھی کافی نہیں، بلکہ دوسرا حکم یہ ملتا ہے، کہ صادقوں کی معیت اختیار کرو، راست بازوں کی صحبت میں رہو، پاکوں کی پیروی کرتے رہو! اور یہی مریدی ہے۔

اتباع رسول کا نام لیا گیا ہے۔ لیکن رسول خدا ﷺ کی زندگی، محض خارجی اعمال اور ظاہری اعمال کے مجموعہ کا نام نہ تھی، بلکہ خاک کے اندر نور پاک جلوہ گر تھا اس نور کی تجلی ریزیاں ہر گھڑی اور ہر لمحہ ہوتی رہتی تھیں۔ تمام صحابہ ہر حیثیت سے مساوی نہ تھے، اپنا اپنا ظرف اور اپنی اپنی نظر تھی۔ حضرت خالد میدان جہاد کے کماندار ہوئے، حضرت بلالؓ کسی کی نگاہ ناز کے خود ہی گھائل ہوئے، حضرت ابوہریرہؓ روایات حدیث کی اشاعت کرتے رہے، حضرت ابن عباسؓ کی قسمت میں ترجمان القرآن بننے کی سعادت آئی، حضرت حسینؓ بن علیؓ کو خاک کربلا میں تڑپنا اور خون میں نہانا نصیب ہوا۔ ہر صاحب کا مذاق طبیعت جداگانہ تھا۔ قدرۃ ایک بڑی اطاعت کی توجہ امور خارجی پر زیادہ مبذول رہی۔ اور اس کا بڑی تفصیل سے مطالعہ ہوتا رہا، کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز میں ہاتھ سینے پر باندھا، یا ناف پر، آمین آہستہ فرمائی، یا آواز سے، لیکن ایک دوسری جماعت بھی برابر موجود رہی، جسکی نظر ظاہر سے زیادہ باطن پر، قال سے زیادہ حال پر رہی۔ یہ خوش نصیب تھے، جنہوں نے محض "فتح مکہ" کی جلوہ طرازیوں کا تماشا نہیں دیکھا، بلکہ "غار حرا" کی خلوت آرائیوں کا مزہ بھی چکھا، جنہوں نے محض حرض المومنین علی القتال ہی کا پیام نہیں سنا، بلکہ سبحان الذی، اسرا کی حقیقت کو بھی پہچانا، اور جن کی نگاہیں محض یہیں تک محدود نہیں رہیں، کہ نماز کی کے رکعتیں پڑھی گئیں، بلکہ یہاں تک بھی پہونچیں، کہ نماز کس دل سے پڑھی گئی، کس ذوق وشوق سے ادا کی گئی، اور قلب کے اندر خضوع وخشوع کی کیا کیفیتیں رہیں۔ شجرۂ تصوف وطریقت کے سر سلسلہ یہی بزرگان کرام ہوئے ہیں۔"

اس نعمت کے حصہ دار کم وبیش تمام صحابیان کرام تھے، لیکن خصوصیت کے ساتھ اس دولت سے مالا مال، حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت علی مرتضیٰؓ، حضرت حذیفہؓ حضرت سلمان فارسیؓ، حضرت ابوعبیدہؓ، حضرت ابو درداءؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت عمران بن حصینؓ، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ، وغیرہم تھے۔ چنانچہ صوفیہ کے قدیم تذکرے، انہیں حضرات سے شروع کیے گئے ہیں۔ اور تصوف کی بعض قدیم ترین تصانیف میں تو حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کو بھی صراحت کے ساتھ اساطین تصوف میں شمار کیا ہے۔

شریعت وطریقت کے درمیان، کوئی تخالف یا تضاد مطلق نہیں، بلکہ اکابر طریقت کے حسب تصریح کمال شریعت ہی کا نام طریقت ہے، اتباع رسولؐ، جب تک محض ظواہر تک محدود رہے، اس کا نام شریعت ہے، اور جب قلب وباطن بھی نورانیت رسولؐ سے منور ہوگیا، تو یہی طریقت ہے، ایک شخص نے نماز حسب قواعد مندرجہ کتب پڑھ لی، شریعت کی رو سے یہ نماز جائز ہوگئی۔ طریقت اسے کافی نہ سمجھے گی۔ وہ اس پر مصر ہوگی، کہ جس طرح چہرہ کعبہ کی جانب متوجہ رہا، قلب بھی رب کعبہ کی جانب متوجہ رہے، اور جس طرح جسم حالت نماز میں ظاہری نجاستوں سے پاک رہا، روح بھی باطنی آلائشوں، پریشان خیالوں، سے پاک رہے۔ یہ شریعت کی مخالفت ہوئی، یا منشا شریعت کی عین تکمیل؟ حضرت اکبر نے اسی مقام اور اسی منزل کی توضیح، اپنے مخصوص انداز میں کی ہے۔

شریعت در محفل مصطفیٰ — طریقت عروج دل مصطفیٰ
عبادت سے عزت شریعت میں ہے — محبت کی لذت طریقت میں ہے
شریعت میں ہے صورت "فتح بدر" — طریقت میں ہے معنی "شق صدر"
شریعت میں ہے قیل وقال حبیبؐ — طریقت میں حسن وجمال حبیبؐ
نبوت کے اندر ہیں دونوں ہی رنگ — عبث ہے یہ ملا وصوفی کی جنگ

آخر یہ ارشاد بھی تو رسول اللہ ﷺ ہی کا ایک باخبر سائل کے جواب میں ہے، کہ۔

قال ما الاحسان؟ قال ان تعبد اللہ کانک تراہ، فان لم تکن تراہ، فانہ یراک. (بخاری، کتاب الایمان)

احسان نام اسکا ہے، کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے، کہ گویا تو اسے دیکھ رہا ہے، اور اگر تو اسے نہیں دیکھتا، تو وہ تجھے دیکھ رہا ہے!

پوری حدیث میں ایمان کے معنی بعض عقائد کے بتائے گئے ہیں، اور اسلام کے معنی بعض اعمال کے ارشاد ہوئے ہیں۔ اسکے بعد، احسان کی یہ توضیح فرمائی گئی ہے۔ گویا عقیدہ وعمل کے بعد، ایک تیسری منزل، ان دونوں کے بلند تر احسان کی آتی ہے، جس کا تعلق محض جاننے اور کرنے سے نہیں، بلکہ ''مشاہدہ'' و''رویت'' سے ہے۔ یہی منزل، تصوف وطریقت کی منزل ہے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہؒ نے ''اہل تصوف'' کے بجائے ''اہل احسان'' ہی کی اصطلاح اختیار کی ہے۔ اور شاید ''اہل صدق'' و''صدیقین'' کی اصطلاحیں بھی یہی کام دے سکیں۔ لیکن یہ ساری بحثیں محض لفظی ہیں۔ سوال صرف یہ ہے، کہ ایمان کے اجزاء، اور اسلام کے ارکان تو کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتے ہیں، ایمان وعمل کے ظاہری اور خارجی پہلو تو کتابوں سے دریافت ہو سکتے ہیں، لیکن قلب کو مرتبۂ احسان تک پہونچا دینا۔ تزکیۂ باطن، تجلیۂ نفس، تطہیر اخلاق، بغیر ایک زندہ شخصیت، بغیر ایک مرشد کامل کی وساطت کے کیونکر ممکن ہے؟ جو قانون اور ضابطے کتابوں میں درج کرنے والے تھے، حدیث وآثار، وفقہ کی کتابوں میں مدون ہوتے رہے، لیکن جن چیزوں کا تعلق وجدانیات وکیفیات سے ہے، وہ تحریر میں کیونکر آ سکتی تھیں۔ وہ تو ایک قلب سے دوسرے قلب پر اپنا عکس ڈال سکتی ہیں۔

یہ مرشد کوئی خود رو اور خود رائے ہستی نہیں ہوتی، بلکہ جس طرح آپ قرآن

کی ساری عبارت کو، محض سند متصل کی بنا پر، کلام الٰہی مانتے چلے آتے ہیں، جس طرح آپ بخاری کی کسی روایت کو محض اس لیے کلامِ رسولؐ تسلیم کر لیتے ہیں، کہ وہ معتبر سند تسلسل کے ساتھ رسول اللہؐ سے روایت ہوئی ہے، ٹھیک اسی طرح اس مرشد کا قلب بھی، ایسے ہی مضبوط واسطوں کے ساتھ رسول اللہؐ کے قلب مبارک سے ملا ہوا ہوتا ہے، اس کا رابطہ روحانی بھی، ایسی ہی زنجیر کی مضبوط کڑیوں کی طرح، سرچشمۂ تقدیس وروحانیت سے جُڑا ہوا ہوتا ہے۔ جس طرح امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ (اللہ ان کی تربتوں کو ٹھنڈا رکھے) ''آثار رسولؐ'' و''اخبار رسولؐ'' کو اپنے ضخیم دفتروں میں ضبط وفراہم کرتے رہے، اسی طرح حسن بصریؒ وجنیدؒ ''اسرار رسول'' ''انوار رسول'' سے اپنے سینوں کو منور کرتے رہے۔ ادھر رسولؐ کا ''قال'' ایک سفینے سے دوسرے سفینے میں نقل ہوتا رہا، ادھر رسولؐ کا ''حال'' ایک سینے سے دوسرے سینے کو طور سینا بناتا رہا۔ دونوں شعبوں کی جامعیت، عہد صحابہ ہی میں، صرف تھوڑے سے خوش نصیبوں کے حصے میں آئی، پھر آج چودھویں صدی میں اسکی تلاش پر کیوں اصرار ہے؟ تاہم زمانہ اب بھی یکسر خالی نہیں۔ شیخ الھند مولانا محمود الحسنؒ، اور مولانا شاہ بدرالدینؒ کی مبارک ہستیاں، اسی چودھویں صدی میں تھیں۔

سوال کیا گیا ہے، کہ اگر کوئی مسلمان اپنی فطری صلاحیت سے اپنے اخلاق کی اصلاح کر لینا چاہے، تو کیا یہ ممکن نہیں؟ جواب میں ایک دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے، کہ اگر کوئی شخص محض اپنی عقل سلیم کی مدد سے، خالق ومخلوق کے حقوق پوری طرح ادا کرنے لگے تو کیا یہ کافی نہیں؟ نہیں، اور یقیناً نہیں۔ اگر محض عقل سلیم اور صلاحیت فطری، خدا شناسی کے لیے کافی ہے، تو کیا کتابوں کے نازل کرنے، انبیاء کرام کے بار بار بھیجنے، اور ان سے منکرین کے جدال وقتال کا سارا نظام، معاذ اللہ بیکار وعبث ہی ٹھہرتا ہے۔ یہ تنگی نہیں، عین وسعت، اور سختی نہیں، عین رحمت ہے، کہ دین اور معرفت دین کی نزاکتوں کا بار، محض قوائے عقلی پر نہیں ڈال دیا گیا، بلکہ اسکے لیے تو

اسے عقلی سے کہیں برتر وبلند تر قوت، وحی الٰہی سے امداد بہم پہونچائی گئی، اور اس نعمت غیر مرئی کو اجسام انبیاء کرام کی شکل میں مرئی ومجسم کر کے پیش کیا گیا، اور دنیا پر انکی پیروی فرض کی گئی۔ لفظ فرض اچھی طرح ذہن میں رہے۔ محض مستحب یا مستحسن نہیں، انبیاء کرام، خصوصا سب سے آخری نبی (ﷺ) کی پیروی، فرض اور قطعی فرض ہے۔ اگر آج کوئی شخص محض عقلی دلائل سے، یا اپنے باطن کی اشراقیت کو بیدار کر کے، اس نتیجے تک پہونچ جاتا ہے، کہ صحیح عقیدہ، عقیدۂ توحید ہے، اور نماز اور روزہ وغیرہ میں بیشمار فوائد ہیں۔ تو ایسے شخص کا شمار ہرگز مسلموں میں نہیں کیا جا سکتا، اس لیے کہ اس نے ان مسائل کو صحیح راستہ سے پیروی رسولؐ سے، اتباع وحی سے، نہیں حاصل کیا، مسلم بننے کے لیے، رسول کے لائے ہوئے دین کی، رسولؐ کے نمونے کی، پیروی لازمی ہے۔ اور اسلام اور عدم اسلام کے درمیان یہی ایک شے فرق وامتیاز پیدا کرنے والی ہے۔

جب پیروی رسول ناگزیر ٹھہری، تو سوال یہ ہے کہ پیروی رسولؐ کے معنی کیا ہیں؟ کیا محض الفاظ رسول کو قبول کر لینا مراد ہے؟ کیا محض ہیئت عبادت رسولؐ کا اقتدا مقصود ہے؟ کلام مجید میں ایک جگہ نہیں، متعدد بار، اور کنایہ نہیں، صراحتہ اتباع رسولؐ کا حکم وارد ہوا ہے۔ جہاں کہیں بھی یہ حکم آیا ہے۔ اپنی مطلق وغیر مقید صورت میں آیا ہے، یہ نہ کہیں ارشاد ہوا ہے، نہ کہیں سے یہ نکلتا ہے، کہ امت کے لیے، رسولؐ کے صرف ظاہر کی پیروی کافی ہے، اور باطن کی پیروی غیر ضروری ہے! رسول اللہؐ جس طرح ہمارے لیے اسوۂ حسنہ کا حکم بلحاظ اپنی نماز کی تعداد رکعات کے رکوع وسجود کے، قیام وقرأت کے رکھتے ہیں، اسی طرح وہ نماز میں خشوع وخضوع کے لحاظ سے، ذوق ووجد کے لحاظ سے، کیف واستغراق کے لحاظ سے بھی، ہمارے لیے اسوۂ حسنہ کے حکم میں داخل ہیں، پس جب باطن رسول کی پیروی بھی ویسی ہی ضروری ٹھہری، جیسی ظاہر رسولؐ کی، تو اب ارشاد ہو، کہ اس پیروی باطن کی صورت کیا

ہے؟ رسالتؐ کے لفظ اور ظاہر کی پیروی تو کتابوں کے ذریعہ سے ممکن ہے، پر معنی اور باطن کی پیروی کا کیا ذریعہ ہے؟ اخبار رسولؐ تو مجلدات کے الٹ پلٹ سے ہاتھ آسکتے ہیں، لیکن انوار رسولؐ کا عکس کس آئینہ میں نظر آئے؟

بعث فی الامیین رسولا منهم يتلوا عليهم آياته ويزكيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة.

رسولؐ کی بعثت کے اصلی مقاصد کلام مجید میں، امت پر تلاوت آیات کے بعد، دو بتائے گئے ہیں، ایک تزکیۂ نفوس، دوسرے تعلیم وتشریح، کتاب وحکمت۔ تشریح کتاب وحکمت کا سامان تو امام بخاری وامام مسلم کی وساطت سے بحمد اللہ ہوگیا، لیکن اس سے بھی مقدم تر مقصد، ''تزکیہ'' کی آخر کیا صورت ہے؟ ''مرشد کی تلاش'' ایک زندہ نائب رسولؐ کی معیت، انہیں سوالات کا جواب ہے؟

یہ مرشد، صحیح معنی میں ''مقلد'' ہوتا ہے، ''آئینہ'' کے پیچھے ''طوطی صفت'' رہ کر ''استاد ازل'' کے سبق کی تکرار کرتے رہنے سے، اس کا کام زائد نہیں۔ کوئی نیا مجاہدہ، ایجاد واختراع کرنا، ہرگز اس کا کام نہیں۔ لیکن ''اجتہاد'' ''استنباط'' کا دروازہ تو مقلدوں کے ائمہ فقہ، اور غیر مقلدوں کے ائمہ حدیث کے لیے کھلا ہوا ہے، پھر رحمت عالم کا وہ دروازہ غریب صوفی ہی کے حق میں کیوں بند کر دیا جائے؟ وہ ایجاد واختراع کی بدعت سے یقیناً بچے گا۔

جس طرح اہل ظاہر اپنے ''فہم'' و''قیاس'' و''استنباط'' کو معطل نہیں کر دیتے، اپنے ''کشف'' اپنے ''وجدان'' اپنے ''اشراق'' کو سرے سے معطل نہ کر دیگا۔ جب کبھی بھی لکھے گا، یقیناً شفا خانۂ نبوت ہی کے قرابا دین سے لکھے گا، لیکن وقت کے مزاج وخصوصیات، موسم کے حالات، آب وہوا کے اثرات وغیرہ کی رُو سے اجزائے نسخہ کی ترکیب اس کی اپنی ہوگی۔ یہ اس کی خود رائی نہیں، عین بدعت نہیں، عین پیروی سنت ہوگی۔

بڑی مصیبت یہ آن پڑی ہے، کہ دلیل کے مقدمات میں مثالیں، بہروں اور جلسازوں کی پیش نظر رہتی ہیں اور نتائج نکالتے وقت سرے سے حقیقت سے انکار کر دیا جاتا ہے! یہ کہاں کا انصاف ہے، کہ اگر پیتل کی دمک پر آپ کو کئی بار سونے کا دھوکا ہو چکا ہے، تو اب آپ سرے سے سونے ہی کے وجود کے منکر ہو چلے ہیں! کہا جاتا ہے، کہ اگر بیعت کا مقصد دعوت الی الحق ہے، تو پیروں کی جماعت آج کہاں تک اس فرض کو ادا کر رہی ہے؟ معقول ہے، لیکن سوال کو یہیں ختم نہ ہو جانا چاہیے، بلکہ مزید سوالات بھی پیش ہونے چاہییں، کہ آج علمائے ظاہر کہاں تک اپنے فرائض ادا کر رہے ہیں، قومی رہنماؤں میں سے کتنوں کے عمل انکے دعووں کے موافق ہیں؟ ایڈیٹروں میں کس حد تک خلوص وصداقت ہے؟ مسلمان تاجروں کو کہاں تک دیانت واکل حلال کا خیال ہے؟ وقس علیٰ ہذا۔ ظاہر ہے کہ کوئی طبقہ بھی اپنے اصلی معیار پر قائم ہوتا، تو آج یہ دن دیکھنا ہی کیوں پڑتے، لیکن بدون کی اکثریت کی بنا پر نیکوں کی اقلیت سے منکر ہو جانا، ہرگز نہ حق کے مطابق ہے نہ عقل کے۔ نفی حکمت کمسن از بہر دل عامے چند! سیکڑوں ہزاروں بدنام کرنے والوں کے ہجوم میں کچھ سچے صوفی تو اس وقت موجود ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ القول الجمیل میں تحریر فرماتے ہیں، کہ رسم بیعت اور بیعت صرف بیعت خلافت تک محدود نہیں۔ بلکہ عہد نبوی میں بیعت کی صورتیں رائج تھیں، مثلاً بیعت اسلام، بیعت ہجرت، بیعت جہاد، وغیرہ۔ اور صوفیہ کی مروجہ بیعت، بیعت تقویٰ کی قسم میں داخل ہے، خلفائے راشدین کے زمانے میں تو اس بیعت کی علحدہ ضرورت ہی نہ تھی، اس لیے کہ قلوب ونفوس، شرف صحبت رسولؐ سے خود ہی نورانی تھے، خلفائے راشدین کے بعد فتنہ کے خوف سے، اور بیعت خلافت کے ساتھ اشتباہ والتباس سے یہ بیعت موقوف رہی، اور صوفیہ اس بیعت کا قائم مقام خرقہ کو سمجھتے رہے، جب ملوک وسلاطین کا دور آیا، اور بیعت خلافت بند ہوگئی، تو

صوفیہ کرام نے فرصت کو غنیمت سمجھ کر، سنت بیعت کی از سر نو تجدید کی۔ آگے چل کر حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ جہاں بیعت لینے والے مرشد کے اوصاف کو شمار کراتے ہیں، اس کی ایک وجہ یہ فرماتے ہیں:

والشرط الخامس ان یکون صحب المشائخ وتادب بهم دهرا طویلا واخذ منهم النور الباطن والسکینة وهذالان سنة الله بان الرجل لایفلح الا اذا رای المصلحین کما ان الرجل لایتعلم بصحبة العلما وعلیٰ هذا القیاس غیر ذالک من الصناعات علی اهذا القیاس.

پانچویں شرط یہ ہے، کہ مشائخ کی صحبت میں ان سے طویل عرصہ تک، ادب حاصل کرے اور اس سے نور باطن واطمینان حاصل ہو، اور یہ شرط اس لیے ہے، کہ سنت الٰہی یوں جاری ہے، کہ کسی انسان کو مراد نہیں ملتی، جب تک اس نے مراد پانے والوں کو نہ دیکھا ہو، جس طرح علم نہیں حاصل ہوتا، بغیر صحبت علماء کے، اور دوسرے پیشے بغیر استاد کے۔

مضمون یوں ہی بہت طویل ہوگیا ہے، اگر مزید طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا، تو حضرت شاہ صاحب کے اس ارشاد کی، کہ حصول فیض کے لیے کسی زندہ شخصیت کی صحبت لازمی ہے، کلام مجید سے تشریح کی جاتی، اور مرشد کی ضرورت نیز مرشد پر واقعۂ حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ سے استدلال کیا جاتا۔ نیز انسان کے آگے، جو حقیقۃ خلیفۃ اللہ ہے، سر نہ جھکانے کی وعید پر واقعۂ حضرت آدم وابلیس سے روشنی ڈالی جاتی۔ وہیں رسوم صوفیہ، اور خرقہ مذکر، وغیرہ۔ سو ان کا لازمی تعلق تلاش مرشد ومقصد بیعت سے نہیں، تاہم اگر ان رسوم کی مسنونیت، سلاسلِ صوفیہ کی سند رسول کریم ﷺ تک معلوم کرنے سے دلچسپی ہو، تو شیخ شناسی کی السمط المجید ملاحظہ کی جا سکتی ہے، جو دائرۃ المعارف، حیدر آباد دکن سے شایع ہو چکی ہے۔

(سچ ۱۶ مارچ ۲۸ء)

اہل تصوف کے اشغال

آنحضورﷺ کے اعمال کے آئینہ میں

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ اس دور کی امت کی ان ممتاز فاضل شخصیتوں میں شامل ہیں، جو اسلامیات میں تبحر علمی کے ساتھ ساتھ دور جدید کے مسائل میں اجتہادی صلاحیتوں سے بہرہ ور تھے، ان شخصیتوں میں مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی شامل ہیں۔ مولانا گیلانی اپنے علم وفضل کی وجہ سے اس صف کی شخصیتوں میں شامل رہے۔ انہوں نے تصنیف وتالیف کا بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے، اللہ نے وقت میں بڑی برکت دی تھی۔ ۲۴ گھنٹے میں صرف چار گھنٹے آرام کرتے تھے۔ "سچ" صدق اور صدق جدید میں تیس سال تک ان کے سیکڑوں مضامین شائع ہوئے ہیں۔ کتابوں کی تعداد بھی بہت ساری ہے۔ (مرتب)

۱۹۳۵ء میں مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کے رسالہ "معارف" میں، مولانا عبدالسلام ندوی کے قلم سے تصوف کے موضوع پر مضامین کا ایک قسطوار سلسلہ شروع ہوا، جس میں تصوف کو مسترد کرنے کے لئے، وہ ساری باتیں دہرائی گئیں، جو علمائے ظاہر کی طرف سے عام طور پر کی جاتی ہیں اور صوفیائے کرام کو ہر ممکن طریقہ سے مطعون کرنے کی کوشش فرمائی گئی، اس موقعہ پر مولانا مناظر احسن گیلانی صاحب نے مولانا عبدالماجد دریابادی صاحب کو ایک تفصیلی خط لکھا، اس خط کو مولانا ماجد صاحب نے مضمون کا عنوان دے کر صدق میں شائع کردیا۔ یہ خط کیا ہے؟ تصوف واہل تصوف کی طرف سے ان پر لگنے والے الزامات کے جواب ووضاحت ودفاع

کے لئے، رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے واقعات کی تفصیل پر مشتمل ہے اور اس میں ایسے قیمتی نکات بیان کئے گئے ہیں کہ اس کا مطالعہ تصوف کی نوعیت کو سمجھنے کے لئے نہایت ضروری ہے۔ مولانا عبدالماجد صاحب نے اس خط نما مضمون کے نوٹ میں لکھا ہے: مولانا کا یہ مقالہ شریف اس قابل ہے کہ شروع سے آخر تک اسے غور وتوجہ سے پڑھا جائے۔ جو حقائق اس میں بیان کئے گئے ہیں، ان کے ذہن نشین ہوجانے سے، اس دور کے بہت سے فتنوں سے جو بڑے بڑے خوشنما اور دلکش ناموں کی آڑ میں برپا ہوتے رہتے ہیں، محفوظیت حاصل ہوسکتی ہے۔ دراصل یہ ایک خانگی مکتوب تھا، لیکن پڑھنے والے خود اس سے اتفاق کریں گے کہ اسے صدق کے بزم تک نہ پہونچانا، کیسا صریح ظلم وبخل ہوتا، عنوان دے کر اسے مضمون بنایا گیا، اس کی اہمیت متقاضی ہوئی کہ اسے تمام وکمال ایک ہی پرچہ میں دیا جائے۔ (۱۰ اپریل ۱۹۴۴ء) مضمون کی اہمیت کے پیش نظر اس کے ہم اہم اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ (محمد موسیٰ بھٹو)

"ہمارے پاس جو کچھ ہے، سب کار آمد ہے اور بعض چیزیں، اگر آج کار آمد نہیں ہیں تو کل ان کی ضرور ضرورت تھی۔ سب سے زیادہ بے کار چیز آج ہمارے پاس علم کلام کا قدیم ذخیرہ ہے۔ لیکن کیا جس طرح آج وہ بے کار ہے، کل بھی از کار رفتگی کا یہی حال تھا، قطعاً نہیں۔ علم کلام نصرت دین کا ایک سلبی پہلو ہے، جس زمانے میں دشمنوں نے جس راہ سے حملہ کیا، اسی راہ سے، ان پر مسلمان برس پڑے۔ انہی کی چیزیں لے کر، ان کے سر پر ماری۔ نعوذ باللہ اپنی جگہ ایجابی طور پر کوئی ادنیٰ مسلمان بھی ان مباحث سے کوئی دلچسپی رکھتا تھا۔ رازی، کلام کی کتابوں پر کتابیں لکھتے چلے گئے ہیں۔ لیکن ان کی زندگی کیا تھی، یہی نجم الدین کبریٰ کے نعلین نشینوں میں تھے۔ اور یہی حال اکثر اکابر کا تھا۔"

"صدیوں کی محنتوں کو اور وہ بھی مخلصین اسلام کی محنتوں کو اکارت قرار دینا

اور چند لمحوں میں فیصلہ کرنا، بڑی زود کاری ہے۔ آخر غزالی جن کی امامت وجلالت کی قدر صرف اس لئے نہیں ہے، کہ وہ خود بڑے تھے۔ بلکہ وہ اس لئے بھی ہے، کہ بڑے بڑوں نے قرنہا قرن سے ان کی پیشوائی پر مہرِ تصدیق ثبت کی ہے۔ ان کی باتوں پر اتنی آسانی کے ساتھ نکتہ چینی کرتے ہوئے گذر جانا کیا محل غور نہیں۔"

"یہ لوگ جو صوفیائے کرام کی عملی زندگی کے بعض حصوں پر نکتہ چینی کرتے ہیں، وہ اپنے سامنے تنقید کے وقت محض صحابہ کرام (رضوان اللہ اجمعین) کی زندگی ہی کو کیوں رکھتے ہیں، حالانکہ بہتر تو یہ تھا کہ صحابہ کرام کے ساتھ ساتھ وہ اس اسوۂ حسنہ کی روشنی کو بھی اوجھل ہونے نہ دیتے، جس کے متعلق "ولکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنہ" کا اعلان آسمان سے سن چکے ہیں، ان تمام مضامین اور کتابوں میں یہ امر بطور قدرِ مشترک کے پاتا ہوں کہ تصوف کی تنقید کے وقت صحابہ کرام کو تو رکھتے ہیں، لیکن خدا جانے ٹھیک اس وقت کیوں مربی اعظم، ہادی اعظم (رسول اللہ ﷺ) سے آنکھیں بند کرلی جاتی ہیں، حالانکہ اگر ہماری نظریں دونوں طرف ہوتیں، تو بہت کچھ غلط فہمیوں کا ازالہ ہوسکتا تھا۔ آپ خیال تو کیجئے کہ کتنی آسانی کے ساتھ چلہ کشی کی بدعت کی گیند اچھالی جاتی ہے، لیکن قطع نظر اس سے کہ خود "فبھداھم اقتدہ" کے قانون عائد کرنے والے قرآن نے موسیٰ علیہ السلام جیسی جلیل القدر پیغمبرانہ فطرت والی شخصیت کے لئے بھی "مناجات رب" کے مقام پر سرفراز ہونے کے لئے، اربعین (چلہ) کی میعاد مقرر کی، مانا کہ صوفیوں کی اربعین بے معنی سہی، ابلہی اور خودکشی سہی، لیکن قرآن کی اس اربعین کی کیا حکمت ہے۔"

"جانے دیجئے یہ تو ایک اسرائیلی قصہ ہوا، بیضاء میں اس کے منسوخ ہونے کی کوئی دلیل نہ بھی ہو، جب بھی اسرائیلیات کا چلتا ہوا فقرہ کہہ کر بآسانی ٹال دیا جا سکتا ہے۔ لیکن وحی قرآنی سے پیشتر کسی کو "حبب الیہ الخلاء" یہ خلوت کی تنہائی کیوں مرغوب کرائی گئی۔ یہ حراء اور اس کا سارا قصہ جو بخاری اور مسلم کے اصح

الاسانید سند کے ذریعے سے مروی ہے، کیا ہے؟ یہ تحنث اور تحنف کیا تھا؟ یہ چند خشک کلچے (خشک کھجوریں) لیکر، مکہ معظمہ سے چند میل دور وحوش وسباع والے بیابان کی پہاڑی میں مسلسل راتیں گذارنی، ایسی کالی پیلی راتوں کو دشتِ عرب کے کھوہ میں، اکیلے تن تنہا بسر کرنا کیا تھا؟ اور گو عام خیال یہی ہے کہ حرا کا جوار (چلہ کشی) ایک ہی دفعہ ہوا۔ لیکن ابن ہشام جب کہتے ہیں کہ "من کل سنۃ شھرا" (ہر سال میں ایک مہینہ حراء میں چلہ کشی فرماتے تھے) تو معاملہ سالوں تک پھیل جاتا ہے، اور اس کے انکار کی کوئی وجہ بھی نظر نہیں آتی۔

اف! "ہزار نکتہ باریکتر ز موازین جاست"

"پہاڑ کے کھوہ کی چلہ کشی سے غیبی ہستیوں کا ظہور، جیسا کہ محدث سہیلی نے تصحیح کی ہے کہ جبرئیل سے پہلے، آپ کو اسرائیل علیہ السلام کے ملکوتی وجود کا مکاشفہ مسلسل تین سال تک ہوتا رہا، اس کے بعد جبرئیلی وجود کا وہ مشہور ناسوتی ظہور، جسے سب جانتے ہیں، آخر یہ سب کیا ہے؟

حیرت ہے کہ مسکین صوفیوں کی "توجہ" ان کی "نظر" ان کے معانقے،" صرف خرافات خیال کئے جائیں، لیکن یہی جبرئیل علیہ السلام کا حراء میں سینے سے لپٹا لینا بھی، ایسا شدید کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

"حتیٰ ظننت انہ الموت" میں نے ایسا خیال آیا کہ گویا موت (طاری ہوگئی)۔

"امام بخاری یہ کیا روایت کررہے ہیں؟ کس کے متعلق کہہ رہے ہیں؟ سینہ سے سینہ لگانے اور دبانے کے پھر غط کی کیفیت کیا تھی؟ جس کے راوی بخاری نہیں تو ابن اسحاق اور طبری ہیں، کیا عرض کیا جائے، صوفی حبس دم کرے، تو اس کی گردن ماری جائے کہ یہ جوگ ہے، اشراق ہے، لیکن محدث جب غط کا ترجمہ حبس النفس (زرقانی ص ۲۴۶) سے کرے تو ان کا ٹوکنے والا کوئی نہیں، بلکہ طیالسی کی مشہور مسند

سے، اس کی تائید میں حدیث حراء کا یہ ٹکڑا پیش کیا جاتا ہے کہ غط کے بعد جبرئیل علیہ السلام کے متعلق آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں: "فاخذ بحلقی" (انہوں نے میرے حلق کو دبایا، یعنی سانس روک دی)، آخر سانس کے روکدینے کا کیا نفع؟ جب باطنی قویٰ کی بیداری یوں بھی حاصل ہوسکتی ہے؟" کیا ابن جوزی وعلی قاری کے یہ بھی موضوعات کی روایتیں ہیں۔"

"اور ایک چلہ کشی، خلوت، سمعی، بری، قلبی، مکاشفات، والہامات کیا، آنحضرت ﷺ کی زندگی میں ڈھونڈھیے، کیا چیز نہیں ملے گی، اس حراء کی وحی کے بعد، بخاری میں ہے کہ "فترۃ" ہوئی، یعنی وحی منقطع ہوئی تھی، لیکن اس کا اتنا اثر کہ سرور کائنات ﷺ اپنے کو پہاڑ کی چوٹی سے گرادینا، بہ نسبت جینے کے آسان خیال فرمانے لگے تھے، اور اس نیت سے چڑھ بھی چکے تھے، اگر یہ صحیح ہے تو بیچارے صوفیاء بھی اپنی قلبی کیفیت کی تعبیر بسط وکشاد سے کرتے ہیں اور کبھی قبض وبسط سے، کچھ فترہ ہی کا یہ گھٹا ٹا یا عکس وظل نہیں ہے۔ اف! کتنی ہنگامہ آرائیاں ہیں، مسائل لطائف واسرار پر، ایسے مولوی بھی اس کو سرزمین ہند کے جوگیوں کا سرقہ خیال کرنے لگے، جو سرہند امام الف ثانی کی امامت کے علمبردار ہیں، حالانکہ مجددیت ونقشبندیت کا سارا دارومدار ان ہی لطائف واسرار پر ہے۔ آج پوچھا جاتا ہے کہ دین میں اس کا کیا ثبوت ہے۔ سینہ کے مختلف مقامات اور اعضاء کی بعض دوسری جگہوں پر مختلف رنگوں کے نور کا دعویٰ کس بنیاد پر کیا جاتا ہے؟ یہ صوفی کہاں سے کہتے ہیں کہ انسانی اخلاق کے لنگر، ان ہی مرکزی مقامات کے ساتھ وابستہ ہیں، ان لطائف کی صفائی سے اخلاقی خصائل کے اندر اعتدال پیدا ہوجاتا ہے۔ ممکن ہے کہ صحابہ کی زندگی میں اس کی نظیر نہ ملے، لیکن شروع سے کہتا آرہا ہوں کہ دین کے لئے صرف صحابہ ہی کو کیوں، مربی اعظم اور ہادی اعظم کی زندگی بھی سامنے کیوں نہیں لائی جاتی؟ آخر بتایا جائے کہ واقعہ شق صدر کی کیا توجیہ ہے، خصوصا جب شاہ عبدالعزیز محدثؒ کی تحقیق

ہے کہ شق صدر کا واقعہ پانچ دفعہ پیش آیا اور لطائف واسرار بھی عند الاکثر پانچ ہی ہیں، ہے کوئی شرح وتوجیہ ہم مولویوں کے پاس اس واقعہ کی؟ سینہ چاک ہوا، قلب مبارک نکالا گیا، پھاڑا گیا، کچھ سیاہ سی چیز اس سے نکالی گئی، طشت زریں میں کوئی چیز برف کے مانند بھری تھی، جس سے قلب بھرا گیا، وہ خیروتابان وجود کیا تھا، جس سے قلب نبوت پر مہر کی گئی، اور اس کی ٹھنڈک آپ کو اس وقت تک محسوس ہوتی تھی، جب پچاس سال کی عمر کے بعد آپ اس واقعہ کو مدینہ کے اصحاب کے آگے دہراتے تھے؟ نہ خون نکلا، نہ ٹانکے لگے، نہ تکلیف ہوئی، اور یہ سب کچھ ہوگیا، اگر صوفی بیچارے لطائف واسرار کے اسرار ہم تک نہ پہونچاتے، تو شاید ہم اس کو کچھ خواب خیال ہی کہہ کر ٹالدیتے، یا کوئی نئے ابن جوزی پیدا ہوں، اور ابن حجر کے رجال کو سامنے رکھ کر، راویوں کے اگلے پچھلے ٹٹولنے، مگر کہاں تک جائیں گے۔ بالآخر واقعہ کا اکثر حصہ بخاری میں انہیں مل کر رہے گا۔ فاین المفر۔"

"کیا اس امت کے افراد کو صوفیاء کے مجاہدات اور ریاضات پر طعن کرنے کا کوئی حق ہے، جس کے رسول علیہ السلام کے پاؤں شکری عبادت میں پھول پھول جاتے تھے، سوچنا چاہئے کہ بات کہاں جا پہونچی، صوفی اس کے بعد اگر دربار رسالت میں کھڑے ہوکر چلانے لگیں:

یہ تو ایک راہ سے تجھکو بھی برا کہتے ہیں۔

تو آپ ہی بتائیے، ہم مولوی اس کا کیا جواب دے سکتے ہیں، تنہائی اور خلوت حاصل کرنے کے لئے جنگل اور بیابان میں جانے کا حکم نہ ہو، لیکن اگر مکانی خلوت پر اصرار بھی کیا گیا، تو زمانی خلوت کا کون انکار کرسکتا ہے، الصلوٰۃ باللیل والناس نیام (راتوں کو نمازیں پڑھنی جب ساری دنیا سوئی ہو، کیا افضل العمل نہیں ہے، مانا کہ سورۃ مزمل کی آخری آیتوں نے ابتدائی آیتوں کی فرضیت منسوخ کردی۔ لیکن کیا وجوب کا نسخ، اس کے مرتبت کے نسخ کو مستلزم ہے؟ تتجافی

جنوبهم عن المضاجع (ان کے پہلو خوابگاہوں سے الگ رہتے ہیں) یہ زمانی خلوت والوں کی تعریف نہیں ہے تو کس کی ہے، اور اس بات میں قرآن وحدیث سے کیا کچھ نہیں نکل رہا ہے۔ صوفی روتے ہیں تو مولوی ان پر ہنستے ہیں، حالانکہ عرفان حق کے بعد آنکھوں سے آنسوں کا نکلنا، کیا خود قرآن اس کی خبر نہیں دیتا، تری اعینهم تفیض من الدمع. ایمان و عرفان کی باتوں، حب اللہ، وحب الرسول کے جوش میں اگر ان کے جلوہ اور ان کی کھالوں میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے، اگر وہ "سجدا وبکیا" کا چیخ کر زمین پر گر پڑتے ہیں تو کیا قرآن ان گرنے والوں کی رفعت کا اعلان نہیں کرتا، صوفیوں کے اعداد صلاۃ، وتسبیحات پر اعتراض ہے، گن کر خدا کے ذکر کی عقلی ضرورت پوچھی جاتی ہے، لیکن غریب صوفیوں ہی سے پوچھی جاتی ہے، یا ان سے بھی پوچھتے ہیں، جن کی رکعتیں بھی گنی ہوئی ہیں، الا ان کی تسبیحات، تحمیدات، تکبیرات، تہلیلات، سب عددی، یہ عدد کیا چیز ہے، ریاضیات کو قرب الہی میں کیا دخل ہے، صوفی سے کیوں پوچھا جاتا ہے، مولوی صاحبان اس کی توجیہ کیا فرماتے ہیں؟ زہد، قناعت پر اعتراض ہے، اور کس کو اعتراض ہے، اس امت کو اعتراض ہے، جس کے رسول اللہ ﷺ کے متعلق صوفیوں کی کتاب میں نہیں، بلکہ صحیفہ ترمذی میں ہے کہ بطحا کی زمین پیش کی گئی، کہ سونا کردی جائے، لیکن جن پر پیش کی گئی انہوں نے فرمایا:

"لا یارب" "نہیں میرے رب۔"

"اجوع یوما" "ایک دن بھوکا رہوں گا۔"

"واطعم یوما" "ایک دن کھاؤں گا۔"

" جب حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوگیا، تو اس کے بعد آنحضرت ﷺ کا ذریعہ معاش قبل فتح خیبر کیا تھا، جو سن ۸ھ میں فتح ہوا، کیا آنحضرت ﷺ نے اپنی پیغمبرانہ عہد میں کوئی معاش کا ذریعہ اختیار کیا، کوئی کسب کیا،

کوئی نوکری کی؟ کیا گیا؟ آخر آپ کی زندگی کس طرح گذرتی تھی، حضرات مشائخ کرام رحمہم اللہ کی عملی زندگی کے سوا، اس کا جواب اور کیا ہوسکتا ہے، فقر تھا، فاقہ تھا اور اگر کسی صحابی نے کچھ بھیجدیا تو اسے بھی لے لیا، کیا آنحضرت ﷺ کی معاشی زندگی کی، بعد وفات خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کوئی اور تشریح ہوسکتی ہے۔ نبوت کے بعد آنحضرت ﷺ کی زندگی میں جہاں صوفیانہ معاش کا یہ بین ثبوت ملتا ہے، اسی کے ساتھ صبح سے شام تک دربار رسالت میں، حاجتیوں کا دعاء کے لئے آنا، لوگوں کا اپنے بچوں کو سامنے لانا، ان کے سر پر ہاتھ رکھوانا، ان کے لئے تحنیک (یعنی کھجور وغیرہ چبا کر آپ دیتے تھے اور تبرکا وہ لڑکوں کو چٹائی جاتی تھیں) آپ کی ایک ایک چیز کو تبریک بنا کر رکھنا، دور دور سے مہمانوں کا آنا، ان کے کھانے پینے کا انتظام کرنا، خود صحابہ سے ان کی نگرانی کرنی یا کرانی، کیا اسی سماں کو نہیں پیش کرتا، جو آج ہم اسلامی خانقاہوں میں دیکھتے ہیں یا دیکھتے تھے ...... اور ان کے حالات ہی کو اگر کوئی پڑھ لے تو صاف نظر آئے گا کہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرب کے شمال وجنوب سے لوگ ان ہی ضرورتوں سے جاتے تھے، جن ضرورتوں سے بزرگان طریقت کے پاس فوج در فوج دنیا چلی آرہی تھی۔"

مختصر یہ کہ ایمان وعمل صالح، تقویٰ، ایقان بالآخرۃ کی دولت تحریروں اور تقریروں سے باقی نہیں رہ سکتی، بلکہ اس کے لئے ہمیشہ عملی نمونوں کی ضرورت ہے، ہزارہا آدمیوں میں، جب کسی ایک کے اندر ہمالیہ کے برابر ایمان وایقان پیدا ہوتا ہے، تب جا کر عوام میں رائی کے دانہ برابر ایمان پہونچتا ہے، یقیناً نجات کے لئے خواہ وہ نجات ادنیٰ ہو یا بالآخر کبھی نہ کبھی ہو، رائی کے دانے برابر والا ایمان بھی کار آمد ہوجاتا ہے، لیکن ایک طرف قرب الہی، رفع مراتب، اور دوسری طرف خود عوام کے ایمان وعمل صالح، خواہ وہ کسی درجہ میں ہو، اس کے بقاء وقیام، نیز اس کو دوسری نسلوں تک جاری رکھنے کے لئے ہمیشہ اور ہر زمانہ میں اور ہر دس دس ہزار، بیس بیس

ہزار مسلمانوں کے لئے ضرورت ہے کہ ہم میں اللہ تعالیٰ کسی ایک دو کو پیغمبر اور رسول کی نمائندگی کے لئے منتخب فرمائے اور یہی لوگ جب منصب تبلیغ واصلاح پر آتے ہیں، تو ان کا نام کبھی شیخ، کبھی صوفی، کبھی پیر، کبھی کچھ، کبھی کچھ ہوا، ہوتا رہے گا، لیکن الفاظ بدلتے رہیں گے، حقیقت غیر مبتدلہ صرف یہی رہے گی کہ ان سے رسولؐ کی نمائندگی ہو رہی ہے، اب شیخ وقت سے جس قدر جس حد تک رسول اللہ ﷺ کی نمائندگی ظاہر ہوگی، اسی قدر اس کے مریدین ایمان وعمل میں آنحضرت ﷺ کے صحابہ کرام سے قریب ہوں گے اور جس حد تک وہاں شیخ نمائندگیٔ رسالت میں کمزور ہوگا، اس کے مرید بھی صحابہ کرامؓ کی جماعت سے دور ہوتے جائیں گے۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ چند آیتوں اور حدیثوں کو لے کر، جب رسالت کے نمائندے بھی مثقال ذرہ کے ایمان پر قناعت کرنے لگیں گے تو آپ ہی بتائیے کہ ان کے عوام اور مریدوں کے اندر ایمان کا کتنا حصہ باقی رہے گا اور اس کا بھی خدا نے بالآخر مشاہدہ کرا ہی دیا، جب سے دواء دل کے بیچنے والے اپنی دکانیں بڑھا کر چلدیئے، یہ حال ہے، امت مسلمہ کا، کیا ہم مولویوں کی انشائی تحریروں اور خطابی شعلہ بیانوں سے یہ اپنے اندر ایمان پا رہے ہیں؟ عمل صالح ان کے اندر پیدا ہو رہا ہے؟

(ماخوذ: ہفتہ روز صدق لکھنو ۲۱ نومبر ۳۳ء)

اہل تصوف کی دینی خدمات

اور مجاہدانہ کارنامے

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مفکر تھے، داعی تھے، عارف تھے، مصنف تھے، عصر حاضر میں اسلام واسلامیت کے لئے انہوں نے دعوت کے ہر محاذ پر خاص طور پر تصنیف وتالیف کے محاذ پر جو جہاد کیا، وہ بے مثال ہے۔ ان کے فکر اسلامی کی تشریح میں جو توازن واعتدال قائم ہے، اس متوازن فکر نے ہزار ہا افراد کو اسلامیت کی جدیدیت سے متاثر سلف صالحین سے متصادم اسلامی تشریح کی رو میں بہہ جانے سے بچایا، ساتھ ساتھ اسلام کے جامع تصور سے آشنا کیا، یہ ان کی ایسی خدمت ہے، جو ان کی ساری خدمتوں پر بھاری ہے، مولانا موصوف نے ساٹھ سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں۔ ہر کتاب اہمیت کی حامل ہے۔ زیر نظر کتاب میں شامل ان کے دو مضامین، ان کی ایک کتاب "تزکیہ واحسان یا تصوف وسلوک" سے لئے گئے ہیں۔ (مرتب)

دنیا میں بہت سی چیزیں، بعض خاص اسباب کی بنا پر بغیر علمی تنقید وتحقیق کے تسلیم کر لی جاتی ہیں، اور ان کو ایسی شہرت ومقبولیت حاصل ہوجاتی ہے کہ اگرچہ ان کی کوئی علمی بنیاد نہیں ہوتی، مگر خواص بھی ان کو زبان وقلم سے بے تکلف دہرانے لگتے ہیں۔

انہیں مشہورات بے اصل میں سے یہ بات بھی ہے کہ تصوف تعطل وبے عملی، حالات سے شکست خوردگی اور میدان جدوجہد سے فرار کا نام ہے، لیکن عقلی ونفسیاتی طور پر بھی اور عملی اور تاریخی حیثیت سے بھی، ہمیں اس دعوے کے خلاف مسلسل

طریقہ پر داخلی وخارجی شہادتیں ملتی ہیں۔

"سیرت سید احمد شہید" میں تزکیہ واصلاح باطن کے عنوان کے ماتحت خاکسار راقم نے حسب ذیل الفاظ لکھے تھے، جس میں آج بھی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، اور اس حقیقت پر پہلے سے زیادہ یقین پیدا ہوگیا ہے:

"یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ سرفروشی، وجاں بازی، جہاد وقربانی اور تجدید وانقلاب وفتح وتسخیر کے لئے، جس روحانی وقلبی قوت، جس وجاہت وشخصیت، جس اخلاق وللّٰہیت، جس جذب وکشش اور جس حوصلہ وہمت کی ضرورت ہے، وہ بسا اوقات روحانی ترقی، صفائی باطن، تہذیب نفس، ریاضت وعبادت کے بغیر نہیں پیدا ہوتی، اس لئے آپ دیکھیں گے کہ جنھوں نے اسلام میں مجددانہ یا مجاہدانہ کارنامے انجام دیئے ہیں، ان میں سے اکثر افراد روحانی حیثیت سے بلند مقام رکھتے تھے، ان آخری صدیوں پر نظر ڈالئے، امیر عبدالقادر الجزائری مجاہد جزائر، محمد احمد السوڈانی (مہدی سوڈانی) سید احمد شریف السنوسی (امام سنوسی) کو آپ اس میدان کا مرد پائیں گے، حضرت سید احمد ایک مجاہد قائد کے علاوہ اور اس سے پہلے ایک عزیز القدر روحانی پیشوا اور بے مثل شیخ الطریقت تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ مجاہدات وریاضات، تزکیۂ نفس، اور قرب الٰہی سے عشق الٰہی اور جذب وشوق کا جو مرتبہ حاصل ہوتا ہے، اس میں ہر رونگٹے سے یہی آواز آتی ہے:-

ہمارے پاس ہے کیا جو فدا کریں تجھ پر
مگر یہ زندگیء مستعار رکھتے ہیں

اس لئے روحانی ترقی اور کمال باطنی کا آخری لازمی نتیجہ شوق شہادت ہے، اور مجاہدے کی تکمیل جہاد ہے۔

نفسیاتی پہلو سے غور کیجئے گا تو معلوم ہوگا کہ یقین اور محبت ہی وہ شہپر ہیں،

جن سے جہاد وجدوجہد کا شہباز پرواز کرتا ہے، مرغوبات نفسانی، عادات، مالوفات، مادی مصالح ومنافع، اغراض وخواہشات کی پستیوں سے وہی شخص بلند ہوسکتا ہے، اور "لکنہ اخلد الیٰ الارض واتبع ھواہ" کے دام ہمرنگ زمین سے وہی شخص بچ سکتا ہے، جس میں کسی حقیقت کے یقین اور کسی مقصد کے عشق نے پارہ کی "تقدیر سیمابی" اور بجلیوں کی بیتابی پیدا کردی ہو۔

انسانی زندگی کا طویل ترین تجربہ ہے کہ محض معلومات وتحقیقات اور مجرد قوانین وضوابط، اور صرف نظم وضبط سرفروشی وجانبازی، بلکہ سہل ترا ایثار وقربانی کی طاقت وآمادگی پیدا کرنے کے لئے بھی کافی نہیں ہے، اس کے لئے اس سے کہیں زیادہ گہرے اور طاقتور تعلق اور ایک ایسی روحانی لالچ اور غیر مادی فائدے کے یقین کی ضرورت ہے کہ اس کے مقابلے میں زندگی بار دوش معلوم ہونے لگے، کسی ایسے ہی موقع اور حال میں کہنے والے نے کہا تھا۔

جان کی قیمت دیار عشق میں ہے کوئے دوست
اس نوید جاں فزا سے سروبال دوش ہے

اس لئے کم سے کم اسلام کی تاریخ میں ہر مجاہدانہ تحریک کے سرے پر، ایک ایسی شخصیت نظر آتی ہے، جس نے اپنے حلقۂ مجاہدین میں یقین ومحبت کی یہی روح پھونک دی تھی، اور اپنے یقین ومحبت کو سیکڑوں اور ہزاروں انسانوں تک منتقل کرکے، ان کے لئے تن آسانی اور راحت طلبی کی زندگی دشوار اور پامردی وشہادت کی موت آسان اور خوشگوار بنادی تھی اور ان کے لئے جینا، اتنا ہی مشکل ہوگیا تھا جتنا ...... دوسروں کے لئے مرنا مشکل تھا، یہی حلقہ وہ امام وقت ہے، جس کے متعلق اقبال مرحوم نے کہا ہے۔

ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق
جو تجھے حاضر موجود سے بیزار کرے
موت کے آئینہ میں تجھکو دکھا کر رخ دوست
زندگی اور بھی تیرے لئے دشوار کرے

دے کے احساس زیاں تیرا لہو گرما دے   فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

معمولی اور معتدل حالات میں قوموں کی قیادت کرنے والے، فتح ونصرت کی حالت میں لشکروں کو لڑانے والے ہر زمانے میں ہوتے ہیں، اس کے لئے کسی غیر معمولی یقین وشخصیت کی ضرورت نہیں، لیکن مایوس کن حالات، اور قومی احتضار کی کیفیات میں، صرف وہی مرد میدان حالات سے کش مکش کی طاقت رکھتے ہیں، جو اپنے خصوصی تعلق باللہ اور قوت ایمانی وروحانی کی وجہ سے خاص یقین وکیفیت عشق کے مالک ہوں، چنانچہ جب مسلمانوں کی تاریخ میں ایسے تاریک وقفے آئے، کہ ظاہری علم وخواس وقوت مقابلہ نے جواب دے دیا، اور حالات کی تبدیلی امر محال معلوم ہونے لگی، تو کوئی صاحبِ یقین وصاحب عشق میدان میں آیا، جس نے اپنی ''جرأت رندانہ'' اور ''کیفیت عاشقانہ'' سے زمانے کا بہتا ہوا دھارا بدل دیا اور اللہ تعالیٰ نے "یخرج الحی من المیت" اور "یحی الارض بعد موتھا" کا منظر دکھایا۔

تاتاریوں نے جب تمام عالم اسلام کو پامال کر کے رکھدیا، جلال الدین خوارزم شاہ کی واحد اسلامی سلطنت اور عباسی خلافت کا چراغ ہمیشہ کے لئے گل ہوگیا، تو تمام عالم اسلام پر یاس ومردنی چھا گئی، تاتاریوں کی شکست ناممکن الوقوع چیز سمجھی جانے لگی، اور یہ مثال زبان وادب کا جزو بن گئی، کہ "اذا قیل لک ان التتر انھزموا فلاتصدق" (اگر تم سے کوئی کہے کہ تاتاریوں نے شکست کھائی تو کبھی یقین نہ کرنا۔) اس وقت کچھ صاحبِ یقین اور صاحب قلوب مردان خدا تھے، جو مایوس نہیں ہوئے اور اپنے کام میں لگے رہے، یہاں تک کہ تاتاری سلاطین کو مسلمان کر کے، صنم خانہ سے کعبہ کے لئے پاسباں مہیا کر دیئے۔

ہندوستان میں اکبر کے دور میں ساری سلطنت کا رخ الحاد ولادینیت کی طرف ہوگیا، ہندوستان کا عظیم ترین بادشاہ ایک وسیع وطاقتور سلطنت کے پورے وسائل

وذخائر کے ساتھ، اسلام کا امتیازی رنگ مٹانا چاہتا تھا، اس کو اپنے وقت کے لائق ترین وذکی ترین افراد اس مقصد کی تکمیل کے لئے حاصل تھے، سلطنت میں ضعف وپیرانہ سالی کے کوئی آثار ظاہر نہ تھے کہ کسی فوجی انقلاب کی امید کی جاسکے، علم وظاہری قیاسات کسی خوشگوار تبدیلی کے امکان کی تائید نہیں کرتے تھے، اس وقت ایک درویش بے نوانے، تن تنہا اس انقلاب کا بیڑا اٹھایا اور اپنے یقین وایمان، عزم وتوکل، اور روحانیت وللّٰہیت سے سلطنت کے اندر ایک ایسا اندرونی انقلاب شروع کیا کہ سلطنت مغلیہ کا ہر جانشین اپنے پیشرو سے بہتر ہونے لگا، یہاں تک کہ اکبر کے تخت سلطنت پر بالآخر محی الدین اورنگ زیب نظر آیا، اس انقلاب کے بانی، امام طریقت حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی تھے۔

انیسویں صدی عیسوی میں جب عالم اسلام پر فرنگی ''تاتاریوں'' یا مجاہدین صلیب کی یورش ہوئی، تو ان کے مقابلہ میں عالم اسلام کے ہر گوشہ میں، جو مردان کار سر سے کفن باندھ کر میدان میں آئے، وہ اکثر وبیشتر شیوخ طریقت اور اصحاب سلسلہ بزرگ تھے، جن کے تزکیۂ نفس اور سلوک راہ نبوت نے ان میں دین کی حمیت، کفر کی نفرت، دنیا کی حقارت اور شہادت کی موت کی قیمت، دوسروں سے زیادہ پیدا کر دی تھی، الجزائر (مغرب) میں امیر عبدالقادر نے فرانسیسیوں کے خلاف علم جہاد بلند کیا، اور سنہ ۱۸۳۲ء سے سنہ ۱۸۴۷ء تک نہ خود چین سے بیٹھے، نہ فرانسیسیوں کو چین سے بیٹھنے دیا، مغربی مؤرخین نے ان کی شجاعت، عدل وانصاف، نرمی ومہربانی اور علمی قابلیت کی تعریف کی ہے۔

یہ مجاہد عملاً وذوقاً صوفی وشیخ طریقت تھے اور امیر شکیب ارسلان نے ان الفاظ میں ان کا ذکر کیا ہے:

وکان المرحوم الامیر عبدالقادر متضلعا من العلم والادب، سامی الفکر، راسخ القدم فی التصوف لایکتفی بہ نظرا حتی یمارسہ عملا

ولا يحن اليه شوقا حتى يعرفه ذوقا وله فى التصوف كتاب سماه (المواقف) فهو فى هذا المشرب من الافراد الافذ اذ ربما لا يوجد نظيره فى المتاخرين.

امیر عبدالقادر پورے عالم وادیب عالی دماغ اور بلند پایہ صوفی تھے، صرف نظری طور پر نہیں، بلکہ عملا اور ذوقا بھی صوفی تھے، تصوف میں ان کی ایک کتاب (المواقف) ہے، وہ اس سلسلہ کے یکتائے روزگار لوگوں میں تھے اور ممکن ہے کہ متاخرین میں ان کی نظیر دستیاب نہ ہو سکے۔

دمشق کے زمانۂ قیام کے معمولات واوقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وكان كل يوم يقوم الفجر ويصلى الصبح فى مسجد قريب من داره فى محلة العمارة لايتخلف عن ذالک الا لمرض وكان يتهجد الليل ويمارس فى رمضان المرياضة على طريقة الصوفية ومازال مثالا البر والتقوىٰ والاخلاق الفاضلة الى ان توفى رحمه الله.

روزانہ فجر کو اٹھتے، صبح کی نماز اپنے گھر کے قریب کی مسجد میں، جو محلہ العمارہ میں واقع ہے پڑھتے، سوائے بیماری کی حالت کے کبھی اس میں ناغہ نہ ہوتا، تہجد کے عادی تھے، اور رمضان میں حضرات صوفیہ کے طریقہ پر ریاضت کرتے، برابر سلوک وتقویٰ اور اخلاق فاضلانہ پر قائم رہتے ہوئے، سنہ ۱۸۸۳ء میں انتقال کیا۔

سنہ ۱۸۱۳ء میں جب طاغستان پر روسیوں کا تسلط ہوا، تو ان کا مقابلہ کرنے والے نقشبندی شیوخ تھے، جنہوں نے علم جہاد بلند کیا، اور اس کا مطالبہ اور جدوجہد کی کہ معاملات ومقدمات شریعت کے مطابق فیصل ہوں، اور قوم کی جاہلی عادات کو ترک کر دیا جائے، امیر شکیب ارسلان لکھتے ہیں:

وتولى كبر الثورة علماؤهم وشيوخ الطريقة النقشبندية المنتشرة هناك وكانهم سبقوا سائر المسلمين الى معرفة كون ضررهم هو من

امراء هم الذين اكثرهم يبيعون حقوق الامة بلقب ملك اوامير وتبوء كرسى وسرير ورفع علم كاذب ولذة فارغة باعطاء اوسمة ومراتب فثار وامتد ذالک الوقت على الامراء وعلى الروسية حاميتهم وطلبوا ان تكون المعاملات وفقا لاصول الشريعة الا للعادات القديمة الباقية من جاهلية اولئک الاقوام وكان زعيم تلک الحركة غازى محمد الذى يلقبه الروس بقاضى ملا وكان من العلماء المبتحرين فى العلوم العربية وله تاليف فى وجوب نبذ تلک العادات القديمة المخالفة للشرع اسمه "اقامة البرهان علىٰ ارتداد عرفاء طاغستان."

اس جہاد کے علمبردار، طاغستان کے علماء اور طریقۂ نقشبندیہ کے (جو طاغستان میں پھیلا ہوا ہے) شیوخ تھے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس حقیقت کو عام مسلمانوں سے پہلے سمجھ لیا تھا کہ اصل نقصان حکام سے پہونچتا ہے، جو خطابات، عہدہ واقتدار، جھوٹی قیادت وسرداری، عیش ولذت اور تمغوں اور مرتبوں کی لالچ میں قوم فروشی کا ارتکاب کرتے ہیں، یہ سمجھ کر انہوں نے ملکی حکام اور ان کے حامی روسیوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، اور اس کا مطالبہ کیا کہ معاملات کا فیصلہ شریعت مطہرہ کے مطابق ہو، نہ کہ قوم کے قدیم جاہلی عادات کے، اس تحریک کے قائد غازی محمد تھے، جن کو روسی غازی ملا کے لقب سے یاد کرتے ہیں، وہ علوم عربیہ میں بلند پایہ رکھتے تھے، ان جاہلی عادات کے ترک کرنے کے بارے میں ان کی ایک تصنیف (اقامة البرهان علیٰ ارتداد عرفاء طاغستان) (طاغستان کے چودھریوں اور برادری کے سرداروں کے ارتداد کا ثبوت) ہے۔

۱۸۳۲ء میں غازی محمد شہید ہوئے، ان کے جانشین حمزہ بے ہوئے، اس کے بعد شیخ شامل نے مجاہدین کی قیادت سنبھالی، جو بقول امیر شکیب "امیر عبدالقادر الجزائری کے طرز پر تھے، اور مشیخت سے امارت ہاتھ میں لی تھی۔"

شیخ شامل نے ۲۵ برس تک روس سے مقابلہ جاری رکھا، اور مختلف معرکوں میں
ان پر زبردست فتح حاصل کی، روسی ان کی شوکت اور شجاعت سے مرعوب تھے، اور
چند مقامات کو چھوڑ کر سارے ملک سے بیدخل ہوگئے تھے، ۱۸۴۳ء اور ۱۸۴۴ء میں
شیخ نے، ان کے سارے قلعے فتح کر لئے اور بڑا جنگی سامان مال غنیمت میں حا
صل کیا، اس وقت حکومت روس نے اپنی پوری توجہ داغستان کی طرف مبذول کی،
داغستان میں جنگ کرنے کے لئے باقاعدہ دعوت دی، شعراء نے نظمیں لکھیں اور
پے درپے فوجیں روانہ کی گئیں، شیخ شامل نے اس کے باوجود مزید دس برس تک
جنگ جاری رکھی، بالآخر ۱۸۵۹ء میں اس مجاہد عظیم نے ہتھیار ڈال دیئے۔

تصوف وجہاد کی جامعیت کی درخشاں مثال، سیدی احمد الشریف السنوسی کی
ہے، اطالیوں نے برقہ وطرابلس کے فتح کے لئے پندرہ دن کا اندازہ لگایا تھا،
آبادیوں اور بادیوں کی جنگ کا تجربہ رکھنے والے انگریز قائدین نے اس پر تنقید کی
اور کہا کہ یہ اطالویوں کی ناتجربہ کاری ہے، اس مہم میں ممکن ہے، تین مہینے لگ
جائیں، لیکن نہ پندرہ دن، نہ تین مہینے، اس جنگ میں پورے تیرہ برس لگ گئے، اور
اطالوی پھر بھی اس علاقہ کو مکمل طریقہ پر سر نہ کر سکے، یہ سنوسی درویشوں اور ان کے
شیخ طریقت سیدی احمد الشریف السنوسی کی مجاہدانہ جدوجہد تھی، جس نے اطالیہ کو
پندرہ سال تک اس علاقے میں قدم جمانے نہیں دیا، امیر شکیب ارسلان نے لکھا ہے
کہ سنوسیوں کے کارنامہ نے ثابت کردیا کہ طریقۂ سنوسیہ ایک پوری حکومت کا نام
ہے، بلکہ بہت سی حکومتیں بھی ان جنگی وسائل کی مالک نہیں ہیں، جو سنوسی رکھتے ہیں،
خود سیدی احمد الشریف کے متعلق ان کے الفاظ ہیں:

**وقد لحظت منه صبرا قل ان يوجد في غيره من الرجال و عزما
شديد اتلواج سيماء ه على وجهه فبينما هو في تقواه من الابدال اذا هو في
شجاعة من الابطال.**

مجھے سید سنوسی میں غیر معمولی صبر وثابت قدمی دکھائی دی، جو کم لوگوں میں
دیکھی، اولوالعزمی ان کے ناصیۂ اقبال سے ہویدا ہے، ایک طرف اپنے تقوی اور
عبادت کے لحاظ سے اگر وہ اپنے زمانے کے ابدال میں شمار ہونے کے قابل ہیں، تو
دوسری طرف شجاعت کے لحاظ سے دلیران زمانہ کی صف میں شامل ہونے کے مستحق
ہیں۔

امیر شکیب نے صحراء اعظم افریقہ کی سنوسی خانقاہ کی جو تصویر کھینچی ہے، وہ بڑی
دل آویز اور سبق آموز ہے، یہ خانقاہ ''واحۃ الکفرہ'' میں واقع تھی، اور سیدی احمد
الشریف کے چچا اور شیخ، السید المہدی کے انتظام میں تھی۔ اور افریقہ کا سب سے بڑا
روحانی مرکز اور جہاد کا دار التربیت تھی، امیر مرحوم لکھتے ہیں:

''سید مہدی صحابہ وتابعین کے نقش قدم پر تھے، وہ عبادت کے ساتھ بڑے
عملی آدمی تھے، ان کو معلوم تھا کہ قرآنی احکام حکومت واقتدار کے بغیر نافذ نہیں
ہوسکتے، اس لئے وہ اپنے برادران طریقت اور مریدین کو ہمیشہ شہسواری، نشانہ بازی
کی مشق کی تاکید کرتے رہتے، ان میں غیرت اور مستعدی کی روح پھونکتے، ان کو
گھوڑ دوڑ اور سپہ گری کا شوق دلاتے رہتے، اور جہاد کی فضیلت واہمیت کا نقش ان
کے دل پر قائم کرتے، ان کی یہ کوششیں بارآور ہوئیں، اور مختلف مواقع پر اس کے
اچھے نتائج برآمد ہوئے، خصوصاً جنگ طرابلس میں سنوسیوں نے ثابت کردیا کہ ان
کے پاس ایسی مادی قوت ہے، جو بڑی بڑی حکومتوں کی طاقت سے ٹکر لے سکتی ہے،
اور بڑی باجبروت سلطنتوں کا مقابلہ کر سکتی ہے، صرف جنگ طرابلس ہی میں سنوسیوں
کا جوش وغضب ظاہر نہیں ہوا، بلکہ علاقۂ کانم اور وادی (سوڈان) میں وہ ۱۳۱۹ھ
سے ۱۳۳۲ھ تک فرانسیسیوں سے برسر جنگ رہے۔

سیدی احمد الشریف نے مجھے سنایا کہ ان کے چچا سید مہدی کے پاس، پچاس
پچاس ذاتی بندوقیں تھیں، جن کو وہ بڑے اہتمام کے ساتھ اپنے ہاتھ سے صاف

کرتے اور پوچھتے تھے، اگرچہ ان کے سیکڑوں کی تعداد میں مریدین تھے، مگر وہ اس
کے روادار نہیں تھے کہ یہ کام کوئی اور کرے، تاکہ لوگ ان کی اقتدا کریں، اور جہاد
کی اہمیت کو سمجھیں اور اس کے سامان و ذخائر کا اہتمام کریں، جمعہ کا دن جنگی مشقوں
کے لئے مخصوص تھا، گھوڑوں کی ریس ہوتی، نشانہ کی مشق ہوتی وغیرہ وغیرہ، خود سید
ایک بلند جگہ پر تشریف فرما ہوتے، شہسوار دو حصوں (پارٹیوں) میں تقسیم ہوجاتے،
اور دوڑ شروع ہوتی، یہ سلسلہ دن چھپے تک جاری رہتا، کبھی کبھی نشانہ مقرر ہوتا، اور
نشانہ بازی شروع ہوتی، اس وقت علماء اور مریدین کا نمبر نشانہ بازی میں بڑھا ہوتا،
کیونکہ ان کے شیخ کی ان کے لئے خاص تاکید تھی، جو لوگ گھوڑ دوڑ میں پالا جیت
لیتے یا نشانہ بازی میں بازی لے جاتے، ان کو قیمتی انعامات ملتے، تاکہ [illegible] کمالات
کا شوق ہو، جمعرات کا دن دستکاری اور اپنے ہاتھ سے کام کرنے کے لئے مقرر تھا،
اس دن اسباق بند ہوجاتے، مختلف پیشوں اور صنعتوں میں لوگ مشغول ہوتے، کہیں
تعمیر کا کام ہورہا ہوتا، کہیں بخاری، کہیں لوہاری، کہیں پارچہ بافی، کہیں وراقی کا
مشغلہ نظر آتا، اس دن جو شخص نظر آتا وہ اپنے ہاتھ سے کام کرتا دکھائی دیتا، خود سید
مہدی بھی پورے مشغول رہتے، تاکہ لوگوں کو عمل کا شوق ہو، سید مہدی اور ان سے
پہلے ان کے والد ماجد کو زراعت اور درخت لگانے کا بڑا اہتمام تھا، اس کا ثبوت ان
کی خانقاہیں، اور ان کے خانہ باغ ہیں، کوئی سنوسی خانقاہ ایسی نہیں ملے گی، جس کے
ساتھ ایک یا چند باغات نہ ہوں، وہ نئے نئے قسم کے درخت دور دراز مقامات سے
اپنے شہروں میں منگواتے تھے، انہوں نے کفرہ اور میں ایسی ایسی زراعتیں اور درخت
روشناس کئے، جن کو وہاں کوئی جانتا بھی نہ تھا، بعض طلباء سید محمد السنوسی (بانی سلسلۂ
سنوسیہ) سے کیمیا سکھانے کی درخواست کرتے تھے، تو وہ فرماتے تھے کہ "کیمیا ہل
کے نیچے ہے، اور کبھی فرماتے "کیمیا کیا ہے، ہاتھ کی محنت اور پیشانی کا پسینہ" وہ
طلباء اور مریدین کو پیشوں اور صنعتوں کا شوق دلاتے، اور ایسے جملے فرماتے، جن

سے ان کی ہمت افزائی ہوتی اور وہ اپنے پیشوں اور صنعتوں کو حقیر نہ سمجھتے، اور نہ ان
میں علماء کے مقابلہ میں احساس کمتری پیدا ہوتا، چنانچہ فرماتے تھے کہ بس تم کو حسن
نیت اور فرائض کی پابندی کافی ہے، دوسرے تم سے افضل نہیں، کبھی کبھی اپنے کو بھی
پیشہ وروں میں شامل کرکے، اور ان کے ساتھ کام میں شرکت کرتے ہوئے فرماتے:
"کیا یہ کاغذوں والے (علماء) اور تسبیحوں والے (ذاکرین وصوفیہ) سمجھتے ہیں کہ ہم
اللہ تعالیٰ کے یہاں سبقت لے جائیں گے، نہیں خدا کی قسم وہ ہم سے کبھی سبقت
نہیں لے جاسکتے۔"

عالم اسلام پر سید جلال الدین افغانی" کی شخصیت ودعوت نے جو اثر ڈالا ہے،
وہ کسی صاحب نظر سے مخفی نہیں، بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ نئی دنیائے اسلام کے
معماروں میں ہیں، سید جمال الدین افغانی" سرتاپا دعوت وعمل اور ایک شعلۂ جوالہ
تھے، جس نے افغانستان سے لے کر ترکی تک، تمام عالم اسلام میں حمیت سلامی کی
روح اور اتحاد اسلامی کا صور پھونکا، یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے، کہ ان کا
سوز دروں اور گرمی نفس میں اور ان کی بے چین طبیعت اور مسلسل جدوجہد میں،
ان کے ذکر قلبی اور باطنی بیداری کو بھی دخل ہے، جس کے بغیر اکثر آدمی مسلسل محنت
اور مخالفتوں اور [illegible] حالات کا ہمیشہ مقابلہ نہیں کرسکتا، یہی حال ان کے شاگرد
رشید اور دست راست شیخ محمد عبدہ کا ہے، جو تصوف کے لذت آشنا اور اس کوچہ سے
واقف تھے۔

معاصر دینی تحریکوں میں الاخوان المسلمون کی تحریک، سب سے زیادہ طاقتور
اور منظم تحریک ہے، اور عالم عربی کے لئے تو وہ احیائے دین اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ
کی واحد تحریک ہے، اس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا زندگی سے پورا ربط ہے،
اور ممالک عربیہ کی عمومی زندگی پر اس نے بڑا گہرا اور محسوس اثر ڈالا ہے، اس کے
بانی شیخ حسن البناء مرحوم کی شخصیت بڑی مؤثر، دل آویز اور ہمہ گیر شخصیت تھی، وہ

سرتاپا عمل اور مجسم جدوجہد تھے، نہ تھکنے والے، نہ مایوس ہونے والے، نہ پست ہونے والے سپاہی اور داعی تھے، ان کی ان خصوصیات میں، ان کے روحانی نشوونما اور سلوک کو بڑا دخل ہے، وہ جیسا کہ انہوں نے اپنی خودنوشت سوانح میں تصریح کی ہے، طریقہ حصافیہ شاذلیہ میں بیعت تھے اور باقاعدہ اس کے اذکار واشغال ن ورزش کی تھی، ان کے خواص اور معتمدین نے بیان کیا کہ وہ زندگی کے آخری مصروف ترین دنوں میں بھی اپنے اورادو معمولات کے پابند رہے، اخوان کی پانچویں مؤتمر ۱۳۵۷ھ میں، انہوں نے اخوان کی تحریک کا تذکرہ کرتے ہوئے، اس کی تعریف میں حسب ذیل جملے کہے تھے:

دعوة سلفية وطريقة سنية وحقيقة صوفية وهيئة سياسية وجماعة رياضية، رابطة علمية، ثقافية وشركة اقتصادية وفكرة اجتماعية.

ایک ایسی جماعت جس میں سلف کی دعوت، اہل سنت کا طریقہ، تصوف کی حقیقت، سیاست، ورزش علم وثقافت، اقتصادی تعاون اور اجتماعی فکر جمع ہیں۔

ہندوستان میں تصوف وجہاد کا ایسا عجیب امتزاج واجتماع ملتا ہے، جس کی نظیر دور دور ملنی مشکل ہے، اس سلسلہ میں حضرت سید احمد شہیدؒ کا تذکرہ تحصیل حاصل ہے کہ ان کی یہ جامعیت مسلمات میں سے ہے، اور حدتواتر کو پہونچ چکی ہے، ان کے رفقاء جہاد اور ان کے تربیت یافتہ اشخاص کے جوش جہاد، شوق شہادت، محبت دینی، بغض فی اللہ کے واقعات قرون اولیٰ کی یاد تازہ کرتے ہیں، جب کبھی ان کے مفصل واقعات سامنے آئیں گے، تو اندازہ ہوگا کہ یہ قرن اول کا ایک بچا ہوا ایمانی جھونکا تھا، جو تیرھویں صدی میں چلا تھا، اور جس نے دکھا دیا تھا کہ ایمان، توحید اور صحیح تعلق باللہ اور راہ نبوت کی تربیت وسلوک میں کتنی قوت اور کیسی تاثیر ہے، اور بغیر صحیح روحانیت اور اصلاح کے پختہ جوش وجذبہ، اور ایثار وقربانی اور جاں سپاری کی امید غلط ہے۔

سید صاحب کے جانشینوں میں مولانا سید نصیر الدین اور مولانا ولایت علی عظیم آبادی، سید صاحبؒ کے پرتو تھے، ان کے جانشینوں میں مولانا یحییٰ علی اور مولانا احمد اللہ صادق پوری بھی دونوں حیثیتوں کے جامع تھے، ایک طرف ان کے جہاد وابتلاء اور امتحان کے واقعات امام احمد بن حنبل کی یاد تازہ کرتے ہیں، اور وہ کبھی گھوڑے کی پیٹھ پر، کبھی انبالہ کے پھانسی گھر میں، کبھی جزیرۂ انڈمان میں محبوس نظر آتے ہیں، دوسرے وقت وہ سلسلۂ مجددیہ وسلسلۂ محمدیہ (سید صاحب کے خصوصی سلسلہ) میں لوگوں کی تربیت وتعلیم میں مشغول دکھائی دیتے ہیں۔

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق
ہر ہوسناکے نداند جام وسندان باختن

ہندوستان کی پوری اسلامی تاریخ کی مجاہدانہ جدوجہد اور قربانیاں اگر ایک پلڑے میں رکھی جائیں اور اہل صادق پور کی جدوجہد اور قربانیاں دوسرے پلڑے پر تو شاید یہی پلڑا بھاری رہے۔

ان حضرات کے بعد بھی ہم کو اہل سلسلہ اور اصحاب ارشاد، دینی جدوجہد اور جہاد فی سبیل اللہ کے کام سے فارغ اور گوشہ گیر نہیں نظر آتے، شاملی کے میدان میں حضرت حاجی امداد اللہ، حضرت حافظ ضامن، مولانا محمد قاسم اور مولانا رشید احمد گنگوہی رحمتہ اللہ علیہم، انگریزوں کے خلاف صف آرا نظر آتے ہیں، حضرت حافظ ضامن وہیں شہید ہوتے ہیں، حاجی صاحب کو ہندوستان سے ہجرت کرنی پڑتی ہے، مولانا نانوتوی اور مولانا گنگوہی کو عرصہ تک گوشہ نشین اور مستور رہنا پڑتا ہے۔

پھر مولانا محمود حسن دیوبندی رحمتہ اللہ علیہ (جن کو ہندوستان کے مسلمانوں نے بجا طور پر شیخ الہند کے لقب سے یاد کیا) انگریزوں کے خلاف جہاد کی تیاری کرتے ہیں، اور ہندوستان کو ان کے وجود سے پاک کرکے، ایک ایسی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں، جس میں مسلمانوں کا اقتدار اعلیٰ اور ان کے ہاتھ میں ملک کی زمام

کار ہو، ان کی بلند ہمتی ان کو ترکی سے تعلقات قائم کرنے اور ہندوستان وافغانستان وترکی کو ایک سلسلۂ جہاد میں منسلک کرنے پر آمادہ کرتی ہے، ریشمی خطوط اور انور پاشا کی ملاقات، مالٹہ کی اسارت ان کی عالی ہمتی اور قوت عمل کا ثبوت ہے۔

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا

ان مسلسل تاریخی شہادتوں کی موجودگی میں، یہ کہنا کہاں تک صحیح ہوگا کہ تعطل وبے عملی، حالات کے مقابلہ میں سپر اندازی اور پسپائی تصوف کے لوازم میں سے ہے، اگر اس دعوے کے ثبوت میں چند متصوفین اور اصحاب طریقت کی مثالیں ہیں، تو اس کے خلاف بڑی تعداد میں ان ائمہ فن اور شیوخ طریقت کی مثالیں ہیں، جو اپنے مقام اور رسوخ فی الطریقہ میں بھی، اول الذکر اصحاب سے بڑھے ہوئے ہیں۔

اگر تصوف اپنی صحیح روح اور سلوک راہ نبوت کے مطابق ہو، اور یقین ومحبت پیدا ہونے کا باعث ہو (جو اس کے اہم ترین مقاصد ونتائج ہیں) تو اس سے قوت عمل، جذبۂ جہاد، عالی ہمتی، جفاکشی، اور شوق شہادت پیدا ہونا لازمی ہے، جب محبت الٰہی کا چشمہ دل سے ابلے گا، تو روئیں روئیں سے یہ صدا بلند ہوگی۔

اے آنکہ زنی دم از محبت ۔۔۔ از ہستیٔ خویشتن پرہیز؛
برخیز وبہ تیغ تیز بنشین ۔۔۔ یا از رہ دوست برخیز

(ماخوذ: تزکیہ واحسان یا تصوف وسلوک)

ہندوستان میں صوفیاء کرام کا کردار

اور معاشرہ پر ان کے اثرات

ہندوستان تصوف کا ایک مرکز ومنبع

تصوف کے مشہور اور مرکزی سلسلے، اگرچہ ہندوستان سے باہر پیدا ہوئے، لیکن ان کو سب سے زیادہ فروغ اور مقبولیت (ہندوستان کے مخصوص حالات اور ہندوستان کے ضمیر ومزاج کی وجہ سے) ہندوستان ہی میں حاصل ہوئی، ان سلاسل تصوف میں بعض ایسی ہندوستانی شاخیں پیدا ہوئیں، جنہوں نے خود مستقل سلاسل کی، اور جداگانہ طریق سلوک وتربیت کی شکل اختیار کرلی، اور ان میں بعض ایسے مجتہد اور مجدد فن پیدا ہوئے، جن کی حیثیت ایک مستقل سلسلہ کے بانی اور امام کی ہے، مشہور سلاسل تصوف طریقۂ قادریہ، طریقۂ چشتیہ، طریقۂ نقشبندیہ، طریقۂ سہروردیہ کے علاوہ، جنھوں نے ہندوستان آکر بڑی ترقی کی، اور نئے برگ وبار لائے، ایسے طریق سلاسل بھی ہیں، جو خاص ہندوستان ہی کی پیداوار ہیں، اور ان کا انتساب ان شخصیتوں کی طرف ہے، جو ہندوستان ہی میں پیدا ہوئیں، اور ان کے مشائخ یہیں آسودۂ خاک ہیں، مثلاً طریقۂ مداریہ، طریقۂ قلندریہ، طریقۂ شطاریہ، اور طریقۂ مجددیہ جو ہندوستان ہی میں پیدا ہوئے اور ہندوستان ہی سے باہر گئے۔

گیارہویں صدی سے، تقریباً ہندوستان ہی تصوف اور اصلاح باطنی کا علمبردار نظر آتا ہے، اسی صدی میں امام ربانی شیخ احمد سرہندیؒ اور ان کے صاحبزادے اور جانشین خواجہ معصومؒ سے ایک عالم نے استفادہ کیا۔ خواجہ محمد معصومؒ کے خلفاء ہندوستان سے باہر افغانستان، ایران وترکستان میں پھیلے ہوئے تھے، تیرہویں صدی

کے سلسلۂ مجددیہ کے شیخ حضرت شاہ غلام علی دہلویؒ کی خانقاہ میں روم، شام، بغداد، مصر، چین، اور حبش، سمرقند وبخارا تک کے لوگ استفادہ کے لئے آتے تھے، ان کے خلیفہ مولانا خالد رومیؒ کے ذریعہ یہ سلسلہ عراق، شام، کردستان اور ترکی میں پھیل گیا، اور ابھی تک ان ممالک میں یہ سلسلہ موجود ہے۔ چودھویں صدی کے شروع میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کی ذات شیخ العرب والعجم کے لقب سے مشہور ہوئی، اور ان سے اہل حجاز اور حجاز میں آنے والے کثیر التعداد حجاج نے فیض اٹھایا، اس وقت پورے عالم اسلام میں ہندوستان ہی کی بدولت اصلاح باطن کی یہ شمع روشن ہے، اور عشق الٰہی کے سودے کی یہ دوکان قائم ہے، اور اس کو اب بھی اس فن کے بعض کاملین اور مخلصین کی موجودگی سے اس فن میں عالمی مرکزیت حاصل ہے، اور وہی اس فن کے طالبین وشائقین کا واحد مرجع ہے۔

تصوف اور صوفیا سے لوگوں کا تعلق اور رجوع عام

ہندوستان میں مسلمانوں کے دور کا آغاز صوفیاء کرام ہی کی ذات سے ہوا، خاص طور پر حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے مخلص اور پرزور ہاتھوں سے یہاں چشتی سلسلہ کی مضبوط بنیاد پڑی۔ اس کے بعد سے خواص وعوام، شاہ ورعیت سبھی نے ان بے غرض اور پاک نفس درویشوں اور مردان خدا سے اپنی عقیدت ومحبت کا اظہار کیا، اور اس برعظیم کے ایک گوشہ سے لے کر دوسرے گوشہ تک خانقاہوں اور روحانی مرکزوں کا ایک جال بچھ گیا، مرکزی شہروں کو چھوڑ کر مشکل سے کوئی قابل ذکر قصبہ اور مقام اس سے محروم رہا۔

لوگوں کو ان بزرگوں اور ان کی خانقاہوں سے جو والہانہ عقیدت اور قلبی تعلق تھا، اور ان کی طرف رجوع کی جو کیفیت تھی، اس کا ہلکا سا اندازہ ان اعداد وواقعات سے ہوسکتا ہے، جو بغیر کسی ترتیب کے یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

حضرت سید آدم بنوریؒ (متوفی سنہ ۱۰۵۳ھ) کی خانقاہ میں ایک ایک ہزار

آدمی روزانہ ہوتے تھے، جو دونوں وقت خانقاہ میں کھانا کھاتے تھے، ان کی سواری کے ساتھ ہزاروں آدمی اور سیکڑوں علماء ہوتے تھے، "تذکرۂ آدمیہ" میں ہے کہ سنہ ۱۰۵۲ھ میں جب آپ لاہور تشریف لے گئے تو سادات ومشائخ اور دوسرے طبقوں کے دس ہزار آدمی آپ کے ہمرکاب تھے، طالبین کا اتنا مجمع ہر وقت رہتا تھا کہ شاہجہان کو ان کی طرف سے خطرہ پیدا ہوگیا تھا، اس نے کچھ رقم بھیج کر کہلوایا کہ آپ پر حج فرض ہوگیا ہے، آپ حرمین تشریف لے جائیں، چنانچہ آپ ہندوستان سے ہجرت کر گئے۔

مجدد صاحب کے نامور خلیفہ اور صاحبزادے حضرت خواجہ محمد معصوم (م سنہ ۱۰۷۹ھ) کے ہاتھ پر ۹ لاکھ انسانوں نے بیعت وتوبہ کی اور سات ہزار آدمی خلافت سے مشرف ہوئے۔

سرسید احمد خاں مرحوم "آثار الصنادید" میں حضرت شاہ غلام علیؒ کے متعلق لکھتے ہیں۔

"حضرت کی خانقاہ میں پانچ سو سے کم فقیر نہیں رہتے تھے، اور سب کا روٹی کپڑا آپ کے ذمہ تھا۔"

تیرھویں صدی کے مشہور مصلح اور شیخ طریقت حضرت سید احمد شہیدؒ کی طرف لوگوں کے رجوع اور اہل طلب کے ہجوم کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے اصلاحی دوروں اور سفر حج کے سلسلے میں، جن مقامات سے گذرے، پورے پورے شہروں میں تھوڑے آدمی ایسے ہوں گے، جو توبہ وبیعت سے محروم رہ گئے ہوں، الہ آباد، مرزا پور، بنارس، غازی پور، عظیم آباد پٹنہ اور کلکتہ میں مجموعی اعتبار سے کئی لاکھ مسلمانوں نے بیعت وتوبہ کی، دین کی عمومی اہمیت اور طلب کا اندازہ اس سے ہوگا کہ بنارس میں ہسپتال کے مریضوں نے پیغام بھیجا کہ ہم معذور ہیں، وہاں تک ہمارا آنا دشوار ہے، اگر آپ للہ فی اللہ یہاں تشریف ارزانی فرمائیں تو ہم بیعت کریں، کلکتہ میں دو

مہینے قیام رہا، روزانہ ایک ہزار آدمی کے قریب بیعت سے مشرف ہوتے، اور روز
بروز ہجوم بڑھتا جاتا تھا، کثرت بیعت کا یہ حال تھا کہ صبح سے دوڈھائی پہر رات گئے
تک، مردوں اور عورتوں کا ہجوم رہتا، سید صاحب کو سوائے نماز پڑھنے اور کھانا
کھانے اور ضروریات بشری کے کچھ فرصت نہ ملتی، علیحدہ علیحدہ ایک ایک شخص سے
بیعت لینا محال تھا، ایک وسیع مکان میں سب جمع ہوجاتے، آپ تشریف لاتے،
سات آٹھ دستاریں کھول کر، آپ لوگوں کے ہاتھ میں دے دیتے، لوگ ان کو جابجا
سے تھام لیتے، اور آپ بیعت کے الفاظ کو اذان کی طرح بلند آواز سے تلقین
فرماتے، دن میں سترہ اٹھارہ بار یہی عمل ہوتا۔

زندگی اور معاشرہ پر اثر

یہ مشائخ ان لوگوں سے، جو ان کے ہاتھ پر بیعت کرتے تھے، تمام گناہوں
سے توبہ لیتے تھے، خدا کی اطاعت اور رسول کی تابعداری کا عہد لیتے تھے، بے جا ظلم
اور بداخلاقی ظلم وزیادتی، حقوق العباد کی پامالی سے بچنے کی تاکید فرماتے، اچھے اخلاق
اختیار کرنے، اور اخلاق رذیلہ (حسد، کینہ، تکبر، حب مال، حب جاہ) کے ازالہ اور
اصلاح کی طرف توجہ دلاتے تھے، خدا کی یاد اور اس کی مخلوق کے ساتھ خیر خواہی اور
خدمت اور لوگوں کو نفع پہونچانے اور ایثار وقناعت کی تعلیم دیتے تھے، اس بیعت کے
علاوہ جو عام طور پر ایک خصوصی اور گہرے تعلق کا ذریعہ ہوتی تھی، وہ تمام آنے
جانے والوں کو وعظ ونصیحت کرتے تھے، ان کے اخلاص واخلاق اور ان کی تعلیم
وتربیت، اور صحبت کا جو اثر عام زندگی اور معاشرہ پر ہوتا تھا، اس کا ایک نمونہ یہاں
پیش کیا جاتا ہے، ہندوستان کا مشہور مؤرخ قاضی ضیاء الدین برنی عہد علائی کا تذکرہ
کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"سلطان علاء الدین کے زمانے کے مشائخ میں سے سجادۂ تصوف شیخ الاسلام
نظام الدین، شیخ الاسلام علاء الدین اور شیخ الاسلام رکن الدین سے آراستہ تھا، ایک

دنیا ان کے انفاس متبرکہ سے روشن ہوئی، اور ایک عالم نے ان کی بیعت کا ہاتھ پکڑا،
اور ان کی مدد سے گنہگاروں نے توبہ کی، اور ہزاروں بدکاروں اور بے نمازیوں نے
بدکاری سے ہاتھ اٹھالیا، اور ہمیشہ کے لئے پابند نماز ہوگئے، اور باطنی طور پر دینی
مشغلہ کی طرف رغبت ظاہر کی، اور ان کی توبہ صحیح ہوگئی، عبادات لازمہ اور متعدیہ کا
معمول ہوگیا، دنیا کی حرص ومحبت (جو انسانوں کے فوائد اور فرمانبرداری کی بنیاد ہے)
ان مشائخ کے اخلاق حمیدہ اور ترک وتجرد کے معاملہ کو دیکھنے سے دلوں سے کم ہوگئی،
ان بزرگوں کی عبادات ومعاملات کی برکت سے لوگوں میں سچائی پیدا ہوگئی، ان کے
مکارم اخلاق، ریاضات ومجاہدات کے اثر سے اللہ والوں کے دلوں میں اخلاق کے
بدلنے کی خواہش پیدا ہوئی۔" آگے چل کر لکھتا ہے:

"عہد علائی کے آخری چند سالوں میں شراب، معشوق، فسق وفجور، جوا، فحاشی
وغیرہ کا نام اکثر آدمیوں کے زبانوں پر نہیں آنے پایا، بڑے بڑے گناہ لوگوں کے
نزدیک کفر کے مشابہ معلوم ہونے لگتے تھے، مسلمان ایک دوسرے کے شرم سے سود
خوری اور ذخیرہ اندوزی کے کھلم کھلا مرتکب نہیں ہوسکتے تھے، بازار والوں کے جھوٹ
بولنے، کم تولنے، اور آمیزش کرنے کا رواج اٹھ گیا تھا۔"

"مشائخ طریقت اپنے نئے مریدین کو معاملات کی صفائی، حق داروں کے
حقوق کے تصفیہ اور ان کے ذمہ کسی کے مطالبات یا بقایاجات تھیں تو اس کی ادائیگی
کی شدید تاکید کرتے تھے، سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء کو بھی ان کے شیخ
خواجہ فرید الدین گنج شکر نے تاکید فرمائی تھی کہ "مخالفین کو خوش کرنے اور اہل حقوق
کو راضی کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرنا، ان کے ذمہ ایک شخص کے ۲۰
جیتل باقی تھے، اور ایک شخص سے انہوں نے ایک کتاب مستعار لی تھی، وہ کھوگئی تھی،
جب وہ دہلی آئے تو پہلے شخص کے پاس قرض ادا کرنے گئے، اس نے کہا کہ معلوم
ہوتا ہے کہ تم مسلمانوں کی پاس سے آرہے ہو، دوسرے شخص کے پاس گئے تو اس

نے کہا کہ "ہاں تم جہاں سے آرہے ہو وہاں کا نتیجہ یہی ہونا چاہئے۔"

ان مشائخ کی تربیت وصحبت سے بلا تفریق مذہب وملت، وامتیاز یگانہ وبیگانہ خدمت اور راحت رسانی کا جذبہ اور ذوق پیدا ہوتا تھا، حضرت سید احمد شہیدؒ اپنے کثیر التعداد رفقاء کے ساتھ سفر حج کو جارہے تھے، تو اس طویل وپر مشقت سفر میں جہاں ضرورت پڑتی، اور خدمت کا کوئی موقع آتا، اس سے دریغ نہ کرتے، یہ سفر دریائے گنگا کے راستہ کشتیوں سے ہورہا تھا، مرزاپور کے گھاٹ پر روئی سے لدی ہوئی ایک ناؤ کھڑی تھی، روئی کا مالک مزدوروں کا منتظر تھا کہ اس روئی کو لاد کر گودام لے جائے، سید صاحب نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ روئی کے گٹھے اتار لو، صدہا آدمی اس کشتی سے لپٹ گئے، اور دو گھڑی کے عرصہ میں ناؤ خالی کرکے روئی گودام کے دروازے پر پہنچادی، لوگ یہ حال دیکھ کر متحیر ہوگئے، اور آپس میں کہنے لگے یہ لوگ تو عجیب طرح کے ہیں کہ روئی والے سے نہ جان نہ پہچان، بے مزدوری للہ فی اللہ اس کا اتنا کام کردیا، بے شک یہ لوگ اللہ والے ہیں۔"

تسلسل کے ساتھ ان مشائخ کرام کے اثرات کا تذکرہ بہت دشوار ہے، اس کے لئے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے، ہندوستان میں صحت مند، صاحب ضمیر معاشرہ تعمیر کرنے میں (جو اس ملک کی سب سے بڑی اخلاقی طاقت، بے غرض خادمان خلق اور نیک نفس حکام کا سرچشمہ رہی ہے، اور جس نے ہر نازک موقع پر ہندوستان کو لائق افراد فراہم کئے ہیں۔) ان بے لوث مصلحین اور معلمین اخلاق کا سب سے بڑا اور مرکزی حصہ ہے، درمیان کی صدیوں کو ہم چھوڑ کر، جن کا وسیع مواد مشائخ طریقت کے تذکروں میں منتشر ہے، ہم تیرہویں صدی کے صرف ایک روحانی پیشوا حضرت سید احمد شہیدؒ کے دینی واخلاقی اثرات کا تذکرہ بطور مثال کے پیش کرتے ہیں، سید صاحب کے سفر حج کا تذکرہ کرتے ہوئے مورخ لکھتا ہے۔

"کلکتہ میں یک لخت شراب بکنی موقوف ہوگئی، دوکانداروں نے جاکر سرکار

انگریزی میں اس کا شکوہ کیا کہ ہم لوگ سرکاری محصول بلا عذر ادا کرتے ہیں، اور دوکانیں ہماری بند ہیں، جب سے ایک بزرگ اپنے قافلہ کے ساتھ اس شہر میں آئے ہیں، شہر اور دیہات کے تمام مسلمان ان کے مرید ہوئے، اور ہر روز ہوتے جاتے ہیں، انہوں نے کل مسکرات (نشہ آور چیزوں) سے توبہ کی ہے، اب کوئی ہماری دوکانوں کی طرف ہوکر بھی نہیں نکلتا۔"

اس وسیع ملک کی آبادی کی، جس کثیر تعداد کو ان مشائخ طریقت اور روحانی معلمین کے تعلق اور ان کی اصلاحی کوششوں نے نیک راستے پر لگایا، اور بداخلاقیوں اور بداعمالیوں سے مجتنب رکھا، وہ صرف انہیں کے اخلاق وروحانیت کا نتیجہ تھا، دنیا کی کوئی حکومت، کوئی ادارہ، کوئی قانون، نہ اتنی بڑی تعداد کو متاثر کرسکتا ہے، اور نہ دائمی طور پر اخلاق واصول کے دائرہ میں رکھ سکتا ہے۔

بے رعبی اور حق گوئی

ان روحانی معلمین کی ایک بڑی خدمت اور کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے مطلق العنان سلاطین اور جابر بادشاہوں کے غلط اور خطرناک رجحانات اور بے اعتدالیوں کا مقابلہ کیا، ان کے منہ پر کلمہ حق کہہ کر اور ان سے اختلاف ظاہر کرکے، حکومت اور معاشرہ کو بعض خطرناک نتائج اور تباہی سے بچالیا، ان کی تربیت اور عملی مثالوں نے لوگوں میں ہمت اور حوصلہ اور بے خوفی وشجاعت پیدا کی، ہندوستان کے اسلامی دور کی پوری تاریخ ان مثالوں سے معمور ہوئی ہے کہ ان مشائخ اور ان کے خلفاء نے سر سے کفن باندھ کر اور اپنی زندگی سے ہاتھ دھوکر "افضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر" (جابر بادشاہ کے مقابلہ میں حق بات کہنا افضل ترین جہاد ہے) پر عمل کیا، یہاں پر صرف محمد تغلق کے عہد کے دو واقعات نقل کئے جاتے ہیں۔

شیخ قطب الدین منور محمد تغلق کے عہد کے ایک گوشہ نشین چشتی بزرگ تھے، بادشاہ ان کے علاقہ کے پاس سے گذرا اور انہوں نے سلام کے لئے حاضری نہیں

دی، بادشاہ نے ان کو دہلی طلب کیا، انہوں نے جب ایوان شاہی کی دہلیز پر قدم
رکھا، تو امراء وملوک اور نقیب وچاؤش دورویہ کھڑے تھے، ان کے صاحبزادے نور
الدین کم عمر تھے، انہوں نے کبھی بادشاہوں کی بارگاہ نہیں دیکھی تھی، ان پر ہیبت سی
طاری ہوئی، شیخ قطب الدین منور نے ان سے پکار کر کہا، بابا نور الدین "العظمة
للہ" صاحبزادے کا بیان ہے کہ یہ سنتے ہی میرے اندر ایک قوت پیدا ہوگئی، سارا
رعب جاتا رہا، اور جو امراء وملوک وہاں کھڑے تھے، وہ مجھے بالکل بکریوں کی طرح
معلوم ہونے لگے، بادشاہ نے شکوہ کیا کہ میں آپ کے جوار میں پہنچا، آپ نے
میری کوئی تربیت نہ فرمائی، اور اپنی ملاقات سے عزت نہ بخشی، شیخ نے فرمایا کہ یہ
درویش اپنے کو اس کا اہل نہیں سمجھتا کہ بادشاہوں سے ملاقات کرے، ایک کونہ میں
پڑا ہوا، بادشاہ اور اہل اسلام کی دعا گوئی میں مصروف ہے، اس کو معذور سمجھا جائے،
ان کی ملاقات کے بعد بادشاہ نے ایک امیر سے کہا کہ مجھے جن بزرگوں سے مصافحہ
کا اتفاق ہوا ہے، جس نے مجھ سے ہاتھ ملایا، اس کے ہاتھ میں کپکپی تھی، لیکن شیخ
منور نے اتنی مضبوطی سے مصافحہ کیا کہ ان پر ذرا اثر نہیں معلوم ہوتا تھا، بادشاہ نے
ان کی خدمت میں ایک لاکھ تنکہ پیش کیا، شیخ نے فرمایا کہ سبحان اللہ! درویش کو تو
دوسیر چاول دال اور ایک پیسہ کا گھی کافی ہے، وہ ان ہزاروں روپیوں کو کیا کرے گا،
بڑی کوششوں اور حیلوں سے یہ کہہ کر کہ بادشاہ درپے آزار ہوجائے گا، آپ نے
دوہزار تنکے قبول کئے، اور وہ بھی اپنے برادران طریقت اور اہل حاجت میں تقسیم
کرکے واپس چلے آئے۔

دوسرا واقعہ مولانا فخر الدین زرادی کا ہے، مولانا کو سلطان کی ملاقات سے
بہت اجتناب تھا، کئی بار فرمایا کہ میں اپنے سر کو اس شخص کے دربار میں کٹا ہوا اور پڑا
ہوا دیکھتا ہوں، یعنی میں کلمۂ حق کہنے سے باز نہیں رہوں گا، اور یہ شخص مجھے معاف
نہیں کریگا، آخر ایک مرتبہ دربار میں مجلس ہوئی، سلطان نے کہا کہ ہمیں کچھ نصیحت

کیجئے، مولانا نے فرمایا غصہ دبایئے، سلطان نے کہا کون سا غصہ، مولانا نے فرمایا
درندوں والا غصہ اس پر سلطان کا چہرہ تمتما گیا، لیکن کچھ کہا نہیں، خاصہ شاہی طلب کیا
گیا، سلطان نے اپنے پیالہ میں مولانا کو شریک کیا، اور اپنے ہاتھ سے بعض لقمے
دیئے، مولانا نے بڑی ناگواری کے ساتھ کھانا کھایا، سلطان نے اس کے بعد مولانا کو
رخصت کیا۔

ان مشائخ نے شخصی سلطنت کے ہر دور میں اپنی بے غرضی، بے خوفی، اور حق
گوئی کی روایت قائم رکھی، اور جبکہ سلاطین نے حق گو علماء تک کو معاف نہیں کیا،
انہوں نے عام حالات میں ان درویشوں کی خصوصی رعایت کی اور ان کو اپنا فرض
انجام دینے کی اجازت دی، دہلی کے آخری دور میں بھی مشائخ نے اپنی خودداری،
خودشناسی ہاتھ سے جانے نہیں دی، شاہ عالم ایک مرتبہ خواجہ میر درد کی محفل سماع میں
حاضر ہوئے "چونکہ پاؤں میں درد تھا، ضبط نہ کرسکے، ذرا پاؤں پھیلا دیا خواجہ
صاحب اس بے ادبی کے متحمل نہ ہو سکے، فرمایا، یہ امر فقیر کی آداب محفل کے خلاف
ہے، بادشاہ نے عذر کیا اور معافی چاہی، خواجہ صاحب نے فرمایا اگر طبیعت ناساز تھی
تو تکلیف کرنا کیا ضروری تھی۔"

زہد واستغناء

ان صوفیائے کرام نے سلطنت کے عہدوں، امراء اور اہل دولت کے گراں
قدر پیش کشوں اور زمین وجائیداد کے قبول کرنے سے اکثر پرہیز کیا، اور زہد واستغناء،
قناعت وتوکل، اور خودداری وخودشناسی کی اعلیٰ روایت قائم رکھی، جس نے ہندوستان
کے معاشرہ میں کردار کی مضبوطی، بلند ہمتی اور بلند نظری کے اوصاف اور عناصر کو زندہ
رکھا اور انسانیت کی آبرو کو سودوزیاں کے اس بازار میں، جس میں انسانوں کا سودا ہوا
کرتا تھا، ہمیشہ قائم ومحفوظ رکھا، ان کا اصول زندگی اور اعلان یہ تھا۔

من دلق خود بافسر شاہاں نمی دہم — من فقر خود بملک سلیماں نمی دہم
از رنج فقر در دلے گنجے کہ یافتم — ایں رنج را براحت شاہاں نمی دہم

(میں اپنی گدڑی بادشاہوں کے تاج کے عوض میں دینے کو تیار نہیں ہوں، میں اپنا فقر سلطنت سلیماں کے بدلے میں نہیں دے سکتا، فقر کی مشقت سے میں نے دل میں جو خزانہ پایا، اس مشقت کو میں بادشاہوں کے آرام کے عوض دینے کو تیار نہیں ہوں)۔

ہندوستان کے فقر وتصوف کی تاریخ، زہد واستغنا، خودداری وخودشناسی اور ایثار وقربانی کے حیرت انگیز واقعات سے لبریز ہے، اور ان مثالوں سے کسی سلسلۂ طریقت، اور کسی خانوادۂ تصوف کی تاریخ خالی نہیں، ہم یہاں صرف آخری دو، تیرھویں وچودھویں صدی کے چند واقعات نقل کرتے ہیں، جو اس دور سے تعلق رکھتے ہیں، جس میں مادیت اپنے قدم جما چکی تھی۔

سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کے ایک بزرگ حضرت مرزا جان جاناں دہلویؒ تھے، جن کی وفات سے قبل بادشاہ دہلی نے پیغام بھیجا کہ اللہ نے اتنی بڑی سلطنت مجھے عطا کی ہے، آپ اس میں سے کچھ قبول فرمالیں، فرمایا۔ اللہ تعالیٰ تو ہفت اقلیم کو "متاع الدنیا قلیل" فرماتا ہے، پھر ایک اقلیم میں سے ایک ولایت آپ کے حصے میں آئی ہے، وہ کتنی ہے کہ فقیر اس کی طرف طمع کا ہاتھ بڑھائے۔ نواب آصف جاہ نے ایک بار بیس ہزار روپیہ نذر کیا، آپ نے قبول نہیں فرمایا، تو انہوں نے کہا لے کر محتاجوں کو بانٹ دیجئے، فرمایا کہ مجھکو اس کا سلیقہ نہیں، یہاں سے نکل کر بانٹتے چلے جائیے، گھر تک پہونچتے تقسیم ہوجائے گا، نہ ہوتو وہاں ہوجائے گا۔

حضرت شاہ غلام علی صاحب دہلویؒ کو نواب میر خاں والی ریاست ٹونک نے ان کی خانقاہ کے سالانہ مصارف کے لئے کچھ مقرر کرنا چاہا، تو ان کو لکھدیا گیا کہ۔

ما آبروئے فقر وقناعت نمی بریم — بامیر خاں بگوئے کہ روزی مقدر است

(ہم فقر وقناعت کی بے آبروئی نہیں کرتے، نواب میر خاں سے کہدو کہ روزی مقدر ہے)۔

مولانا فضل رحمان گنج مراد آبادیؒ (متوفی سنہ ۱۳۱۳ھ) کے پاس ایک بار کوئی انگریز حاکم آیا ہوا تھا، اس نے حضرت کی اخلاقی تقریر سے خوش ہوکر کہا، اگر آپ فرمائیں تو آپ کی خانقاہ کے لئے گورنمنٹ سے کچھ مقرر کرادیں، آپ نے فرمایا کہ:

میں تمہاری گورنمنٹ کا پیسہ لے کر کیا کروں گا، خدا کے فضل سے ایک رسی کی بنی ہوئی چارپائی، اور دو لوٹے مٹی کے اور دو گھڑے مٹی کے موجود ہیں، اور بعض مرید ہمارے باجرہ لے آتے ہیں، اس کی روٹی ہوجاتی ہے، بی بی صاحبہ کچھ دال یا ساگ پکادیتی ہیں، اس سے لگا کر کھالیتے ہیں۔

مولوی محب اللہ صاحب کا بیان ہے کہ نواب کلب علی خاں، والی ریاست رامپور نے خواہش ظاہر کی کہ حضرت مولانا فضل رحمان محدث رامپورؒ ہمارے یہاں تشریف لادیں، اس پر مولوی صاحب نے نواب صاحب سے پوچھا کہ ان کے لئے کیا نذر کریں گے؟ نواب صاحب نے کہا کہ لاکھ روپیہ، مولوی صاحب کی خدمت میں پیش کروں گا۔ مولوی محب اللہ خان صاحب مراد آباد پہونچے اور عرض کیا کہ رامپور تشریف لے چلئے، نواب کلب علی خاں آپ کے بہت مشتاق ہیں، اور لاکھ روپیہ نذر کریں گے، آپ جس طرح سے بات کر رہے تھے کرتے رہے، اور اس حکایت کو معمولی بات کی طرح ٹال دیا اور فرمایا: میاں لاکھ روپیہ پر خاک ڈالو اور بات سنو۔

جو ہم دل پہ اس کا کرم دیکھتے ہیں
تو دل کو بہ از جام جم دیکھتے ہیں

اشاعت علم

ہندوستان کے صوفیاء کرام ہمیشہ علم کے سرپرست اور پشت پناہ رہے، ان میں سے اکثر وبیشتر اعلیٰ علمی، ادبی ذوق رکھتے تھے اور ان کا روز اول سے یہ عقیدہ تھا۔

کہ بے علم نتواں خدا را شناخت

اور یہ کہ جاہل صوفی بازیچہ، شیطان ہوتا ہے۔ اسی بنا پر انہوں نے بڑے بڑے عالی استعداد وطالبین کو اس وقت تک اجازت نہیں دی، جب تک کہ انہوں نے اپنی علمی تکمیل نہیں کر لی۔ ہندوستان کی تعلیمی تحریک اور یہاں کی علمی چہل پہل بالواسطہ اور بلا واسطہ مشائخ طریقت کی سرپرستی وہمت افزائی کا نتیجہ ہے۔ آٹھویں صدی میں ہندوستان کے دو زبردست عالم اور جہاں استاد قاضی عبدالمقتدر کندی اور شیخ احمد تھانیسری، حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی سے وابستہ تھے، گیارہویں صدی کے مشہور مدرس مولانا جمال الاولیاء کوروی جن کے تلامذہ اور شاگردوں کے شاگردوں سے درس وتدریس کا ہنگامہ تیرہویں صدی تک گرم رہا، ایک بلند پایہ شیخ طریقت تھے، بیشتر دوروں میں خانقاہ ومدرسہ لازم وملزوم رہے، جون پور کی خانقاہ رشیدیہ ٹیلے والی مسجد میں مولانا شاہ پیر محمد صاحب کا مدرسہ، دہلی میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی درسگاہ اور گنگوہ میں مولانا رشید احمد صاحب کی خانقاہ اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

پرورش خلائق

ان مشائخ اور ان کی خانقاہوں کے ذریعہ ہزاروں بندگان خدا کی حاجت براری ہوتی، کتنے خاندانوں اور گھروں میں ان کی وجہ سے چراغ جلتا اور چولھا گرم ہوتا، کتنے خدا کے بندے ان خانقاہوں میں آکر پیٹ بھر کھانا کھاتے اور انواع واقسام کی لذتوں کا مزہ اٹھاتے، فقیروں کا یہ شاہی دسترخوان ایک خوان یغما تھا، جس

پر دوست ودشمن، یگانہ وبیگانہ، امیر وغریب شہری وپردیسی کی کوئی قید نہیں تھی، خواجہ نظام الدین اولیاء کا دسترخوان اپنی وسعت اور تکلفات کے لئے ضرب المثل تھا، گیارھویں صدی کے ایک مجددی شیخ، شیخ سیف الدین سرہندی کی خانقاہ میں ایک ہزار چار سو آدمی، دونوں وقت اپنی فرمائش اور خواہش کے موافق کھانا کھاتے تھے، اسی صدی کے اواخر اور بارھویں صدی کے آغاز میں، ایک چشتی شیخ سید محمد سعید عرف شاہ بھیک تھے، ان کے متعلق ان کے سوانح نگار لکھتے ہیں کہ ان کی خانقاہ میں ذاکرین وشاغلین کی تعداد ابتدائی زمانہ میں پانچ سو سے کم نہیں تھی، اسی قدر مجمع آنے جانے والوں میں سے تقریبا ایک ہزار انسان، دونوں وقت ان کے یہاں کھانا کھاتے تھے، ایک مرتبہ روشن الدولہ (فرخ سیر کے سہ ہزاری امیر) نے ستر ہزار روپیہ خانقاہ کی تعمیر کے لئے نذر گذارا، ارشاد ہوا کہ بالفعل اس کو ایک جگہ چھوڑ دیں اور آرام فرمائیں، سہ پھر کو معماروں کو طلب کر کے عمارت کی تیاری شروع ہوگی، روشن الدولہ آرام کرنے چلا گیا، شاہ بھیک صاحب نے درویشوں کو طلب کیا اور ساری رقم انبالہ اور تھانیسر، سرہندو پانی پت کی بیوہ عورتوں، محتاجوں اور مسکینوں کے گھروں پر تقسیم کر دی، اور ایک حبہ بھی باقی نہ چھوڑا، روشن الدولہ سہ پہر کو آئے تو فرمایا کہ خانقاہ کی تعمیر سے یہ ثواب کہاں ملتا، جو ان بیکسوں اور گوشہ نشینوں کی خدمت سے ملا، فقیر کو بلند عمارت سے کیا کام۔ ایک مرتبہ بادشاہ محمد فرخ سیر، نواب روشن الدولہ اور نواب عبداللہ خاں کے عرائض اور تین لاکھ کی رقم کی ہنڈیاں آئیں، آپ کے حکم سے قرب وجوار کے قصبات اور شرفاء کی آبادیوں میں سب تقسیم کرا دیا گیا، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے بالکل صحیح لکھا ہے۔

"غریبوں اور امیروں کے درمیان صوفیائے اسلام کی یہی خانقاہیں درمیانی کڑی کا کام دیتی تھیں، ان بزرگوں کا دربار وہ دربار تھا، جہاں سلاطین بھی خراج داخل کرتے تھے، خود سلطان المشائخ کا کیا حال تھا، گذر چکا کہ ولی عہد سلطنت خضر

خاں تک اسی دربار کا حلقہ بگوش تھا، علاء الدین جو سارے ہندوستان سے خراج وصول کرتا تھا، لیکن ایک خزانہ وہ بھی تھا، جس میں اسے بھی مال گذاری داخل کرنی پڑتی تھی، ...... یہی خانقاہیں تھیں، جن کے ذریعہ سے ملک کے عام غرباء وفقراء تک ان کا حصہ پہونچ جاتا تھا، اور یہی مطلب ہے، اس مشہور فقرہ کا کہ "مال صوفی سبیل است۔"

غربت وامارت کا یہ سنگم، یعنی صوفیۂ صافی کا یہ طبقہ جہاں امراء وغرباء دونوں ایک حیثیت سے حاضر ہوتے تھے، اس سے غریب محتاج مسلمانوں کی کتنی حاجت روائیاں ہوتی تھیں، واقعہ یہ ہے کہ اسلامی عہد کا کوئی زمانہ اور ان دنوں ہندوستان کا شاید ہی کوئی صوبہ، کوئی علاقہ ایسا ہوگا، جہاں:

توخذ من اغنیاء هم وترد علی فقراء هم.

ان کے دولت مندوں سے لیا جائے، اور ان کے ضرورت مندوں کو پہونچا دیا جائے۔

کے فرمان نبوی کی تعمیل میں ارباب صدق وصفا کا یہ طبقہ مشغول نہ تھا، خصوصا جن بزرگوں کا کسی خاص وجہ سے امراء وارباب ثروت پر اثر قائم ہوجاتا تھا، یا یوں کہیے کہ غرباء کی قسمت جاگ اٹھتی تھی۔"

انسانیت کی پناہ گاہیں

ان صوفیائے کرام کی تعلیم وصحبت سے لوگوں میں انسانوں سے بلا تفریق مذہب وملت، وبلا تخصیص نسل ونسب، محبت کرنے، ان کی خدمت کرنے اور ان کے درد اور دکھ کو دور کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا، ان کا اس ارشاد نبوی پر ایمان بھی تھا اور عمل بھی کہ "الخلق عیال الله فاوجهم الی الله انفعهم لعیاله "مخلوق خدا کا کنبہ ہے، خدا کو اپنے بندوں میں سب سے زیادہ محبوب وہ ہے، جو اس کے کنبہ کے سب سے زیادہ کام آنے والا ہے، وہ ساری دنیا کے غم خوار تھے، اور بجا طور پر کہہ سکتے تھے

کہ۔

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء نے ایک مرتبہ اپنا حال بیان کیا کہ جو شخص میرے پاس آتا ہے، اور اپنا حال مجھ سے بیان کرتا ہے، اس سے دو چند فکر وتردد وغم والم مجھے ہوتا ہے، ایک مرتبہ فرمایا "قیامت کے بازار میں کسی سودے کی اتنی قیمت اور پوچھ گچھ نہ ہوگی، جتنی دلداری اور دل خوش کرنے کی۔"

اس کا نتیجہ تھا کہ شکستہ دلوں کو ان خانقاہوں میں پناہ بھی ملتی تھی، اور دل کا مرہم بھی، ان مشائخ کی آغوش شفقت ان مشائخ کے لئے کھلی ہوئی تھی، جن کو حکومت یا سوسائٹی یا خاندان نے اپنے دائرہ سے نکالدیا تھا، یا اقبال نے ان سے منہ موڑ لیا تھا، جن کو اعزہ واقارب اور بعض اوقات اولاد تک جواب دے دیتی، وہ ان بزرگوں کے قدموں میں آکر پڑجاتے اور گھر کا سارا آرام اٹھاتے، ہر مذہب کا آدمی یہاں اپنے دل کی بے چینی اور دماغ کی الجھن دور کرتا، اور غذا اور دوا، محبت اور قدر سب کچھ پاتا، خواجہ نظام الدین اولیاء کو جب ان کے شیخ نے دہلی کی طرف رخصت کیا تو فرمایا کہ "تم ایک سایہ دار درخت ہوگے، جس کے سایہ میں اللہ کی مخلوق آرام پائے گی۔" چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ ستر برس تک دہلی اور دور دراز کے گوشوں سے آنے والوں نے اس درخت کی گھنی چھاؤں میں آرام کیا، ان صوفیاء کرام کی بدولت ہندوستان کے صدہا مقامات پر ایسے "سایہ دار درخت" موجود تھے، جن کی چھاؤں میں تھکے ہارے مسافر اور بھولے بھٹکے قافلے آرام پاتے تھے، اور نئی زندگی اور تازگی حاصل کرتے تھے۔ (ماخوذ تزکیہ واحسان یا تصوف وسلوک)

"ان دونوں بزرگوں کی عظمت پہلے سے بھی کچھ دل میں تھی، اور اب حضرت کے اس ارشاد سے اور زیادہ ہوگئی، لیکن چونکہ مجھ میں یہ طلب یہیں پیدا ہوئی ہے، اس لئے میں تو اس راستے میں حضرت ہی سے رہنمائی حاصل کرنا اپنے لئے بہتر سمجھتا ہوں۔"

موصوف نے اپنی محبت و شفقت کے پورے اظہار کے ساتھ ایک یا دو دفعہ پھر انہی دونوں بزرگوں کا حوالہ دیا، لیکن جب میں نے ادب کے ساتھ اپنی ہی رائے پر اصرار کیا تو قبول فرمایا اور میری مصروفیتوں کا پورا لحاظ فرماتے ہوئے، ذکر وغیرہ کا بہت مختصر سا پروگرام تجویز فرمایا اور میں نے کرنا شروع کر دیا۔

اس کے بعد میں غالباً چار پانچ دن وہاں اور مقیم رہا، جب اجازت لیکر رخصت ہونے لگا تو خاص اہتمام سے فرمایا کہ:

"حضرت دہلوی (یعنی مولانا محمد الیاسؒ) کی خدمت میں ضرور جایا کریں اور کچھ قیام کریں۔"

اس موقعہ پر مولانا موصوفؒ کے متعلق بہت بلند کلمات بھی ارشاد فرمائے اور حقیقت یہ ہے کہ ان بلند کلمات ہی نے مجھے اس مشورہ کی تعمیل پر آمادہ کیا اور جیسا کہ مولانا مرحومؒ کے ملفوظات کے مقدمہ میں لکھ چکا ہوں، اس کے بعد ہی میں نے مولانا موصوفؒ کی شخصیت کو کچھ جانا اور کچھ عرصہ کے بعد میں یہ بھی سمجھ سکا کہ مولانا کی خدمت میں حاضری کا اتنے اہتمام سے مجھے کیوں مشورہ دیا گیا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ خانقاہیت اور خانقاہی مشاغل اور اہل خانقاہ سے جو مجھے بعد تھا اس میں اچھا خاصا دخل میرے اس احساس کو بھی تھا کہ ان حلقوں میں دین کا فکر اور اس کی خدمت کا جوش میں کم پاتا تھا، حالانکہ میں اس کو رسول اللہ (ﷺ) کی خاص میراث سمجھتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ان بزرگ نے میرے اس احساس کو سمجھ کر، اس کی اصلاح و تعدیل کے لئے حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی خدمت میں حاضری اور

قیام کی مجھے اتنے اہتمام سے تاکید فرمائی، گویا مجھے ایک عشق باز اور صاحب اخلاص بندے کے دین کے درد اور اس کی راہ میں اس کی تڑپ اور بے کلی کا مشاہدہ کرانا تھا اور دکھانا تھا کہ دین کی خدمت کرنے والے ایسے ہوتے ہیں۔

اے مرغ سحر عشق ز پروانہ بیاموز
کاں سوختہ جاں شد و آواز نیامد!

آٹھ، نو برس پہلے کا یہ واقعہ ہے، حافظہ نے اب تک جتنا کچھ محفوظ رکھا، لکھ دیا ہے اور اپنی اور ان بزرگ کی گفتگو کا جو حصہ نقل کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنے عرصے کے بعد اصلی الفاظ میں نقل کرنا ممکن نہ تھا۔ اس لئے اس سب کو روایت بالمعنی ہی سمجھنا چاہئے، بلکہ اس کا بھی قوی امکان ہے کہ اس سلسلہ کی باتیں رہ گئی ہوں اور بعض ایسی باتیں یہاں لکھی گئی ہوں، جو اس موضوع پر بعد میں کسی اور صحبت میں ان بزرگ سے سنی گئی ہوں، بہرحال جو توضیحات و تشریحات ان بزرگ کی طرف منسوب کر کے، یہاں لکھی گئی ہیں، اس کا اطمینان ہے کہ وہ سب باتیں انہیں کی ہیں۔

مطالعہ کرنے کا جو موقع ملا، اس سے چند یقین حاصل ہوئے، جن میں سے بعض تصوف کے مخالفین اور منکرین کی خدمت میں عرض کرنے کے قابل ہیں اور بعض خود اہل تصوف کی خدمت میں پیش کرنے ضروری ہیں۔ خدا لگتی بات یہ ہے کہ غریب "تصوف" اپنے منکروں اور مخالفوں کا تو مظلوم ہے ہی، لیکن جو اس کے حامل اور علمبردار ہیں، کچھ ان کی بعض چیزیں بھی اس مظلومیت کا باعث بن رہی ہیں۔

عجیب انداز میں فرمایا:

"مولوی صاحب! یہ بیچارے جو یہاں میرے پاس آتے ہیں یہ کسی اور کام کے نہیں ہوتے۔ بس اسی کام کے ہوتے ہیں اور اسی کے واسطے آتے ہیں، اس لئے میں ان کو یہ بتلادیتا ہوں، آپ جو کام کرتے ہیں (یعنی تحریر وتقریر سے دین کی خدمت) یہ بہت بڑا کام ہے۔ آپ تو یہی کرتے رہیں اور اس چکر میں نہ پڑیں۔"

ظاہر ہے کہ یہ میرے سوال کا جواب نہ تھا، لیکن ان بزرگ نے میری بات کے جواب میں اتنا ہی فرمایا اور مجھے کچھ عرض کرنے اور اپنے اصل سوال کی طرف مکرر توجہ دلانے کی مہلت دیئے بغیر، ہندو مسلمانوں کے بعض اجتماعی مسائل اور ان کے مستقبل پر گفتگو کا ایک نیا سلسلہ شروع فرمایا، جو میرے لئے بھی دلچسپ تھا، ان کا یہ رویہ دیکھ کر پھر سے اپنے سوال کو اٹھانا میں نے مناسب نہ سمجھا اور عشاء [illegible] یہ مجلس ختم ہوگئی۔

اگلے دن مغرب کے بعد پھر یہی ہوا کہ ذاکرین نے اسی دھن کے ساتھ اپنا اپنا ذکر شروع کردیا، مجھ سے پھر نہ رہا گیا اور میں نے کل کا اپنا سوال پھر یاد دلایا، لیکن آج بھی ان بزرگ نے وہی کل والا رویہ اختیار فرمایا کہ میری بات کو بالکل نظر انداز فرمایا، ہندوستانی مسلمانوں کی غالباً اور حال کی مختلف تحریکوں پر گفتگو کا ایک لمبا سلسلہ شروع فرمایا اور میرا سوال پھر رہ گیا۔

خانقاہ کے جس حجرے میں میرے سونے کا انتظام تھا، نماز عشاء وغیرہ سے فارغ ہوکر، میں اس میں جاکر لیٹ گیا اور تصوف کے اس قسم کے اعمال واشغال پر بطور خود ہی غور کرنے لگا۔ اس غور وفکر میں خود میں خود ہی سائل تھا اور خود ہی مجیب۔ یاد آتا ہے کہ اس ذہنی بحث مباحثہ میں دیر تک نیند نہیں آئی، میں چاہتا تھا کہ ذہن اس مسئلہ میں بالکل یکسو ہوجائے، اگر میرے سوچنے میں کوئی غلطی ہورہی ہے تو اس کی تصحیح ہوجائے اور اگر میں ٹھیک طور پر سمجھ رہا ہوں تو اس بارے میں مجھے ایسا یقین

واطمینان حاصل ہوجائے، کہ میں پوری قوت سے ان چیزوں کا رد وانکار کروں، ان باتوں کے غلط باطل ہونے پر ایک سچے حق پرست کی طرح اصرار کروں۔

اسی غور وخوض میں دیر کے بعد میرا ذہن ایک دفعہ اس طرف منتقل ہوا کہ تصوف کے ان خاص اعمال واشغال کو (مثلاً ذکر ومراقبہ کے ان مخصوص طریقوں کو، جو مشائخ کے تجویز کئے ہوئے ہیں اور اپنی قیود واوضاع کے ساتھ سنت سے ثابت نہیں ہیں) میرا بدعت اور نادرست سمجھنا، اگر صحیح ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ حضرت شاہ ولی اللہؒ، حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ اور ان سے بھی پہلے، ان جیسے بہت سے حضرات کو مجدد یا مصلح نہیں، بلکہ بدعات کا حامی اور بدعات کا رواج دینے والا ماننا پڑے گا، کیونکہ ان حضرات نے صرف اتنا ہی نہیں کہ کسی مصلحت یا وقت کے تقاضے سے ان چیزوں کے بارے میں تسامح وتساہل ہی برتا ہو، بلکہ ان کی تعلیم سے ان کتابیں بھری ہوئی ہیں اور ساری عمر اپنے پاس آنے والے طالبین کو انہوں نے ان ہی طریقوں سے ذکر وشغل کراکے، ان کا سلوک طے کرایا ہے، بلکہ ان حضرات میں سے اکثر کی زندگی میں جس قدر یہ پہلو نمایاں ہے، ان کی کتابوں کے پڑھنے والے اور جاننے والے جانتے ہیں کہ غالباً کوئی دوسرا پہلو اتنا نمایاں نہیں ہے۔

ذہن کے اس طرف منتقل ہونے کے بعد، دل نے یہ فیصلہ تو جلد ہی کرلیا کہ مجھ جیسے کم فہم اور ناقص العلم کا کسی مسئلہ کے سمجھنے میں غلطی کرنا، زیادہ ممکن اور زیادہ قرین قیاس ہے، بہ نسبت اس کے کہ امام ربانی مجدد الف ثانی اور حضرت شاہ ولی اللہؒ و شاہ اسماعیل شہید جیسے اکابر علم ودین کی طرف غلطی کو منسوب کیا جائے، وہ بھی ایک فن سے متعلق ہیں، جس کے ساتھ ہمارا تعلق تو صرف نظری ہے اور ان حضرات کا عمر بھر اس کے ساتھ گہرا عملی تعلق رہا ہے۔

دل نے اپنے خلاف یہ فیصلہ جلدی اور آسانی سے اس لئے کرلیا کہ ان

حضرات کی تصانیف کے مطالعہ اور ان کے شخصی حالات اور اصلاحی وتجدیدی خدمات سے، کچھ واقفیت کی وجہ سے ان کے رسوخ فی العلم، تفقہ فی الدین اور عنداللہ مقبولیت کا، میں پہلے ہی سے پوری طرح قائل تھا اور میرا دل کسی طرح یہ قبول نہیں کرسکتا تھا، کہ یہ سب حضرات (اپنے اپنے زمانہ میں اسرار دین کے عارف اور امت کے مجدد ہونے کے باوجود) چند بدعتوں کو قرب خداوندی کا ذریعہ سمجھ کر، خود بھی ساری عمر ان میں مبتلا رہے اور اللہ کے ہزاروں بندوں کو بھی ان میں مبتلا کرتے۔ بیشک مجدد، نبی کی طرح معصوم اور صاحب وحی تو نہیں ہوتا لیکن وہ بدعات کا داعی اور مروج بھی نہیں ہوسکتا، خاص کر دین کے جس شعبہ میں اس کو دوسرے سب شعبوں سے زیادہ انہماک ہو اور وہ اس کا داعی خاص ہو اور اسی کے ذریعہ اصلاح و تجدید کا کام کررہا ہو۔ اس میں اگر بدعت وغیر بدعت میں امتیاز نہ کرسکے گا، تو یقیناً وہ اصلاح سے زیادہ فساد کا اور ہدایت سے زیادہ ضلالت کا باعث ہوگا۔

بہرحال یہ چند خیالی نکتے تھے، جن پر پہنچ کر میری ذہن کی الجھن کچھ کم ہوئی اور میں نے مان لیا کہ غالباً مجھ سے ہی اس مسئلہ کے سمجھنے میں کوئی غلطی ہو رہی ہے اور اب مجھے اپنی غلطی ہی کو پکڑنے اور پالینے کی کوشش کرنا چاہیے۔

جن بزرگ کی خانقاہ کا یہ قصہ ہے، ان کا معمول ہے کہ روزانہ نماز فجر کے بعد چند میل ٹہلتے، اس دن یہ عاجز بھی ساتھ ہولیا اور رات کے اپنے ذہنی بحث ومباحثہ اور اس کے نتیجہ کا ذکر کیا اور عرض کیا کہ:

''میرے دل و دماغ نے یہ تو مان لیا ہے کہ تصوف کے اعمال و اشغال کے بارے میں جو اب تک سمجھا ہے، غالباً وہ صحیح نہیں ہے اور اس میں کوئی غلط فہمی مجھے ہورہی ہے، لیکن ابھی تک میں اس غلطی کو پکڑ نہیں سکا ہوں، چونکہ طبیعت طالب علمانہ پائی ہے، اس لئے چاہتا ہوں کہ گرہ بھی کھل جائے اور جو خلش باقی ہے وہ بھی نکل جائے۔''

موصوف میری یہ بات سن کر مسکرائے اور فرمایا:

''مولوی صاحب! آپ کو یہی تو شبہ ہے کہ یہ چیزیں بدعت ہیں؟ یہ بتلائیے کہ بدعت کی تعریف کیا ہے؟ میں عرض کیا:

''بدعت کی تعریف تو علما نے کئی طرح سے کی ہے، لیکن جو زیادہ منقح اور محقق ہوتی ہے، وہ یہی سیدھی سی تعریف ہے کہ دین میں کسی چیز کا اضافہ، جس کے لئے شریعت میں کوئی دلیل نہ ہو۔''

فرمایا:

''ہاں ٹھیک ہے، لیکن یہ بتلائیے کہ اگر دین میں کوئی چیز مقصود اور مامور بہ ہو اور اللہ نے اس کا حاصل کرنا ضروری قرار دیا ہو، لیکن کسی وقت زمانہ کے حالات بدل جانے سے، وہ اس طریقے سے حاصل نہ کی جاسکتی ہو، جس طریقے سے رسول اللہ (ﷺ) اور صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں حاصل ہوجایا کرتی تھی، بلکہ اس کے واسطے کوئی اور طریقہ استعمال کرنے کی ضرورت پڑجائے تو کیا اس نئے استعمال کو بھی آپ ''دین میں اضافہ'' اور ''بدعت'' کہیں گے؟ (پھر اپنے مقصد کو اور زیادہ واضح کرنے کے لئے فرمایا) مثلاً دین سیکھنا اور سکھانا ضروری ہے اور دین میں اس کا نہایت تاکیدی حکم ہے اور آپ جانتے ہیں کہ رسول اللہ (ﷺ) اور صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں، اس کے لئے صرف صحبت کافی ہوجاتی تھی، تعلیم کے لئے کوئی مستقل انتظام نہیں تھا، نہ مدرسے تھے، نہ کتابیں تھیں، لیکن بعد میں حالات ایسے ہوگئے کہ صحبت اس مقید کے لئے کافی نہیں رہی، بلکہ کتابوں کی اور پھر مدرسوں کی بھی ضرورت پڑگئی تو اللہ کے بندوں نے کتابیں لکھیں، اور مدرسے قائم کئے اور اس کے بعد سے دین کی تعلیم وتعلم کا سارا سلسلہ اسی سے چلا، اور اب تک اسی سے قائم ہے۔ تو کیا تعلیم وتعلم کے طریقے میں اس تبدیلی کو بھی ''دین میں اضافہ اور بدعت کہا جائے گا؟''

میں نے عرض کیا:

"نہیں"! دین میں اضافہ "جب ہوتا ہے جب کہ مقصود اور امر شرعی بنا کر کیا جائے، لیکن اگر کسی دینی مقصد کے لئے حاصل کرنے کے لئے قدیمی طریقے ناکافی ہوجانے کی وجہ سے، کوئی نیا جائز طریقہ اختیار کرلیا جائے تو اس کو "دین میں اضافہ" نہیں کہا جائے گا اور نہ وہ بدعت ہوگا۔"

فرمایا:

"بس سلوک کے جن اعمال و اشغال پر آپ کو بدعت ہونے کا شبہ ہے، ان سب کی نوعیت بھی یہی ہے، ان میں سے کوئی چیز بھی مقصد کے طور پر نہیں کی جاتی، بلکہ یہ سب نفس کے تزکیہ اور تحلیہ کے لئے کیا کرایا جاتا ہے، جو دین میں مقصود اور مامور بہ ہے۔ مثلاً یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور ہر وقت اس کا اور اس کی رضا کا دھیان فکر کرنا اور اس کی طرف سے کسی وقت بھی غافل نہ ہونا، یہ کیفیتیں دین میں مطلوب ہیں، اور قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بغیر ایمان اور اسلام کامل نہیں ہوتا۔

لیکن رسول اللہ (ﷺ) کے زمانہ میں دین کی تعلیم و تربیت کی طرح یہ ایمانی کیفیتیں بھی، آپ کی صحبت ہی سے حاصل ہوجاتی تھیں، اور حضور کے فیضان صحبت سے صحابہ کرام کی صحبتوں میں بھی یہ تاثر تھی، لیکن بعد میں ماحول کے زیادہ بگڑ جانے اور استعدادوں کے ناقص ہوجانے کی وجہ سے اس مقصد کیلئے کاملین کی صحبت بھی کافی نہیں رہی، تو دین کے اس شعبہ کے اماموں نے ان کیفیات کے حاصل کرنے کیلئے صحبت کے ساتھ ذکر و فکر کی کثرت کا اضافہ کیا اور تجربہ سے یہ تجویز صحیح ثابت ہوئی۔ اسی طرح بعض مشائخ نے اپنے زمانے کے لوگوں کے احوال کا تجربہ کر کے، ان کے نفس کو توڑنے اور شہوات کو مغلوب کرنے اور طبیعت میں لینت پیدا کرنے کے لئے، ان کے واسطے خاص خاص قسم کی ریاضتیں اور مجاہدے تجویز کئے۔ اسی

طرح ذکر کی تاثیر بڑھانے کے لئے اور طبیعت میں رقت اور یکسوئی پیدا کرنے کے لئے ضرب کا طریقہ نکالا گیا ہے، تو ان میں سے کسی چیز کو مقصود اور مامور بہ نہیں سمجھا جاتا، بلکہ یہ سب کچھ علاج اور تدبیر کے طور پر کیا جاتا ہے اور اسی لئے مقصد حاصل ہوجانے کے بعد، یہ سب چیزیں چھڑادی جاتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ائمہ طریق اپنے اپنے زمانہ کے حالات اور اپنے تجربوں کے مطابق ان چیزوں میں ردو بدل اور کمی بیشی بھی کرتے رہتے رہے ہیں اور اب بھی کرتے رہتے ہیں، بلکہ ایک ہی شیخ کبھی کبھی مختلف طالبوں کے لئے، ان کے خاص حالات اور ان کے استعداد کے مطابق الگ الگ اعمال و اشغال تجویز کردیتا ہے اور بعض ایسے اعلیٰ استعداد والے بھی ہوتے ہیں، جنہیں اس طرح کا ذکر و شغل کرانے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی اور اللہ تعالیٰ ان کو یوں ہی نصیب فرمادیتا ہے۔ اس سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان سب چیزوں کو صرف علاج اور تدبیر کے طور پر ضرورتاً کرایا جاتا ہے۔"

ان بزرگ کی اس تقریر اور توضیح سے میرا وہ ذہنی خلجان تو دور ہوگیا، ایک نئی چاہت یہ پیدا ہوگئی کہ یہ جو کچھ فرمایا ہے، اس کو خود آزما کے دیکھا جائے اور اپنے ذاتی تجربہ سے قلبی اطمینان اور مزید یقین کیا جائے، لیکن میرے حالات اور مشاغل میں اس کی گنجائش نہیں تھی کہ اس تجربہ کیلئے میں کوئی بڑا اور مستقل وقت دے سکوں۔ اس لئے میں نے بے تکلف اور صفائی سے عرض کیا کہ:

اگر یہ ذکر شغل ان مقاصد کے لئے کیا جاتا ہے اور اس کے ذریعہ یہ چیزیں حاصل ہوجاتی ہیں، تو پھر میں بھی اس کا محتاج ہوں، لیکن میں زیادہ وقت نہیں دے سکتا، کیونکہ دین کے جن دوسرے کاموں سے کچھ تعلق کر رکھا ہے، ان کو بھی میں چھوڑنا نہیں چاہتا۔

فرمایا:

"مولوی صاحب! تصوف دین کے کام چھڑانے کے لئے نہیں ہے، بلکہ اس

سے تو دین کے کاموں میں قوت آتی ہے، اور جان پڑتی ہے، لیکن کیا عرض کیا جائے اللہ تعالیٰ کی مشیت ہے۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے دین کے کاموں کے قابل بنایا ہے، وہ اب ادھر توجہ ہی نہیں کرتے۔ حالانکہ اگر تھوڑی سی توجہ ادھر دیدیں، تو دیکھیں کہ ان کے کاموں میں کتنی قوت آتی ہے۔ حضرت خواجہ صاحبؒ نے بادا صاحبؒ نے اور بعد میں حضرت مجدد صاحبؒ، حضرت شاہ صاحب اور حضرت سید صاحب نے، ہمارے اس ملک میں دین کی جو خدمتیں انجام دیں اور جو کچھ کر دکھایا (جن کا سوواں اور ہزارواں حصہ بھی ہماری بڑی بڑی انجمنیں اور جماعتیں نہیں کر سکی رہی ہیں) اس میں ان کے اخلاص اور قلب کی اس طاقت کو خاص دخل تھا، جو تصوف کے راستہ سے پیدا کر گئی تھی۔ لیکن اب صورت یہ ہے کہ اس طرف صرف وہی بیچارے آتے ہیں، جو بس اللہ اللہ کرنے کے کام کے ہی ہوتے ہیں۔ یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں استعدادیں مختلف رکھی ہیں، ناقص اعلیٰ استعداد والوں کا کام نہیں کرسکتا۔

پھر اسی سلسلہ میں فرمایا:

خدا معلوم، لوگ تصوف کو کیا سمجھتے ہیں، تصوف تو بس اخلاص اور عشق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے اور جو کام عشق کی طاقت سے اور اخلاص کی برکت سے ہوسکتا ہے، وہ اس کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ تو دراصل تصوف ضروری نہیں ہے، بلکہ عشق اور اخلاص پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر کسی کو اس کے حاصل کرنے کا اس سے بھی آسان اور مختصر کوئی راستہ معلوم ہوجائے تو مبارک ہے، وہ اسی راستہ سے حاصل کرلے اور ہم کو بھی بتلادے۔ ہم تو اسی راستہ کو جانتے ہیں، جس کا اللہ کے ہزاروں صادق بندوں نے سینکڑوں برس سے تجربہ کیا ہے، جن میں سینکڑوں وہ تھے، جو دین کے اس شعبہ کے مجتہد بھی تھے اور صاحب الہام بھی تھے۔

میں نے عرض کیا کہ:

''جو شخص پہلے سے کسی دینی کام میں لگا ہو اور یہ محسوس کرتا ہو کہ اسے عشق اور اخلاص نصیب نہیں ہے، تو کیا وہ کسی مدت تک اس کام کو چھوڑ کے اس کی تحصیل کرے یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے، اس کو بھی کرتا رہا اور اس کے ساتھ اس کو حاصل کرنے کی بھی کوشش کرے؟''

فرمایا:

''ہاں! ہوسکتا ہے۔ البتہ بعض طبائع ایسی ہوتی ہیں کہ انہیں کچھ مدت کے لئے یکسوئی کے ساتھ اسی طرف مشغول ہونے کی ضرورت ہوتی ہے۔''

میں نے عرض کیا:

کیا اس کے لئے بیعت ہونا بھی ضروری ہے؟

فرمایا:

''نہیں اور بالکل نہیں! ہاں طلب اور اعتماد کے ساتھ محبت اور صحبت ضروری ہے، بیعت تو صرف تعلق اور اعتماد کے اظہار کے لئے ہے، ورنہ اصل مقصد میں بیعت کو کوئی خاص دخل نہیں ہے۔''

میں نے عرض کیا کہ:

''پھر مجھ کو بھی کچھ فرمادیں۔''

فرمایا:

''مولوی صاحب! حدیث شریف میں ''المستشار موتمن'' (جس سے مشورہ لیا جائے وہ امین ہے، اس کو پوری دیانت داری سے مشورہ دینا چاہئے) میں آپ کے لئے یہ بہتر سمجھتا ہوں کہ آپ اس مقصد کے لئے فلاں صاحب یا فلاں صاحب کی طرف رجوع کریں، ان حضرات پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے اور آپ جیسے علم والوں کے لئے میں ان ہی حضرات کو اہل سمجھتا ہوں۔''

میں نے عرض کیا:

"ان دونوں بزرگوں کی عظمت پہلے سے بھی کچھ دل میں تھی، اور اب حضرت کے اس ارشاد سے اور زیادہ ہوگئی، لیکن چونکہ مجھ میں یہ طلب یہیں پیدا ہوئی ہے، اس لئے میں تو اس راستے میں حضرت ہی سے رہنمائی حاصل کرنا اپنے لئے بہتر سمجھتا ہوں۔"

موصوف نے اپنی محبت و شفقت کے پورے اظہار کے ساتھ ایک یا دو دفعہ پھر انہی دونوں بزرگوں کا حوالہ دیا، لیکن جب میں نے ادب کے ساتھ اپنی ہی رائے پر اصرار کیا تو قبول فرمایا اور میری مصروفیتوں کا پورا لحاظ فرماتے ہوئے، ذکر وغیرہ کا بہت مختصر سا پروگرام تجویز فرمایا اور میں نے کرنا شروع کر دیا۔

اس کے بعد میں غالباً چار پانچ دن وہاں اور مقیم رہا، جب اجازت لیکر رخصت ہونے لگا تو خاص اہتمام سے فرمایا کہ:

"حضرت دہلوی (یعنی مولانا محمد الیاسؒ) کی خدمت میں ضرور جایا کریں اور کچھ قیام کریں۔"

اس موقعہ پر مولانا موصوفؒ کے متعلق بہت بلند کلمات بھی ارشاد فرمائے اور حقیقت یہ ہے کہ ان بلند کلمات ہی نے مجھے اس مشورہ کی تعمیل پر آمادہ کیا اور جیسا کہ مولانا مرحومؒ کے ملفوظات کے مقدمہ میں لکھ چکا ہوں، اس کے بعد ہی میں نے مولانا موصوفؒ کی شخصیت کو کچھ جانا اور کچھ عرصہ کے بعد میں یہ بھی سمجھ سکا کہ مولانا کی خدمت میں حاضری کا اتنے اہتمام سے مجھے کیوں مشورہ دیا گیا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ خانقاہیت اور خانقاہی مشاغل اور اہل خانقاہ سے جو مجھے بعد تھا اس میں اچھا خاصا دخل میرے اس احساس کو بھی تھا کہ ان حلقوں میں دین کا فکر اور اس کی خدمت کا جوش میں کم پاتا تھا، حالانکہ میں اس کو رسول اللہ (ﷺ) کی خاص میراث سمجھتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ان بزرگ نے میرے اس احساس کو سمجھ کر، اس کی اصلاح وتعدیل کے لئے حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی خدمت میں حاضری اور

قیام کی مجھے اتنے اہتمام سے تاکید فرمائی، گویا مجھے ایک عشق باز اور صاحب اخلاص بندے کے دین کے درد اور اس کی راہ میں اس کی تڑپ اور بے کلی کا مشاہدہ کرانا تھا اور دکھانا تھا کہ دین کی خدمت کرنے والے ایسے ہوتے ہیں۔

اے مرغ سحر عشق ز پروانہ بیاموز
کاں سوختہ جاں شد و آواز نیامد!

آٹھ، نو برس پہلے کا یہ واقعہ ہے، حافظ نے اب تک جتنا کچھ محفوظ رکھا، لکھ دیا ہے اور اپنی اور ان بزرگ کی گفتگو کا جو حصہ نقل کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنے عرصے کے بعد اصلی الفاظ میں نقل کرنا ممکن نہ تھا۔ اس لئے اس سب کو روایت بالمعنی ہی سمجھنا چاہئے، بلکہ اس کا بھی قوی امکان ہے کہ اس سلسلہ کی باتیں رہ گئی ہوں اور بعض ایسی باتیں یہاں لکھی گئی ہوں، جو اس موضوع پر بعد میں کسی اور صحبت میں ان بزرگ سے سنی گئی ہوں، بہرحال جو توضیحات وتشریحات ان بزرگ کی طرف منسوب کر کے، یہاں لکھی گئی ہیں، اس کا اطمینان ہے کہ وہ سب باتیں انہیں کی ہیں۔

مطالعہ کرنے کا جو موقع ملا، اس سے چند یقین حاصل ہوئے، جن میں سے بعض تصوف کے مخالفین اور منکرین کی خدمت میں عرض کرنے کے قابل ہیں اور بعض خود اہل تصوف کی خدمت میں پیش کرنے ضروری ہیں۔ خدا لگتی بات یہ ہے کہ غریب "تصوف" اپنے منکروں اور مخالفوں کا تو مظلوم ہے ہی، لیکن جو اس کے حامل اور علمبردار ہیں، کچھ ان کی بعض چیزیں بھی اس کی مظلومیت کا باعث بن رہی ہیں۔

مولانا محمد منظور نعمانی

تصوف کی حقیقت

الحمدللہ کہ اب اس باب میں کسی طرح کوئی شک وشبہ نہیں رہا کہ تصوف اور اس کے اعمال واشغال کا اصل مقصد دین کی تکمیل اور خصوصاً ان کیفیات اور ملکات کی تحصیل کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ جن کو کتاب وسنت ہی میں کمال ایمان واسلام کی ضروری شرط قرار دیا گیا ہے، چونکہ اس بارے میں بہت سے حضرات کے ذہنوں میں الجھنیں ہیں۔ اس لیے جو کچھ اس سلسلہ میں میں نے سمجھا ہے اس کو ذرا تفصیل سے عرض کرتا ہوں۔ وباللہ التوفیق۔

قرآن وحدیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اور دین کی تکمیل کے لیے عقائد اور اعمال کی صحت کے علاوہ، انسان کے قلب اور باطن میں کچھ خاص کیفیات کا ہونا بھی ضروری ہے۔ مثلاً محبت کے بارے میں سورۃ بقرہ کی ایک آیت میں ارشاد ہے:

والذین آمنوا اشد حب الله. اور جو ایمان والے ہیں، ان کو سب سے زیادہ محبت اللہ سے ہوتی ہے۔

اور حدیث صحیح میں ہے:

(یعنی ایمان کی حلاوت اس کو حاصل ہوگی، جن میں تین چیزیں موجود ہوں۔ ان میں سے اول یہ کہ اللہ و رسول ﷺ کی محبت اس کو تمام ماسوا سے زیادہ ہو، دوسرے یہ کہ اگر کسی آدمی سے اس کو محبت ہو تو وہ بھی اللہ ہی کے واسطے ہو، اور تیسرے یہ کہ ایمان کے بعد کفر کی طرف جانا، اس کے لئے اتنا ناگوار اور تکلیف دہ ہو، جتنا کہ آگ میں ڈالا جانا۔

انماالمومنون الذین اذا ذکر الله وجلت قلوبهم واذا تلیت علیهم آیة

زادتهم ایماناً وعلیٰ ربهم یتوکلون. (سورۃ الانفال:ع-۱)

سچے ایمان والے بس وہی لوگ ہیں، جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دلوں میں خوف کی کیفیت پیدا ہو اور جب ان کے سامنے اللہ کی آیتوں کی تلاوت کی جائے، تو ان کے نور ایمان میں زیادتی ہو اور اپنے پروردگار پر وہ بھروسہ رکھتے ہوں۔

اور سورہ "مومنون" میں اللہ تعالیٰ کے اچھے اور کامیاب بندوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

ان الذین هم من خشیة ربهم مشفقون والذین هم بایٰت ربهم یومنون، والذین هم بربهم لایشرکون، والذین یوتون ماآتوا وقلوبهم وجلت انهم الیٰ ربهم راجعون، اولائک یسارعون فی الخیرات وهم لها سابقون. (المومنون:ع:۴)

بیشک وہ لوگ جو اپنے رب کی ہیبت سے خوف زدہ رہتے ہیں اور جو اپنے رب کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور وہ جو اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے ہیں اور جن کا کہ اللہ کی راہ میں اور نیکی کے کاموں میں اپنا مال خرچ کرتے وقت (اور اسی طرح دوسرے نیک اعمال کرتے وقت) ان کے دل خائف رہتے ہیں کہ ان کو اللہ کے حضور میں لوٹ کے جانا ہے، (نامعلوم ان کے یہ عمل وہاں قبول ہوں یا نہ ہوں) وہی لوگ بھلائی کی طرف تیز گامی کرتے ہیں اور وہی ان کے لئے دوڑ کر بڑھنے والے ہیں۔

اور سورہ زمر میں قرآن مجید کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ:

تقشعر منه جلود الذین یخشون ربهم ثم تلین جلودهم وقلوبهم الیٰ ذکر الله. (زمر:ع:۳)

اس سے ان لوگوں کے بدن کانپنے لگتے ہیں اور رونگٹے کھڑے ہوجاتے، جو

اپنے رب سے ڈرتے ہیں، پھر ان کا ظاہر وطن نرم ہو کر اللہ کی یاد کی طرف جھک جاتا ہے۔

اور سورہ آل عمران میں ارشاد ہے:

الذین یذکرون اللہ قیاماً وقعوداً وعلیٰ جنوبھم. (آل عمران:۔۔۔)

وہ لوگ جن کا یہ حال ہے کہ اللہ کو (ہر وقت) اور ہر حالت میں یاد کرتے اور یاد رکھتے ہیں، کھڑے، بیٹھے اور بستروں پر لیٹے ہوئے بھی۔

اور سورہ مزمل میں رسول (ﷺ) کو خطاب کرکے ارشاد فرمایا گیا ہے:

واذکر اسم ربک وتبتل الیہ تبتیلا. (مزمل)

اور اپنے رب کا نام یاد کرتے رہو اور سب سے یکسو ہوکے اسی کی طرف متوجہ رہو۔

ان آیتوں میں جن اوصاف و کیفیات کو اہل ایمان کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے اور جن کا ان سے مطالبہ کیا گیا ہے وہ یہ ہیں:

(۱) ہر چیز سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی محبت ہو۔

(۲) ان کے دل کی یہ حالت ہو کہ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جائے تو اس میں خوف اور لرزش کی کیفیت پیدا ہوجائے۔

(۳) ان کے سامنے جب آیات الاہی کی تلاوت کی جائے تو ان کے نور ایمان میں اضافہ ہو۔

(۴) اللہ پر توکل اور بھروسہ رکھتے ہوں اور یہ توکل اور اعتماد علی اللہ ہی ان کی زندگی کا سب سے بڑا سہارا ہو۔

(۵) وہ ہر دم اللہ کی ہیبت سے خوف زدہ رہتے ہوں۔

(۶) اللہ کا خوف ان پر اتنا غالب ہو کہ نیکی کرتے بھی وہ ڈرتے ہوں کہ معلوم نہیں ہماری یہ نیکی قابل قبول بھی ہوگی یا نہیں۔

(۷) قرآن مجید کی تلاوت یا اس کی آیتیں سننے سے، ان کے جسم کانپ جاتے ہوں اور ان کا ظاہر و باطن اللہ تعالیٰ کی طرف اور اس کی یاد کی طرف جھک جاتا ہو۔

(۸) ہر وقت اور ہر حالت میں اللہ کو یاد رکھتے ہوں اور کسی حال میں بھی اس سے غافل نہ ہوتے ہوں۔

(۹) ہر طرف سے منقطع ہو کر اللہ کی طرف متوجہ ہونا، ان کا حال ہو۔

قرآن مجید کے علاوہ حدیث کے مستند ذخیرہ میں بھی، اس سے زیادہ صفائی اور صراحت کے ساتھ اس قسم کے احوال اور کیفیات کا ذکر کیا گیا، جیسے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے:

من احب للہ وابغض للہ واعطی للہ ومنع للہ فقد استکمل الایمان. (مشکوٰۃ شریف)

جس شخص کا یہ حال ہو کہ وہ اللہ ہی کے لئے محبت کرے، (جس سے محبت رکھے) اور اللہ کے لئے ہی بغض رکھے، (جس سے بغض کرے) اور اللہ ہی کے لئے دے، (جس کو جو کچھ بھی دے) اور کسی کو کچھ دینے سے اللہ کی رضا کے لئے ہی ہاتھ روکے، (جس کو بھی دینے سے ہاتھ روکے) تو اس نے اپنا ایمان کامل کرلیا۔

اسی طرح مشہور حدیث جبرئیل میں، ایمان اسلام کی تکمیل کا نام احسان بتلایا گیا ہے اور اس کی حقیقت یہ بیان کی گئی ہے:

ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک ۔ (بخاری ومسلم)

وفی روایتہ ان تخشی اللہ مکان ان تعبداللہ. (فتح الباری)

احسان کا مقام یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اور بندگی اس طرح کرو (یا اس سے ہر دم اس طرح ڈرو،) گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو۔ کیونکہ اگر چہ تم اس کو نہیں

دیکھتے ہو، پر وہ تو تم کو ہر جگہ اور ہر آن دیکھتا ہے۔

پہلی حدیث میں "اخلاص" کا ذکر ہے اور دوسری حدیث میں "احسان" کا اور یہ دونوں ان ہی احوال و کیفیات میں سے ہیں، جن سے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے۔

دین میں ان احوال و کیفیات کی اس قدر اہمیت ہے کہ (رسول اللہ ﷺ) ان کے حصول اور ان میں ترقی کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعائیں فرماتے تھے۔ اس سلسلہ کی یہ چند دعائیں، اس عاجز کے نزدیک خاص طور سے غور اور توجہ کے لائق ہیں۔

اللهم اجعل حبک احب الی من نفسی واهلی ومن الماء البارد:

اے اللہ! مجھے ایسا کردے کہ تیری محبت اپنی ذات اور اپنے اہل و عیال سے اور (سخت پیاس کے وقت) ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ محبوب ہو۔

اللهم واجعل حبک احب الاشیاء الی کلها وخشیتک اخوف الاشیاء عندی واقطع عنی حاجات الدنیا بالشوق الیٰ لقائک واذا اقررت اعین اهل الدنیا من دنیاهم فاقرر عینی من عبادتک۔

اے اللہ! مجھے ایسا کردے کہ ہر قابل محبت چیز سے زیادہ تیری محبت مجھے محبوب ہو، اور ڈرنے کے قابل ہر چیز سے زیادہ مجھے تیرا ڈر اور خوف ہو اور ملاقات کا شوق میرے دل پر ایسا غالب کردے، کہ دنیا کی ساری حاجتیں مجھ سے کٹ جائیں اور جب تو دنیا والوں کو ان کی چاہنے کے مطابق دنیا دے کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی کرے، تو میرے آنکھیں اپنی عبادت سے ٹھنڈی کر اور اپنی عبادت کے ذریعہ میرے دل میں سکون اور ٹھنڈک پیدا کر۔

اللهم اجعلنی اخشاک کانی اراک ابداً حتی القاک: الخ

اے اللہ! مجھے ایسا کردے کہ میں اس طرح تجھ سے ڈروں، گویا ہر وقت تجھے دیکھ رہا ہوں، یہاں تک کہ اسی حال میں تجھ سے جا ملوں۔

اللهم انی اسئالک ایمانًا یباشر قلبی ایمان صادق حتیٰ اعلم انه لایصیبی الا ماکتبت لی ورضا من المعیشت بما قسمت لی.

اے اللہ! میں تجھ سے وہ ایمان مانگتا ہوں، جو میرے دل میں پیوست ہوجائے اور وہ سچا یقین مانگتا ہوں، جس کے بعد میرے دل کو اس بات کا یقینی اور قطعی علم حاصل ہوجائے کہ مجھ پر صرف وہی حالت آسکتی ہے اور آئیگی جو تو نے میرے لئے لکھ دی ہے۔ (یعنی یہ علم میرے دل کا حال ہوجائے) اور اس دنیا میں جس قسم کا گذارہ تو نے میرے لئے مقرر اور مقدر کر دیا ہے، میں اس پر اپنے دل کی رضا تجھ مانگتا ہوں۔

اللهم انی اسئلک التوفیق لمحابک من الاعمال وصدق التوکل علیک وحسن ظن بک.

اے اللہ! جو اعمال تجھے پسند ہیں، میں ان کی توفیق تجھ سے مانگتا ہوں اور سچے توکل کا تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیرے ساتھ حسن ظن کی تجھ سے استدعا کرتا ہوں۔

اللهم انی اسئلک نفساً بک مطمئنة بلقائک وترضیٰ بقضائک وتقنع بعطائک.

اے اللہ! میں تجھ سے ایسا نفس مانگتا ہوں، جسے تجھ ہی سے اطمینان اور انس حاصل ہو، جسے تیری ملاقات کا سچا ایمان اور یقین نصیب ہو، جو تیری قضا قدر پر راضی ہو اور جو تیرے دین پر قانع ہو۔

اللهم افتح لی مسامع قلبی لذکرک.

اے اللہ! میرے دل کے کان اپنے ذکر کے لئے کھول دے۔

اللهم انی اسئلک قلوباً اواهة مخبتة منیبة فی سبیلک.

اے اللہ! میں تجھ سے ایسے قلوب کا سوال کرتا ہوں، جو نرم اور درد آشنا

ہوں۔ٹوٹے ہوئے ہوں اور تیری طرف رجوع کرنے والے ہوں۔

اللھم اجعل وساوس قلبی خشیتک وذکرک واجعل ھمتی وھوای فیما تحب و ترضیٰ

اے اللہ! میرے دل میں خطرے اور خیالات بھی بس تیرے خوف اور تیری یاد ہی کے آئیں اور میری تمام تر توجہ اور چاہت ان کی طرف ہو، جو تجھے محبوب ہوں اور جن سے تو راضی ہو۔

اللھم اجعل فی قلبی نوراً واعطنی نوراً ... واجعلنی نوراً.

اے اللہ! میرے قلب میں نور بھر دے اور مجھے نور عطا فرمادے۔۔۔۔ اور مجھے سراپا نور بنا دے۔

یہ سب دعائیں، (اور اس قسم کی اور بھی بیسیوں) کتب حدیث شریف میں رسول اللہ (ﷺ) سے مروی ہیں، آپ خود بھی یہ دعائیں اللہ تعالیٰ سے مانگتے تھے اور امت کو ان دعاؤں کی تعلیم وتلقین بھی فرماتے تھے۔

ان دعاؤں میں، جن چیزوں کا سوال اللہ تعالیٰ سے کیا گیا ہے، وہ سب انسان کے باطن اور قلب کی خاص کیفیات ہیں، مثلاً ہر چیز سے زیادہ اللہ کی محبت، ہر چیز سے زیادہ اللہ کا خوف، اللہ سے شوقِ ملاقات کا ایسا غلبہ کہ دنیا کی ضروریات اور خواہشات کو فراموش کر دینا کہ وہ فنا ہوجائیں، عبادت میں، آنکھوں میں ٹھنڈک اور دل کو سکون ملنا، اللہ سے ہر دم اس طرح ڈرنا کہ گویا وہ اپنے جلال و جبروت کے ساتھ ہماری نگاہ کے سامنے ہے۔ یقین صادق، رضا بالقضا، توکل علی اللہ، حسن ظن باللہ، نفس کا اللہ تعالیٰ سے مطمئن ہونا اور مانوس ہونا، اور اس کی عطا پر قانع ہونا، ذکر اللہ تعالیٰ سے قلب پر اثر لینا، اور اس کا درد آشنا اور ٹوٹا ہوا اور جھکا ہوا ہونا۔ اللہ تعالیٰ سے قلب کا تعلق اس درجہ ہوجانا کہ اللہ کی یاد اور اس کا خوف وساوس اور خطرات کی جگہ بھی لے لے، اور بندہ کا جی صرف انہیں چیزوں کو چاہے، جو اللہ کے

نزدیک پسندیدہ ہیں، نور سے قلب کا معمور ہوجانا۔

ظاہر ہے کہ ان چیزوں کا تعلق نہ عقائد کے باب سے ہے نہ اعمال کے باب سے، بلکہ یہ سب قلبی کیفیات اور احوال ہیں اور دین میں ان کی اتنی اہمیت ہے کہ رسول اللہ (ﷺ)، اللہ تعالیٰ سے ان کا سوال کرتے ہیں۔

پس تصوف دراصل اس قسم کی چیزوں کی تحصیل کا ذریعہ ہیں اور اس کے خاص اعمال و اشغال (مثلاً صحبت شیخ اور ذکر وفکر) کی حیثیت اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ وہ ان کیفیات کے پیدا کرنے کی تدبیروں میں، ایسی تدبیریں، جن کا تجربہ تصدیق کرتا ہے اور صاف ذہن رکھنے والوں کے لئے ان کی نفسیاتی اور عقلی توجیہ بھی کچھ مشکل نہیں ہے۔

یہاں یہ عرض کر دینا بھی غالباً ناظرین کے لئے مفید ہوگا کہ مندرجہ بالا آیات و احادیث و دعاؤں سے، جن قلبی کیفیات کا دین میں مطلوب و مقصود ہونا، ابھی معلوم ہوچکا ہے، ان میں سے چند مثلاً عشق اور یقین اور قلب کی رقت اور سوز وگداز تو اصل و بنیاد کا درجہ رکھتی ہیں اور باقی زیادہ تر ان کے نتائج اور لوازم ہیں، اس لئے تصوف کے ان اعمال و اشغال کے ذریعہ براہ راست صرف ان بنیادی کیفیات ہی کو قلب میں پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جس کے بعد باقی چیزیں خود بخود پیدا ہوجاتی ہیں۔

یہ ہے وہ اصولی نظریہ جس پر تصوف کی بنیاد ہے اور جس کی بنا پر اس کو دین کا تکمیلی شعبہ سمجھا جاتا ہے۔

یہ عاجز بلا کسی انکار کے عرض کرتا ہے کہ اپنی کم ہمتی اور لا ابالی پن اور کچھ خاص حالات کی وجہ سے، چونکہ میں اس سلسلے کے تجربے کی طرف پوری توجہ نہیں دے سکا، اس لئے خود ان کیفیات سے خالی اور محروم ہی ہوں، لیکن جو تھوڑی سی اور برائے نام توجہ کی جاسکی اور اس راہ کے بعض اکابر کی خدمت میں، کبھی کبھی حاضری

کی جو توفیق اس سلسلہ میں ملتی رہی، اسی سے الحمدللہ یہ یقین اور اطمینان حاصل ہوگیا کہ تصوف اور اس کے اعمال واشغال کی غرض و غائیت اور ان کی حقیقت کے متعلق ان بزرگ نے جو کچھ ارشاد فرمایا تھا وہ صحیح ہے۔

(۲) اور دل و دماغ نے یہ بھی مان لیا کہ تصوف کے ذریعے جن قلبی کیفیات اور ملکات کی تحصیل کی کوشش کی جاتی ہے، دین کی تکمیل اور ایمانی حلاوت کا حصول ان پر موقوف ہے۔

(۳) اس کا بھی یقین حاصل ہوا کہ تصوف ایمان واسلام کی تکمیل کے علاوہ، ایک خاص قسم کی روح اور طاقت پیدا کرنے کا بھی ذریعہ ہے اور اگر صلاحیت اور طبیعت کو مناسبت ہو تو یقین اور اعتماد، ہمت و عزیمت، صبر وتوکل اور ماسوی اللہ تعالیٰ سے بے خوفی جیسے اوصاف (جو طاقت کا سرچشمہ ہیں) تصوف کے ذریعہ ان کو پیدا کیا جاسکتا ہے اور ابھارا جاسکتا ہے، اسی لیے تصوف کو اپنانے کی سب سے زیادہ ضرورت اور اس سے فائدہ اٹھانے کا سب سے بڑا حق، میرے نزدیک اللہ تعالیٰ کے ان بندوں کو ہے، جو بے دینی کی اس دنیا میں انبیاء علیہم السلام کے طرز اور طریقے پر کسی بڑی اصلاحی تبدیلی کیلئے مصروف جدوجہد ہوں اور مادہ پرستی کی فضا کو خدا پرستی کی فضا سے بدلنا چاہتے ہوں۔

(۴) تصوف سے دوری اور بے خبری کے دور میں میری یہ رائے تھی کہ تصوف کا قالب ہم کو بدل دینا چاہیے، لیکن بعد میں جب تصوف اور اس کے عالمین سے کچھ قرب پیدا ہوا تو معلوم ہوا کہ صورت اور قالب میں ترمیم اور تبدیل کا عمل برابر جاری ہے اور خود ہماری اس صدی میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ وغیرہ نے اپنے تجربے اور اجتہاد سے اس میں بہت کچھ ترمیم کی ہے اور زمانہ حاضر کے تقاضے کے مطابق اس کو بہت مختصر اور سائنٹفک کر دیا ہے اور اب یہ راہ کھلی ہوئی ہے اور بلاشبہ سلوک میں تجدید کے اس سلسلہ کو برابر جاری رہنا چاہیے۔ لیکن اب اس کا پورا یقین ہوگیا کہ یہ کام صرف وہی حضرات کر سکتے ہیں، جو اس فن کے امام اور خود اس سمندر کے شناور ہوں، ورنہ اگر اس خدمت کی ذمہ داری، میرے ایسے حضرات نے لے لی، جنہوں نے اس شعبہ کی تکمیل کی ہے اور نہ اس کے ساتھ ان کا گہرا عملی تعلق رہا ہے تو اس کا بڑا امکان ہے کہ اخلاص اور ذہانت کے باوجود، تصوف میں ان کی اصلاح و ترمیم خدانخواستہ اس قسم کی ہو، جیسی کسی روایتی بڑھیا نے شاہی باز کی مرمت کی تھی۔

(۵) تصوف اور اہل تصوف سے قریب ہونے کے بعد، جن چند باتوں کا یقین حاصل ہوا ان میں سے ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ کوئی شخص خواہ کتنا ہی پڑھا لکھا اور کیسا ہی ذہین فطین ہو، تصوف سے صحیح واقفیت حاصل کرنے کیلئے اور اس کے مالہ و ما علیہ کو علیٰ وجہ البصیرت جاننے کے لئے، اس کو بھی اس کی ضرورت ہے کہ تصوف کی حامل کسی شخصیت کی صحبت اور خدمت میں اس کا کچھ وقت گذرے اور اس شعبہ کا عملی تجربہ حاصل کرنے پر بھی وہ زندگی کے کچھ دن صرف کرے اور اس کے بغیر تصوف کو، پوری طرح سمجھا اور جانا نہیں جاسکتا۔ جن صاحب ارشاد بزرگ کی خانقاہ میں اپنی حاضری کا ذکر گذشتہ صفحات میں راقم سطور کر چکا ہے، ایک موقع پر میرے ہی ایک سوال کے جواب میں موصوف نے اس حقیقت کو ان لفظوں میں ادا کرنا تھا کہ:

"گھر کے اندر کی چیزوں کا پورا علم تو گھر میں داخل ہو کر ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔"

الغرض تھوڑے سے ہی تجربے سے ارباب تصوف و سلوک کے اس مشہور مقولہ کی تصدیق حاصل ہوگئی کہ 'من لم یذق لم یدر' یعنی۔ لذت ایں مے نہ شناسی بخدا تانہ چشی کچھ دن ہوئے ایک بڑے اچھے ذی علم اور ذہین صاحب قلم دوست کی ایک تحریر کے مطالعہ کا اتفاق ہوا تھا، جس میں انہوں نے تصوف پر اظہار خیال فرمایا

تھا، کم از کم ناچیز کو تو ایسا کچھ محسوس ہوا کہ کوئی بڑا ذہین بچہ کسی ایسے موضوع پر اظہار خیال کر رہا ہے، جس کے مبادی سے بھی واقفیت حاصل کرنے کا اس کو موقع نہیں ملا ہے، مگر پھر بھی اس کی ذہانت قابل داد ہے۔

(۶) تصوف اور اس کے بعض حلقوں کے اس چند روزہ قرب و تعلق سے بھی یہ اندازہ ہوا کہ جس طرح دین کے دوسرے شعبوں کی طرف، اچھی صلاحتیں رکھنے والے افراد فی زمانہ بہت کم متوجہ ہوتے ہیں، مثلاً دیکھا جارہا ہے کہ علم دین کے طالبوں اور علیٰ ہذا دین کی دعوت وخدمت کی طرف توجہ کرنے والوں میں، بہت بڑی تعداد آج کل ان ہی بے چاروں کی ہوتی ہے، جو صلاحیتوں کے لحاظ سے بہت ادنیٰ اور پست درجہ کے ہوتے ہیں، بالکل یہی، بلکہ شاید دین کے دوسرے شعبوں سے زیادہ افسوسناک اور ابتر حال اس لحاظ سے دین کے اس شعبہ (تصوف) کا بھی ہے۔ اس وقت ان ''خانقاہوں'' سے بحث نہیں، جو دراصل دھوکہ فریب کی دکانیں ہیں اور جہاں اولیاء اللہ کے نام پر شرک وبدعت کا کاروبار ہوتا ہے اور نہ یہاں ان نااہل موروثی سجادہ نشینوں اور پیشہ ور پیروں، صوفیوں کا ذکر ہے، جو تصوف کے نام اور بزرگوں کی نسبت کی تجارت کرتے ہیں، بلکہ جو واقعی مشائخ حق اور صاحب ارشاد ہیں، ان کے پاس بھی جو طالب بن کر اب آتے ہیں، دیکھا جاتا ہے کہ (شاذ و نادر مثالوں کو مستثنیٰ کرکے) دل و دماغ کی صلاحیتوں کے لحاظ سے وہ بے چارے عموماً نیچی ہی سطح کے ہوتے ہیں، اور اگرچہ اپنے اخلاص اور اپنی صادق طلب اور محنت سے ان میں سے بھی بہت اس شعبہ کی کچھ برکتیں ضرور حاصل کرلیتے ہیں، لیکن ظاہر بات ہے کہ وہ بیچارے خانقاہیت کی بدنامی اور تصوف و روحانیت بیزاری کے اس دور میں دین کے اس شعبہ اور افادیت تسلیم کرنے پر لوگوں کو مجبور کردے۔

اصولی بات یہ ہے کہ جو کام جتنا زیادہ بلند اور لطیف و نازک ہو، اس کے کرنے والے بھی اسی درجہ کے ہونے چاہئیں۔ موجودہ دور میں تصوف کی ناکامی اور

بدنامی کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ جو اس کے اہل ہیں، وہ توجہ نہیں دیتے اور جو بیچارے توجہ کرتے ہیں، عموماً ان کی صلاحیتیں معمولی ہوتی ہیں، لیکن دنیا ان ہی کو پھل سمجھ کر اصل درخت کے متعلق رائے قائم کرتی ہے۔

(۷) اس موقع پر ایک چیز خود مشائخ کرام کے متعلق بھی ناظرین سے بے تکلف عرض کرنا ضروری ہے۔

جس طرح دنیا میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ جو کامیاب وکیل ہو، وہ اچھا ڈاکٹر بھی ہو اور جو بالغ النظر فلسفی ہو، وہ سیاسیات یا معاشیات کا ماہر بھی ہو اور جو ماہر فن انجینئر ہو، وہ اچھا ادیب اور شاعر بھی ہو۔ بعینہٖ یہی حال دین کے مختلف شعبوں کا بھی ہے، بالکل ضروری نہیں ہے کہ جو شخص وسیع النظر عالم اور بلند پایہ محدث یا فقیہ ہو، وہ تصوف میں بھی خاص دستگاہ رکھتا ہو، یا جو صاحب قلم صوفی اور عارف ہو، وہ اسلامی قانون کا ماہر بھی ہو اور عہد حاضر کے اہم مسائل کے بارے میں دینی نقطۂ نظر سے صحیح رائے قائم کرنے والی مجتہدانہ فکر و بصیرت بھی رکھتا ہو، بلکہ حقائق اور واقعات کی اس دنیا میں، پہلے بھی اکثر ایسا ہوا ہے اور ہمارے اس زمانہ میں تو قریباً ۹۰، ۹۵ فی صد ایسا ہی ہے کہ جو کسی ایک شعبہ میں ماہر اور کامل ہوتا ہے، وہ دوسرے شعبوں میں اکثر خام ہی ہوتا ہے، اس لئے اس زمانہ میں ایسے لوگ اکثر مایوس اور محروم ہی رہتے ہیں، جو صرف کسی ایسے ہی شخص سے استفادہ کرنا چاہتے ہوں، جو ان کے مفروضہ معیار کے مطابق ہر جہت سے کامل مکمل ہو۔

یاد آتا ہے راقم سطور نے ایک دوست سے اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے، ایک دفعہ عرض کیا تھا:

آپ ماضی اور حال کے ایسے متعدد حضرات سے یقیناً واقف ہیں، جن کی زندگی آپ کی نظر میں دین اور تقویٰ کا کوئی اچھا اور قابل تقلید نمونہ نہیں ہے اور بالخصوص اخلاص و احسان اور توکل وتسلیم جیسی اعلیٰ ایمانی صفات و کیفیات میں آپ

کے نزدیک، ان حضرات کا کوئی بھی خاص یا عام مقام نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود ان کا علم وفکر اور ان کی خداداد ذہانت اور بصیرت آپ کے خیال میں قابل استفادہ ہے اور ہم آپ ان کی چیزوں سے برابر استفادہ کرتے ہیں اور ان لوگوں کو غلطی پر سمجھتے ہیں، جو صرف اس لئے ان کی علمی اور تحقیقی کوششوں سے فائدہ نہیں اٹھاتے کہ وہ ان کی نیک خواہش کے مطابق کوئی بڑے بزرگ اور صوفی قسم کے آدمی نہیں ہیں۔ اسی طرح ہم اللہ کے کچھ بندوں کو ایسا پاتے ہیں، کہ انہوں نے اپنی زندگی میں تصوف اور سلوک پر زیادہ توجہ دی اور کسی شیخ کامل کی رہنمائی اور نگرانی میں اپنے وقت اور اپنی قوتوں کا بڑا حصہ اس شعبہ کی تحصیل اور تکمیل پر صرف کیا اور اس لئے اس میں انہیں اختصاص اور امتیاز کا مقام حاصل ہوگیا، لیکن کسی دوسرے شعبے میں مثلاً علم وفکر ہی ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ انہیں کوئی خاص بلندی حاصل نہیں ہے اور اس لئے دین کی بعض ضرورتوں کو جن کو ہم بہت اہم سمجھتے ہیں، وہ اچھی طرح محسوس بھی نہیں کرتے اور ملت کے مشکل اور اہم اجتماعی مسائل ہیں، وہ بہتر رہنمائی نہیں کرسکتے یا فرض کیجئے کہ مطالعہ یا غور و توجہ کی کمی کی وجہ سے وہ وقت کے بہت سے اہم معاملات کو صحیح طور پر سمجھتے بھی نہیں، تو ان خامیوں کو دیکھ کر ان کے اس کمال کی بھی نفی کرنا، جو واقع میں ان کو حاصل ہے اور اپنی احتیاج کے باوجود اس شعبہ میں بھی ان سے ہمارا استفادہ نہ کرنا، ان ہی لوگوں جیسی عامیانہ غلطی ہے، جن کو تنگ نظری اور تاریک خیال کا مریض سمجھا جاتا ہے۔"

اس میں شک نہیں کہ جی تو اپنا بھی یہی چاہتا ہے اور ہر اچھا بھلا آدمی بھی چاہے گا، کہ جو شیخ خانقاہ اور عارف حق آگاہ ہو، وہ بلند پایہ مفسر و محدث اور بالغ النظر فقیہ و مجتہد بھی ہو، بلکہ ساتھ ہی ملت کی قیادت اور امامت کبریٰ کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کی بھی پوری صلاحیتیں رکھتا ہو، اور اسی طرح جو اچھی نظر وفکر رکھنے والا

عالم دین ہو، وہ اسلامی شریعت و قانون میں مہارت رکھنے کے علاوہ امت کی قیادت اور حکومت کے نظام کو چلانے کی اعلیٰ صلاحیت بھی رکھتا ہو، اور مزید براں اپنے قلب و باطن کے لحاظ سے اپنے دور کا جنیدؒ و بایزیدؒ بھی ہو۔ لیکن یہ صرف ہمارے جی کی چاہت اور ایک خوش گوار تمنا ہوئی اور یہ دنیا جس میں ہم رہتے ہیں، وہ خیالات اور تمناؤں کی دنیا نہیں ہے۔ بلکہ حقائق واقعات کی دنیا ہے اور عملی آدمی کو اپنا طرز عمل واقعات ہی کی اس دنیا کو سامنے رکھ کر متعین کرنا چاہیے۔

جن صاحب خانقاہ بزرگ کی خدمت میں، اپنی حاضری کا ذکر راقم سطور نے گذشتہ صفحات میں کیا ہے، ان ہی کی زبان سے کئی بار یہ حکیمانہ ارشاد سنا ہے:

"یہ وہ زمانہ نہیں ہے کہ کسی ایک ہی دکان پر سب سودے اچھے مل سکیں، اس لئے جو سودا جس دکان پر اچھا ملے، اس کیلئے آدمی کو اسی دکان پر جانا چاہئے۔"

یہاں تک جو کچھ عرض کیا، اس میں راقم کا روئے سخن تصوف کی مخلص ناقدین اور منکرین کی طرف تھا، اب اپنے تجربے ہی کی چند نتیجے اور چند تاثرات و تصوف کے عالموں اور حامیوں سے بھی عرض کرتے ہیں۔

(۸) تصوف کے مقصد اور اس کی حیثیت کے متعلق، جو کچھ پہلے عرض کیا ہے، اگرچہ خود اپنے کو بحمداللہ اس میں شک نہیں رہا ہے کہ اصلیت وہی ہے، لیکن بعض مشائخ حق اور ان کی خانقاہوں سے طلب اور عقیدت کا تعلق رکھنے والوں میں بھی بہت سے ایسے لوگ دیکھے ہیں جن کا ذہن اس بارے میں صاف نہیں ہوتا اور وہ طرح طرح کی غلط خیالیوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ مثلاً تصوف کے جن اعمال و اشغال کی حیثیت، اس کے سوا کچھ نہیں ہے، کہ بعض کیفیات پیدا کرنے کا وہ ذریعہ اور وسیلہ ہیں، خانقاہوں میں بکثرت ایسے لوگ ملتے ہیں، جو ان اعمال واشغال ہی کو گویا اصل سلوک سمجھتے ہیں، اسی طرح ان اعمال واشغال اور اذکار کے بعض وہ آثار

جن کے متعلق تمام مشائخ محققین یہ فرماتے ہیں کہ:

"ان کی کوئی اہمیت نہیں، بلکہ یہ ایک طرح کے 'اوہام' وخیالات ہیں۔"

تصوف کے ہمارے حلقوں سے تعلق رکھنے والے بہت سے حضرات، ان ہی کی طلب میں الجھے ہوئے ملتے ہیں، اسی طرح اور بھی بہت سی غلطیاں اور الجھنیں ہیں، جن میں خانقاہی طالبین بکثرت مبتلا ہیں، غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے بعض بزرگ ذہنوں کی طرف پوری توجہ نہیں فرماتے۔ حالانکہ یہ بڑے اہم درجہ کی ضرورت ہے اور اس ناچیز کا خیال ہے کہ سلوک وطریقت کے جن حلقوں میں، پہلے کبھی گمراہیوں نے جگہ پائی ہے، وہ بعض ایسے بزرگوں کی اس طرف سے بے توجہی کا نتیجہ ہے، جو خود ہمارے نزدیک ان گمراہیوں میں مبتلا نہ تھے۔ تصوف کی تاریخ ہی کچھ ایسی ہے کہ مشائخ اگر پوری طرح چوکنے نہ رہیں اور اپنے طالبین اور معتقدین کے ذہنوں کی صفائی اور خیالات کی اصلاح کی فکر نہ رکھیں، تو شیطان کی گمراہ کرنے والی کوششیں اس حلقے میں بڑی آسانی سے کامیاب ہوسکتی ہیں۔ بہرحال ہمارے بزرگوں کو اس خطرے سے غفلت نہیں برتنی چاہئے اور اذہان وخیالات کی صفائی اور اصلاح کو ذکر شغل سے بھی مقدم سمجھنا چاہئے۔

(۹) ائمہ تصوف امام ربانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ وغیرہ نے اس پر بڑا زور دیا ہے، کہ طالب کو پہلے ضروری عقائد کی تصحیح اور بقدر علم دین حاصل کرنا چاہئے اور اس کو شیخ کے فرائض میں گردانا ہے کہ وہ اگر طالب اور مرید میں یہ کمی دیکھے تو اس کو اس طرف متوجہ کرے، لیکن بعض مشائخ کے یہاں اس ذمہ داری کے احساس اور اس کے عملی اہتمام میں بہت کمی دیکھنے میں آئی، بہت سے بیچارے سیدھے سادے ایسے بندے بھی ان کی خدمت میں بیعت کے لئے آتے ہیں، جن کی باتوں سے اور جن کے ظاہری حال سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان بیچاروں کو دین کی وہ

ضروری اور بنیادی باتیں بھی معلوم نہیں، جو ہر مسلمان کو معلوم ہونا چاہئیں اور بہت واضح اندازہ اس بات کا ہوتا ہے کہ غالباً ان کو صحیح نماز پڑھنا بھی نہ آتی ہوگی، لیکن کبھی کبھی دیکھا گیا ہے کہ ایسوں کو بھی مشائخ کے عام طریقے پر تجدید ایمان اور توبہ کراکے، بس بیعت کرلیا گیا اور پڑھنے کے لئے کوئی تسبیح ان کو بتادی گئی اور بقدر ضرورت دین سیکھنے کی طرف نہ کوئی توجہ دلائی گئی اور نہ اس کا کوئی انتظام فرمایا گیا، حالانکہ ان حضرات کے لئے یہ بہت آسان ہے کہ ایسے جو لوگ بھی ان کے پاس آئیں، ان کو دو چار دن کے لئے ان کی ضروری تعلیم (عقائد اور نماز کی تصحیح وغیرہ) کسی خادم کے سپرد کردی جائے، جیسا کہ نئے آنے والوں کے متعلق رسول اللہ (ﷺ) کا دستور تھا۔

ممکن ہے کہ ان بزرگوں کی اس بے توجہی کا سبب یہ ہو کہ ان آنے والوں کی اس درجہ جہالت اور دین کی بنیادی چیزوں سے بھی اتنی ناواقفیت کا، ان حضرات کو اندازہ نہ ہوتا ہو، لیکن عرض یہی کرنا ہے کہ اس طرف ان حضرات کی توجہ کا مبذول نہ ہونا اور اس پہلو پر نظر نہ کرنا، ان کے ذمہ دارانہ منصب کے شایان شان نہیں۔ کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیة.

(۱۰) تصوف کی تاریخ پر جن حضرات کی نظر ہے، ان سے یہ بات مخفی نہ ہوگی کہ مختلف زمانوں میں اس راہ سے کیسی گمراہیاں امت میں داخل ہوئی ہیں، اور آج بھی اپنے تصوف وصوفیہ کی طرف منسوب کرنے والوں حلقوں میں کتنی بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے، جن کے تصورات اور اعمال، اسلام اور توحید کی بہ نسبت کفر اور شرک سے زیادہ قریب ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جنہیں واقفیت اور بصیرت دی ہے، وہ جانتے ہیں کہ خانقاہی حلقوں میں اس قسم کی گمراہیاں زیادہ تر بزرگوں کے ساتھ عقیدت اور خوش اعتقادی میں غلو اور تعظیم میں افراط سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے

شریعت وسنت کے حامل اور اپنی دینی ذمہ داریوں کو محسوس کرنے والے، مشائخ حق کا خاص الخاص فریضہ ہے کہ وہ اپنے سے تعلق ومحبت رکھنے والوں کو اعتقادی اور عملی غلو اور افراط کی اس بیماری سے محفوظ رکھنے کی طرف، ہمیشہ پوری بیداری کے ساتھ متوجہ رہیں اور اس معاملہ میں ہرگز تساہل سے کام نہ لیں۔ رسول اللہ (ﷺ) کا اسوۂ حسنہ ہمارے بزرگوں کے سامنے رہنا چاہئے۔

حدیث شریف میں ہے کہ ایک دفعہ کسی صحابیؓ کی زبان سے نکل گیا "ماشاء اللہ وشئت" (یعنی جو اللہ چاہے اور جو آپ چاہیں) حضور کریم (ﷺ) نے ان کو سخت تنبیہ کی اور فرمایا:

جعلتنی للہ ندًا بل ماشاء اللہ وحدہ.

تو نے مجھے اللہ کے برابر بنادیا، بلکہ یہ کہو کہ 'جو تنہا خدا چاہے'۔

ایسے ہی ایک اور موقعہ پر بعض صحابہؓ کو تنبیہ کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا:

لایستھوینکم الشیطان انا محمد بن عبداللہ ورسولہ ما احب ان ترفعونی فوق منزلتی انزلنی اللہ.

لوگو! تمہیں شیطان گمراہ نہ کرے اور تم اس کے بہکاوے میں بہک نہ جاؤ، میں عبداللہ کا بیٹا محمد ہوں۔ اللہ کا بندہ اور بس اس کا رسول ہوں، میں نہیں چاہتا کہ تم مجھے اس درجہ سے اوپر اٹھاؤ جہاں خدا نے مجھے رکھا ہے۔

اس بارے میں رسول کریم (ﷺ) کی نظر کتنی باریک بیں تھی اور آپ ﷺ کس قدر محتاط تھے، اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیجئے جو صحاح میں مروی ہے کہ جس روز آپ کے صاحبزادے "ابراہم" علی ابیہ وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی وفات ہوئی، اتفاق سے اسی روز سورج کو گہن لگ گیا اور آپ کو شبہ ہوا کہ لوگ کہیں اس غلط خیالی

میں مبتلا نہ ہوجائیں کہ سورج کو یہ گہن بیت نبوی کی اس حادثہ کی وجہ سے لگا ہے، تو آپ ﷺ نے اسی وقت اعلان کراکے، لوگوں کو مسجد جمع کرایا اور اللہ کی حمد وثنا کے بعد اعلان فرمایا:

ان الشمس والقمر آیتان من آیت اللہ لاینکسفان لموت احد ولا لحیاتہ الخ.

چاند اور سورج، اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں دو نشان ہے، کسی کی موت و حیات سے ان کو گہن نہیں لگتا، (بلکہ اللہ کے مقرر کئے ہوئے، حساب کے مطابق اور اس کے حکم سے ایسا ہوتا ہے)۔

تصوف کے بعض اشغال کی

نوعیت وحیثیت

۱-۱ ایک صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ:

''تصوف کی جو اہمیت آپ کے اس مقالہ سے ظاہر ہوتی ہے، اگر واقعتہً اس کی اتنی ہی اہمیت ہے تو رسول اللہ (ﷺ) نے اس کے متعلق اور اس کے اعمال واشغال سے متعلق صریح احکام کیوں نہیں دیئے؟ یہ بات بالکل سمجھ میں نہیں آتی کہ کوئی چیز دین میں اس قدر ضروری ہو کہ ایمان و اسلام کی تکمیل اس پر موقوف اور رسول اللہ (ﷺ) نے امت کو اس کی تعلیم نہ دی ہو۔''

معلوم ہوتا ہے، ان صاحب نے میرے مقالہ کو بالکل غور سے نہیں پڑھا، میں نے جو کچھ اس میں لکھا ہے، اس کا حاصل ہی یہ ہے کہ تصوف کا جو مقصود ہے اور جو اس کی غائیت اور غرض ہے (یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت وخشیت اور یقین واستحضار اور اخلاص واحسان جیسی کیفیات کا حاصل کرنا)، سو اس کی تو دین میں اہمیت ہے اور یقیناً ایمان و اسلام کی تکمیل اس پر موقوف ہے اور بلاشبہ رسول اللہ ﷺ نے پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ امت کو اس کی تعلیم و ترغیب بھی دی ہے، کتاب و سنت کے جو نصوص اس سلسلہ میں پہلے لکھے جاچکے ہیں، وہ اس کے ثبوت کے لئے کافی سے زائد ہیں۔ رہے اس کے خاص اعمال و اشغال (مثلاً اذکار و مراقبات وغیرہ تو میں بہ صراحت لکھ چکا ہوں کہ یہ اس کے صرف وسائل اور ذرائع ہیں اور اس قسم کے ذرائع اور وسائل کے متعلق نبوی ﷺ طریق تعلیم اور اصول تشریع کا تقاضا یہی ہے کہ ان کی تصریح اور تعین نہ کی جائے، تاکہ ہر زمانے کے حالات کے مطابق جو جائز ذرائع اور وسائل مناسب سمجھے جائیں، انہیں اختیار کیا جاسکے اور اس

میں تصوف کی کوئی خصوصیت نہیں، بلکہ دین کے دوسرے شعبوں کا حال بھی یہی ہے غور فرمایا جائے، دین کا سیکھنا سکھانا دین کے بنیادی فرائض میں ہے، لیکن کتاب و سنت میں اس کے طریقے کی بھی کوئی تعین نہیں کی گئی۔

اسی طرح قرآن مجید کی حفاظت اور اشاعت امت کا کتنا اہم فریضہ ہے، لیکن رسول پاک (ﷺ) نے اس کے متعلق یہ بھی نہیں بتایا کہ تم اس کے لئے فلاں فلاں طریقے اختیار کرنا، حتیٰ کہ جب عہد صدیقی میں یمامہ کی جنگ میں چار سو حافظ قرآن صحابہؓ شہید ہوگئے، تو سب سے پہلے حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کو یہ خیال ہوا کہ سینوں میں محفوظ کرنے کے علاوہ ہمیں قرآن کو سفینوں میں محفوظ کرنے کا بھی انتظام کرنا چاہئے اور اس سلسلہ میں خاص اہتمام اور ذمہ داری سے ایک سرکاری نسخہ بھی تیار ہونا چاہئے، چنانچہ انہوں نے اپنی یہ تجویز حضرت ابوبکر صدیق (رضی اللہ عنہ) کے سامنے پیش کی، حضرت ابوبکر صدیق (رضی اللہ عنہ) کو ابتداء اس کے ماننے میں تامل ہوا اور انہوں نے یہی فرمایا، کہ جس چیز کو رسول اللہ (ﷺ) نے نہ تو کیا اور نہ ہمیں اس کا حکم دیا، اس کا ہم کیوں اہتمام کریں، لیکن حضرت عمرؓ کے دلائل سے بالآخر مطمئن ہوگئے اور پھر انہی کے حکم سے حضرت زید بن ثابت انصاریؓ کی خاص نگرانی میں یہ کام انجام پایا۔ پھر حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) نے اس سلسلے میں ایک اور قدم اٹھایا کہ اپنے خاص اہتمام سے اور اپنی نگرانی میں اس مصحف کی نقلیں کراکر، تمام بلاد اسلامیہ میں روانہ کیں، اور اس وقت سے لیکر، اب تک قرآن مجید کی حفاظت واشاعت، تعلیم وتعلم اور ترجمہ وتفسیر کے سلسلے میں خدمت قرآن کے کتنے ہی نئے نئے قدم اٹھائے جاچکے ہیں۔

پس یہ خیال کہ جو چیز دین میں اہم ہو، اس کے ذرائع اور وسائل کی تصریح اور تعین بھی کتاب و سنت مین ہونی چاہئے اور امت کی قیامت تک کی دینی ضروریات کے متعلق تفصیلی اور جزئی ہدایات، ہمیں تصریح اور تعین کے ساتھ کتاب و

سنت میں ملنی چاہئیں، بہت ہی سطحی قسم کا مغالطہ ہے اور انبیاء علیہم السلام کے طریق تعلیم اور اصول تشریع سے ناواقفی کا نتیجہ ہے۔

۲- ایک صاحب نے دریافت کیا کہ:

اللہ کی محبت وخشیت اور اخلاص و احسان وغیرہ ایمان کی کیفیت پیدا کرنے کے لئے، تصوف میں جن اعمال واشغال (مثلاً صحبت شیخ اور اذکار ومراقبات وغیرہ) پر زور دیا جاتا ہے، کیا کتاب سنت میں کہیں اس کا اشارہ ملتا ہے کہ ان چیزوں سے یہ کیفیات پیدا ہوسکتی؟

اس کے جواب میں عرض ہے کہ اگرچہ واقعہ یہی ہے کہ اس عاجز کے نزدیک صحبت اور ذکر فکر کا قلب پر اثر انداز ہونا، کتاب وسنت سے اشارۃً ہی نہیں، بلکہ صراحۃً بھی معلوم اور ثابت ہے۔ لیکن اگر بالفرض کتاب وسنت میں اس کا کوئی اشارہ بھی نہ ہو، تب بھی اصل مدعا پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ جب اسلام کی تیرہ سو سالہ کی تاریخ میں اللہ تعالیٰ کے لاکھوں صالح بندے اپنا یہ تجربہ بیان کررہے ہیں کہ ان اعمال صالح سے یہ کیفیات پیدا ہوجاتی ہیں تو ان کی اس تاثیر اور افادیت کو ہمیں مان لینا چاہیے۔

میرے جن دوست نے یہ سوال کیا ہے، وہ "صالح لٹریچر" کے ذریعہ اصلاح پر بہت یقین رکھتے ہیں، (مجھے بھی اس سے انکار نہیں ہے) لیکن وہ سوچیں، کیا کبھی ان کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ ان کے "صالح لٹریچر" کی اس تاثیر کے متعلق کوئی اشارہ کتاب وسنت میں موجود ہے؟ میرا خیال ہے کہ ان کے دل میں کبھی بھی یہ سوال پیدا نہ ہوگا، کیونکہ وہ اپنے ذاتی علم وتجربے سے اور اپنے جیسے بہت سے لوگوں کے تجربے سے اس بارے میں مطمئن ہیں۔ عجیب بات ہے کہ اپنی چیزوں اور اپنے تجربوں کے ساتھ تو ہمارا طرز عمل یہ ہے، لیکن حضرت جنید بغدادیؒ سری سقطیؒ، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، خواجہ شہاب الدین

سہروردیؒ، مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ، شاہ ولی اللہؒ، سید احمد شہیدؒ جیسے ہزاروں بندگان خدا کا اجماعی اور اتفاقی تجربہ بھی ہمارے لئے موجب اطمینان نہیں۔

۳- ایک صاحب نے ذکر میں جہر اور ضرب سے اپنا سخت طبعی انقباض ظاہر کیا ہے اور یہ خیال ظاہر فرمایا ہے کہ:

"اس میں ریاکاری کا شبہ ہوتا ہے اور آج کل کے اکثر سنجیدہ حضرات اس کو ریاکاری ہی سمجھتے ہیں۔"

جہری اور ضربی ذکر سے، طبعی انقباض تو ایک ذوقی اور طبعی چیز ہے، اس لئے اس کے بارے میں کچھ عرض کرنے کی حاجت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی طبیعتیں اور ان کے ذوق بہت مختلف بنائے ہیں، بعض طبیعتیں وہ بھی ہیں، جنہیں جہری اور ضربی ذکر ہی سے انس اور سکون حاصل ہوتا ہے، اسی لئے مشائخ محققین طبیعتوں کے رخ اور ان کی مناسبتوں کو دیکھ کر جہری یا سری ذکر یا دوسرے اشغال ان کے لئے تجویز کرتے ہیں، لیکن ذکر بالجہر کے بارے میں ریاکاری کا جو شبہ ظاہر کیا گیا ہے یہ میرے نزدیک بالکل بے سوچی سمجھی بات ہے۔ اس زمانہ میں جب کہ بقول انہیں صاحب کے سنجیدہ آدمی ذکر بالجہر کو ریاکاری سمجھتے ہیں، اپنا اندازہ یہی ہے کہ کسی کو بالجہر ذکر کرتا دیکھ کر، لوگ اس کے معتقد نہیں ہوتے، بلکہ بہت سے آدمی اس کو کم عقل یا مکار اور ریاکار سمجھتے ہیں، پر ایسی حالت میں جہری ذکر میں، ریاکاری کا امکان فی زمانہ بہت کم ہے، بلکہ اپنا تجربہ تو یہ ہے کہ آج کل کے ماحول میں ذکر بالجہر اکثر ریاشکنی کا ذریعہ ہوجاتا ہے اور دفع خطرات وساوس میں ذکر بالجہر کی تاثیر اہل تجربہ کے نزدیک بالکل مسلم ہے۔

اس سلسلہ میں اتنی بات یہاں اور قابل ذکر ہے کہ ذکر میں جہر اور ضرب کے جو طریقے تصوف کے بعض سلاسل میں معمول ہیں، فن طب اور علم النفس کی روشنی میں ان کی روشنی میں ان کی افادیت اور تاثیر بڑی آسانی سے سمجھ آجاتی ہے۔ یہ

عاجز تو تصوف کے اکثر اشغال کے متعلق یہی سمجھتا ہے کہ بعض کیفیات اور تاثرات اپنے اندر پیدا کرنے کے لئے، سب ایک طرح کی طبی اور نفسیاتی تدبیریں ہیں۔

۴- ایک صاحب نے فرمایا کہ:

"تم نے اپنے مقالہ میں مقامات اور لطائف پر کوئی روشنی نہیں ڈالی، حالانکہ یہ تصوف کے وہ عناصر ہیں، جنہیں سمجھے سمجھائے بغیر تصوف کو نہیں سمجھا جاسکتا۔"

جواباً گذارش ہے کہ اس عاجز کے نزدیک لطائف و مقامات کو کوئی مقصدی اہمیت حاصل نہیں، اور اس راہ کے جن بزرگوں کی خدمت میں حاضری اور ان کے ارشادات سننے کی سعادت راقم کو نصیب ہوتی رہی ہے، ان سب سے بھی ہمیشہ یہی سنا کہ یہ لطائف وغیرہ راستہ چلنے والوں کے اپنے محسوسات اور انکشافات ہیں۔ نہ یہ خود مقصود کے لئے ذریعہ، اور اس لئے اس کو اہمیت دینا نہ صرف یہ کہ غیر صحیح ہے۔ بلکہ اصل مقصد کیلئے مضر ہیں، پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ ان چیزوں میں ہر راہرو کا ادراک یکساں ہی ہو، بلکہ بعض اکابر سے سنا کہ اللہ کے بہت سے بندے ایسے بھی ہوتے ہیں، جو سلوک کی راہ میں اللہ تعالیٰ کی عنایت و توفیق سے بہت تیزی سے ترقی کرتے ہیں اور سلوک و تصوف جو اصل مقصد ہے، وہ ان کو بفضل تعالیٰ نصیب ہوتا ہے اور آخر تک انہیں کسی لطیفہ اور کسی مقام کا بھی ادراک اور احساس نہیں ہوتا۔

اس عاجز کو اس دور کے جن اکابر سلوک سے شرف نیاز حاصل ہوا، ان سب کو اس بات پر متفق پایا کہ خاص کر، اس زمانہ کے لئے یہی اجمالی سلوک زیادہ مناسب ہے اور محققین نے تصریح فرمائی ہے کہ صحابہ کرامؓ کا سلوک بھی اجمالی ہی تھا۔

۵- ایک صاحب نے فرمایا کہ:

"ہم بہت سے آدمیوں کو دیکھتے ہیں کہ برسوں خانقاہ میں رہنے اور ذکر شغل کرنے کے باوجود، ان میں وہ چیزیں پیدا نہیں ہوتیں، جن کے لئے تصوف اور

خانقاہیت کی ضرورت بتلائی جاتی ہے۔"

بلاشبہ یہ بات بڑی حد تک صحیح ہے۔ لیکن انصاف فرمایا جائے یہ حال اب صرف خانقاہوں ہی کا نہیں ہے، بلکہ ہمارے دینی مدرسوں اور دوسرے تمام دینی اصلاحی سلسلوں کا حال بھی اس وقت یہی ہے کہ سینکڑوں میں دس بیس مشکل سے نکلتے ہیں، تو کیا ان سب کو غلط اور فضول قرار دے کر، ایک دم ختم کر دینا صحیح طرز عمل ہوسکتا ہے۔ صحیح طریق کار ان حالات میں یہ ہے کہ ہر سلسلہ اور ہر ادارہ کو زیادہ مفید اور کار آمد بنانے کی ہر ممکن کوشش اور تدبیر کی جائے اور اس میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا جائے۔ لیکن نتائج میں کمی اور نقص دیکھ کر، اس کو سرے سے ختم کردینے اور فضول قرار دینے کا فیصلہ نہ کیا جائے، جن ناسازگار حالات میں اور جس انتہائی درجہ کے فاسد اور سخت مادہ پرستانہ ماحول میں ہمارے ان دینی اداروں کو کام کرنا پڑ رہا ہے، ان میں دس پانچ فی صدی کی کامیابی بھی ہرگز ناکامی نہیں ہے۔

۶- ایک صاحب نے فرمایا کہ:

"صوفیوں کے طرز عمل سے جو کچھ ہم نے سمجھا ہے، وہ تو یہ ہے کہ تصوف دراصل "رہبانیت" اور گوشہ نشینی کا نام ہے اور اس کی تائید کرنا دراصل اسلام میں رہبانیت کو داخل کرنا ہے۔"

میرے نزدیک یہ بھی ان ہی باتوں میں سے ہے، جو اس سلسلہ میں بے سوچے سمجھے کی جاتی ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں، دراصل خود ان کے دل میں تصوف کے غلط معنی بیٹھے ہوئے ہیں، اور وہ اپنی غلط فہمی کی بنا پر صوفی صرف ان ہی لوگوں کو سمجھتے ہیں، جو رہبانیت پسند ہیں اور گوشہ گیر ہیں، اور پھر اپنے اسی تصور کو بنیاد پر وہ کہتے ہیں کہ تصوف رہبانیت کا نام ہے اور ہر صوفی "راہب" ہی ہوتا ہے۔ اگر یہ حضرات خود اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوتے اور تصوف کے لئے رہبانیت اور گوشہ گیری کو ضروری نہ سمجھتے، تو اس دور میں بھی ایسے

بہت سے بندگان خدا دیکھ سکتے تھے، جو بحمداللہ سچے صوفی بھی ہیں اور مرد میدان بھی، مگر بات وہی ہے کہ جو گوشہ گیر نہ ہو، یہ بیچارے اپنی کم نگاہی سے اس کو صوفی مان ہی نہیں سکتے، اس کا علاج تو خود اپنے علم اور تصور کی تصحیح سے ہی ہوسکتا ہے۔

۷- مقالہ کے ابتدائی حصے میں جن بزرگ کی خدمت میں حاضری کے متعلق ان بزرگ سے اپنی گفتگو کا اس عاجز نے ذکر کیا ہے، بعض حضرات کا شدید اصرار ہے کہ ان کا اسم گرامی ظاہر کیا جائے اس لئے عرض کرتا ہوں کہ میرے وہ محسن اور مخدوم بزرگ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رائپوری مدظلہ ہیں۔

آخری بات

آخر میں عرض کرنا ضروری ہے کہ یہ ناچیز اس تصوف کا قائل اور حامی ہے، جس کا ذکر اس مقالہ میں کیا گیا ہے، اور یہی اہل حق کا تصوف ہے، باقی اس نام سے سینکڑوں خانقاہوں میں شرک و بدعت کا جو کاروبار ہوتا ہے، اللہ نے اپنے جس بندے کو بھی ایمانی بصیرت کا کوئی ذرہ نصیب فرمایا ہو، وہ یقیناً اس سے بیزار ہوگا۔

خانقاہ وخلافت

روحانیت اور عملی جدوجہد کا باہمی تعلق

تقویٰ مجمل طور پر وہ قلبی کیفیت اور صلاحیت ہے، جو نفسانی خواہشات سے علیحدہ ہوکر، کسی انسان کو نیکی کی طرف رجوع ہونے کے لیے آمادہ کرتی ہے۔ تقویٰ کا ادنیٰ درجہ، اسی فطری صلاحیت کے کسی نہ کسی درجے پر موجودگی کا نام ہے، جو باوجود ماحول کی گندگی اور سالہا سال کی بداعمالی کے ختم اللہ علیٰ قلوبھم سے قبل فنا نہیں ہوتی۔ تقویٰ کی تدریجی بلندی، اسی کیفیت وصلاحیت کی قوت حاصل کرتے ہوئے، تمام نیک وبد، حدود الٰہی کی نگرانی کرتا ہے۔ اس قوت کا تدریجی حصہ ایمان، عبادات اور عمل صالح پر منحصر وموقوف ہے۔ حصول فلاح کے لیے ھدی للمتقین الذین یومنون بالغیب ویقیمون الصلوۃ ومما رزقناھم ینفقون۔ کی شرط لگائی گئی ہے۔ اس تقوے سے مراد یہی مجمل اور کمتر درجہ کی صلاحیت ہے اور بتدریج بلندی پر اولئک علیٰ ھدی من ربھم واولئک ھم المفلحون کی بشارت دی جاتی ہے۔

یہ تقویٰ کی فطری قوت وصلاحیت، انسان کو پس پردہ عالم سے ملائے رکھتی ہے۔ اس کی پہلی منزل یومنون بالغیب میں قدم رکھنا اور پس پردہ عالم سے آنے والے پر ایمان لانا۔ ہر حاضر دربار ہونے والا، تقویٰ کی صلاحیت فطری کی بنا پر آپ کی دعوت الی اللہ میں آپ کی سیرت و کردار میں، آپ کے اخلاق وصفات حسنہ میں، آپ کے عدل، انصاف میں، آپ کی مساوات میں، آپ کے عفو وکرم اور آپ کی شفقت میں، آپ کے عزم وثبات اور استقلال میں، آپ کے چہرہ پر برسنے والے انوار میں، ایمان وایقان سے معمور نظروں کی تابانی میں یتلوا علیھم

آیاته کی تفسیروں کو پاتا ہے۔ انہی آیات وبینات کے تسلسل وتکرار سے حاضر ہونے والے کے نفس کا تزکیہ ہوتا ہے۔ پھر وہ قرآن وحکمت کو پاتا ہے۔ لا یمسہ الا المطھرون، تنزیل من رب العلمین.

الم نشرح لک صدرک اور انا اعطیناک الکوثر کے انوار سے ہر مومن فیض پاتا ہے۔ صبغة الله ومن احسن من الله صبغة. رسول برحق کے رنگ میں رنگ جاتا ہے، اور صحابی کا دیکھنے والا اور رسول برحق کا اقرار کرنے والا، سیرت صحابہ سے فیضیاب ہوتا ہے۔ اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم. قرآن وحکمت سے منازل ترقی پر گامزن ہوتا ہے۔

اس عالم کے صفحات پر خاتم النبین ؐ کے اخلاق حسنہ، سیرت وکردار اور سرتاپا انوار مجسم اور منقش ہیں، اور قرآن کی تعلیمات انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون، کلی طور پر محفوظ ہیں۔ قرآن، سیرت وکردار نبوی کی تصدیق کرتا ہے اور سیرت وکردار نبوی، عملی طور پر اسکی تفسیر ہیں۔ ہر طالب حق، قرآن وسیرت، ہردو کو پیش نظر رکھتے ہوئے تقویٰ کے ادنےٰ درجے سے بلند مدارج کو پا سکتا ہے۔ نفوس قدسیہ، سیرت وکردار نبوی کے بالفعل ترجمان ہوتے ہیں۔ اس لیے انکی صحبتوں سے فیض پہونچتا ہے۔

مجرد فہم وادراک اور شعور وفکر کا تعلق عالم علوی سے ہے۔ احساسات وتجربات سے ان کی نشوونما ہوتی ہے۔ انسانی کلام، انہی احساسات کی شکل صورت وآواز ہے۔ تعلیم وتعلم ان تمام احساساتِ انسانی کے ہزار سال کے پیدا کردہ محفوظ تجربات ہیں۔

تقویٰ کا تعلق عالم باطن سے ہے اور عبد ورب کا تعلق تقویٰ سے ہے۔ ان تعلقات کی وضاحت آفاق وانفس میں اللہ کا کلام ہے۔ ذالک الکتاب لاریب فیه ھدی للمتقین، اللہ کا کلام عالم انسانی کے تعلق سے بصورت نطق وآواز ہے۔

اس کلام سے مخاطب پر بقدر استطاعت واستعداد عبد ورب کے تعلقات روشن ہوتے ہیں۔ اس علم ہی کے تحت فہم انسانی وجذبات انسانی کی صحیح تربیت اور نشوونما ہوتی ہے۔

کلمات بصورت کائنات، انسان کو تغیرات ارضی وسماوی سے اسباب وعلل کی کڑیوں میں پروان چڑھاتے ہیں۔ اور اللہ کا کلام بغیر اسباب وعلل کے انسانوں کی اندرونی اختیاری قوتوں کو عالم باطن کا انکشاف کر کے تقویت پہونچاتا ہے۔ استغفار، توبہ ودعا، استجابت ومغفرت اسی راست تعلق رحمت کا اظہار کرتے ہیں، یہاں اسباب وعلل اور تدریجی ارتقاء کی تمام نظر آنے والی کڑیاں ٹوٹ پھوٹ جاتی ہیں، اور مجرد عقل والے یہاں حیران وسرگرداں ہیں۔

انبیاء کی نبوت کسبی نہیں یہ فطری صلاحیتوں کی اجاگر شدہ قوت نہیں، یہ وہ قوت نہیں جوسوتی ہے اور پھر بیدار ہوتی ہے۔ یہ بیدار ہی بیدار ہے۔ کذالک اوحینا الیک روحا، من امرنا ماکنت تدری ماالکتاب ولا الایمان ولکن جعلنه نورا نهدی به من نشآء من عبادنا. یہی روح اور نور ہے، جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے والے پاتے ہیں۔ او من کان میتا فاحییناه وجعلنا له نورا یمشی به فی الناس کمن مثله فی الظلمت لیس بخارج منها.

تزکیہ بالقویٰ قوتوں کا باطن سے محفوظ شدہ کیفیات اور مسلسل طاری ہونے والی کیفیات سے اجاگر ہوجاتا ہے۔ اس مقام پر علم الیقین، باطن سے حق کی عطاء پاک سے کائنات پر حاکم اور متصرف نظر آتا ہے۔ مادیات سے آگے طاقتور وتوانا ہستی اس کائنات پر حاکم ومتصرف نظر آتی ہے۔ یہ نظر اور دید، ذکر مسلسل ہے۔ الذی یذکرون الله قیاما وقعودا وعلیٰ جنوبھم ویتفکرون فی خلق السموات والارض، ربنا ما خلقت هذا باطلا سبحانک فقنا عذاب النار.

عبد ورب کے ان تعلقات کی استواری اور تزکیہ سے تمام نفسانی خواہشات جاہ

دولت وحکومت مٹ جاتے ہیں۔ اور فرد وہ الھکم التکاثر حتیٰ زرتم المقابر سے بچ جاتا ہے۔

انسانی نظروں کے آگے اس عالم کی رنگارنگی اور نفوس انسانی کا ایک طوفانی سمندر موجزن ہے۔ اندرونی قوتوں کی بیداری کے بعد اس عالم مادی سے ان اجاگر شدہ قوتوں کا تقابل ہوتا ہے۔ دل سے اٹھنے والا نور جو نفوس انسانی کو باطل کی تاریک گھٹاؤں سے نور راہ حق کی طرف لانا چاہتا ہے، وہ سراج منیر ہے، جو عالم مادیات میں عالم انوار کی پیدائش کا متقاضی ہے۔

انسان صرف وحدت ہی کا مطالعہ نہیں کرتا۔ اسکے آگے کثرت ہے۔ اشیاء کائنات کے خواص وصفات اور نفوس انسانی کے مدارج ہیں۔ ان مدارج میں بلند ترین مدارج رسالت وخلافت کی معرفت اور دید ہے۔ یہ اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتی، جب تک کہ بندہ اللہ کے نور کے پھیلانے میں جدوجہد نہ کرے۔ اسی جدوجہد سے، نفس انسانی کا وہ تزکیہ ہوتا ہے، جس سے انسانیت کے بلند مدارج اس پر کھلتے ہیں۔ انہیں مدارج کی کشادگی جنت کے مقامات بلند ہیں۔ بغیر اس جدوجہد کے، کسی انسان پر رسالت وخلافت کے مدارج بلند کا انکشاف نہیں ہوتا۔ ان ہی اسرار کا انکشاف حکمت ہے۔ ومن یوتی الحکمة فقداوتی خیرا کثیرا. تزکیہ کی ابتدا نور سے ہے۔ ولقد انزلنا الیک آیات بینات ومثلا من الذین خلو من قبلکم وموعظة للمتقین. اللہ نور السموات والارض مثل نورہ کمشکواۃ فیھا مصباح، المصباح فی زجاجه الزجاجه کانھا کوکب دری یوقد من شجرہ مبارکه زیتونة لاشرقیة ولا غربیة ولایکاد زیتھا یضیء ولو لم تمسسه نار نور علیٰ نور یھدی اللہ لنورہ من یشاء. اس نور کو پا جانے کے بعد مقامات بلند کو پانے کے لیے حکم ہے۔ یاایھا الذین آمنوا لاتتبعوا خطوات الشیطان ومن یتبع الشیطان فانه یامر بالفحشآء والمنکر، ولولافضل اللہ

علیکم ورحمة ما زکیٰ منکم من احد ولکن اللہ یزکی من یشاء واللہ سمیع علیم. جو اس تعمیل حکم اور اس کی توفیق وفضل سے محروم رہا، اس کے لیے واتل علیھم نبا الذی آتینٰه آیاتنا فانسلخ منھا فاتبعه الشیطان فکان من الغٰوین ولو شئنا لرفعناہ بھا ولکنه اخلد الی الارض واتبع ھواہ فمثله کمثل الکلب، ان تحمل علیه یلحث اوتترکه کی وعید ہے۔

چومی گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلات لا الہ را

اسلام بنی نوع انسان کو اللہ کی طرف دعوت دینے میں فطرت انسانی کے منبع قلب کا تزکیہ کرتا ہے، جس سے وحدت کا انکشاف ہوتا ہے۔ اور کثرت کی طرف اسی نور میں عقل کو متوجہ کرتا ہے۔ عقل ونور کے اس امتزاج سے حکمت حاصل ہوتی ہے۔

انسان میں اسرار کائنات کو آشکارا دیکھنے کے لیے جذبات اور تمناؤں کا ایک طوفان پوشیدہ ہے۔ ان ہی اسرار کے کھلنے پر انسان نور میں چلتا ہے اور نور کی طرف دوڑتا ہے، جس سے دنیوی مال ومنال اور محبت غیر چھوٹتی جاتی ہے۔ یہی ایثار وقربانی ہے۔

اور مومنین کی خوشحالی نور کے پھیلانے اور باطل کے بجائے، نور کے چھا جانے میں ہے۔ تشریحات اور توضیحات ذہن انسانی کی جلا کے لیے ہوتے ہیں۔ اور انکے ذریعہ ملحدانہ رویہ سے بچاؤ ہوتا ہے، لیکن جذب وشوق کی پیدائش اور ایثار وقربانی نور ہی نور کی بنا پر ہوتی ہے۔

تزکیہ نفس اور تقوے سے اسباب وعلل اور قوانین طبعی، اپنی محدود عقل کے مطابق نہیں نظر آتے، جس سے کائنات غیر مقصود کی طرف رواں معلوم ہو۔ وقل

الحمدللہ سیریکم آیاتہ فتعرفونہا. انتشار میں مایوس وہی ہوتا ہے، جسکو آخرت کی خبر نہ ہو۔ جب دین اللہ جو کامل دین ہے، دنیا میں آیا تو اللہ تعالیٰ نے ایمان میں یہ بات، داخل کردی کہ جس طرح اولیت انکے ہاتھوں میں ہے، اسی طرح آخرت بھی انہیں کے ہاتھوں میں رہے گی۔

اسلام کے انوار، زندگی کی ہر شاہراہ پر رچ بس گئے ہیں اور اسلام میں ہر داخل ہونے والا ان قوتوں کو پاجاتا ہے۔ علماء، حکماء، متقین اور نفوس قدسیہ، ان انوار کو پھیلا رہے ہیں۔ تمدن وتہذیب کی گھٹا ٹوپ تاریکیوں میں اسلام ہی مساوات انسانی کا، حسن اخلاق کا، سیاسی ومعاشی اٹل قوانین وضوابط کا، ایثار وقربانی کی تعلیمات کا، توحید کا، رسالت کا، معاد کا علمبردار ہے۔ کلمۂ توحید نے عالم انسانی سے اپنی مسلسل سعی وتبلیغ میں کروڑہا کروڑ نفوس چن لیے۔ تعلیم وتزکیہ سے، نفوس کو تہذیب اسلامی سے آراستہ کیا، اخلاق حسنہ سے سنوارا۔ سیرت وکردار کے اعلیٰ نمونے تیار کیے، صفحۂ عالم پر انسانیت کے وہ درخشاں نقوش، منقش ومرتسم کیے کہ ہر نفس انسانی غیر شعوری طور پر ان ہی راہوں کو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ اور راہوں کو متعین کرنے کی سعی کرتا ہے۔

قوانین الٰہی کے تحت کوئی قوم کسی دوسری قوم پر مسلط ہوجاتی ہے، تو مغلوب وشکست خوردہ قوم آہستہ آہستہ اجتماعی وسیع دائروں سے محدود دائروں میں گرفتار ہوتی جاتی ہے، اسکا نظریہ حیات جو قوم کی قوم کو زندہ رکھتا ہے، معاشی حدود کی طرح سکڑتا ہوا محدود حلقوں میں مقید ہوجاتا ہے۔ یہی مقید نظریہ حیات، مکرر انقلابی دور کا پیدا کرنے والا اور حیات تازہ کا سرچشمہ ہوتا ہے۔

اسلامی نظریۂ حیات اور تزکیۂ نفس کا پہلو جو وسیع تر اجتماعات میں ہر پہلو پر حاوی تھا، سکڑتا ہوا محدود دائروں اور وسعتوں میں مقید ہوتا گیا۔ بہت سے حلقے آہستہ آہستہ شیطان کے مکر وفریب سے اخلد الی الارض واتبع ھواہ کے تحت

شکار ہوگئے۔ لیکن جن کے پاس آیات وبینات اور قرآن وحکمت ہے، وہ لاتتبعوا خطوات الشیطان سے مکرر انقلاب کے علمبردار ہونگے۔ وعداللہ الذین امنوا منکم وعملوا الصلحت لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضیٰ لھم ولیبدلنھم من بعد خوفھم آمنا، یعبدوننی لایشرکون بی شیئا. (ماخوذ صدق لکھنو ۱۲ ستمبر ۱۹۴۵ء)

اسلام میں تصوف کا صحیح مقام وموقف

اہم مباحث

مولانا محمد حنیف ندوی کا تعلق اگرچہ اہل حدیث مکتب فکر سے تھا، لیکن وہ فکری، علمی اور عملی طور پر مسلکی وابستگیوں سے بلند تھے۔ ان کی کتابیں اسلامیت کی خدمت کا اعلیٰ شاہکار ہیں۔ قرآن کی تفسیر ''سراج البیان'' ''اساسیات اسلام'' تعلیمات غزالیؒ'' ، افکار غزالیؒ'' ''تعلیمات ابن تیمیہ'' جیسی کتابیں لکھ کر انہوں نے جدید دور میں طبقہ علماء کا نام روشن کیا ہے۔

اگرچہ وہ کسی بزرگ سے باقاعدہ وابستہ نہ تھے، لیکن وہ علمی طور پر تصوف میں غوطہ زنی اور فطرت سلیمہ کی حفاظت کی وجہ سے تصوف فہمی کے اعتبار سے ممتاز مقام پر فائز تھے۔ موجودہ دور میں تصوف کی حمایت میں ان کے لکھے گئے مضامین علمی اعتبار سے اعلیٰ نوعیت کے ہیں، موصوف کا زیر نظر مضمون ''تعلیمات غزالیؒ'' کتاب کے مقدمہ سے لیا گیا ہے۔ (مرتب)

''تصوف کا اطلاق مذہب کی ایسی نوعیت پر ہوتا ہے، جس میں زیادہ زور اس تعلق کے براہ راست شعور پر دیا جاتا ہے، جو اللہ اور اس کے بندے کے درمیان استوار ہے۔''

دوسرے لفظوں میں تصوف کا موضوع اللہ تعالیٰ کا بلا واسطہ عرفان ہے۔

ایک صاحب، اسے اللہ تعالیٰ کی جستجو وطلب سے تعبیر کرتے ہیں۔

ایک صاحب نے ایک قدر اور آگے بڑھایا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ تصوف صرف جستجو اور طلب ہی کا نام نہیں۔ اس میں وہ خاص نظریۂ حیات بھی داخل ہے، جو

جستجو اور طلب کے لیے منزل اور راستے کی تعین کرتا ہے۔

کچھ حضرات تصوف کو فلسفہ کا ردعمل ٹھہراتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جب عقل وخرد کی خنکی سے حرارت عمل پیدا نہیں ہوتی، ایمان میں زندگی اور داعیات حیات نہیں ابھرتے، تو اس کی تلافی کے لیے تصوف میدان میں اترتا ہے۔

اس رجحان کو تیرھویں صدی کے ایک یہودی متصوف ربی۔ برگاس (Ruby BurGas) ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

''فلسفیوں کی نکتہ طرازیاں، جس مقام پر ختم ہوتی ہیں، وہاں سے تصوف کا آغاز ہوتا ہے۔''

بعض کا کہنا ہے کہ تصوف دراصل فلسفہ کا اس درجہ حریف نہیں، جس درجہ روایتی مذہب کا ہے۔ جب اس میں جمود آ جاتا ہے، جب عقائد بے جان ہو جاتے ہیں، جب اخلاقیات میں روح نہیں رہتی اور عبادات وشعائر ٹھس ہو جاتے ہیں۔ تب تصوف ایک مصلح عنصر کی حیثیت میں نمودار ہوتا ہے اور ان سب میں حرکت واہتزاز کی برقی رو دوڑا دیتا ہے۔

یہ ساری باتیں اپنی جگہ صحیح ہیں اور بلاشبہ ان سے تصوف کے سمجھنے میں ایک گونہ مدد بھی ملتی ہے۔ مگر ان میں کوئی تعریف بھی جامع و مانع نہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ اس میں براہ راست تعلق باللہ پر زور دیا جاتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ یہ کوچۂ یار کی جستجو اور طلب سے تعبیر ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ یہ فلسفہ کا رد عمل ہے، بلکہ خود اس کی حیثیت ایک قسم کے فلسفہ کی ہے، جو اپنے آغوش میں فلسفہ کی باریکی اور گہرائی تو رکھتا ہے، مگر اس کی خشکی اور خنکی نہیں۔ اسی طرح اس حقیقت کے مان لینے میں بھی قطعی تامل نہیں ہونا چاہئے کہ اس کا تعلق فکر وعمل کے ایک خاص مرحلہ سے ہے۔ اس کی ضرورت اس وقت محسوس کی جاتی ہے، جب فلسفیانہ موشگافیاں، مدرسانہ بحثیں اور متقین کی ظاہر پرستی، مذہب ایسی جیتی جاگتی شے کو مردہ

اور غیر متحرک ادارہ کی صورت میں بدل دیتی ہیں۔ لیکن اس وضاحت کے باوجود ہمیں کہنے دیجیے، کہ اس سے تصویر کے تمام رخ واضح نہیں ہوپاتے، اور بالخصوص اسلامی تصوف پر تو ان تعریفات سے، قطعی پوری پوری روشنی نہیں پڑتی جو اپنے مزاج اور تاریخ کے اعتبار سے مستقل بالذات شے ہے۔ اس باب میں قصور ارباب فکر دانش یا اہل علم کا نہیں، بلکہ اصلی اشکال یہ ہے کہ تصوف اور اسلامی تصوف کی کوئی قطعی تعریف ہو ہی نہیں سکتی، کیونکہ یہ کسی ایک ہی جچے تلے اور متعین رجحان کا نام نہیں، بلکہ کئی رجحانات کا مجموعہ ہے۔ علاوہ ازیں اس میں مزید الجھن یہ ہے کہ وہ رجحانات بھی ایسے ہیں کہ ان کی دینی وعقلی قدر و قیمت میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ان حالات میں کوئی تعریف بھی ایسی نہیں ہوسکتی، جو ایسی جامع، ایسی قطعی اور ہمہ گیر ہو کہ ان تمام رجحانات صحت کو گھیر لے اور ان میں صحت واستواری کے مدارج کی تشریح وتعین میں بھی مدد دے۔ لہٰذا ہماری رائے میں زیادہ محفوظ اور زیادہ مفید راہ یہ ہے کہ ہم تعریف کے چکر میں پڑنے کے بجائے، تجزیہ سے کام لیں، یعنی ان تمام رجحانات کا الگ الگ جائزہ لیں، جن سے اسلامی تصوف ترتیب پاتا ہے اور ان بنیادوں کی نشان دہی کریں، جن پر تصور کے دلکشا محل کی تعمیر ہوئی ہے، اس سے دو فائدے ہوں گے۔ ایک تو تصوف کی تعیین و وضاحت کا مرحلہ آسانی سے طے ہوجائے گا۔ دوسرے ان رجحانات کے بارے میں ہم یہ معلوم کرسکیں گے، کہ اسلام نے کس حد تک ان کی تائید کی ہے اور کس حد تک ان عناصر کی مخالفت کی ہے۔ نیز یہ کہ ان کی عقلی قدر و قیمت کا عالم کیا ہے۔

یہ عناصر کل چھ ہیں: (۱) انفرادیت (۲) تخصیص (۳) اخلاص (۴) معرفت یا نظریۂ علم (۵) ترجیح آخرت (۶) ترجیح معانی۔ اب ان کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

انفرادیت:- انفرادیت سے ہماری مراد انفراد باللہ یا خلوت ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ راہ رو، راہ معرفت میں، اپنی تمام تر توجہات کو اللہ تعالیٰ پر مرکوز کردے۔ ہر

ہر لمحہ اسی کی یاد اور ذکر میں بسر ہو، ہر ہر فرصت اسی کی محبت وشوق سے معمور ہو اور ذہن وقلب کی تمام تر توانائیاں اسی کو پانے، اسی کو چاہنے اور اسی کی تجلیات گونا گوں سے بہرہ مند ہونے کے لیے وقف کردی جائیں۔ ظاہر ہے کہ اس آرزو کی تکمیل اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک انسان مکروہات دنیا سے، الگ تھلگ رہنے کا فیصلہ نہ کرلے اور ایسا گوشۂ عافیت نہ ڈھونڈلے۔ جہاں رہ کر اپنے کو بالکل یکسو محسوس کرے، جہاں کوئی چیز ذکر وفکر اور مجاہدہ ومراقبہ میں خلل انداز ہونے والی نہ ہو۔ تصوف کا یہ وہ مشترک عنصر ہے، جو تمام متصوفانہ مذاہب میں یکساں اہمیت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ ہندوؤں میں اسی چیز نے تارک الدنیا سادھوؤں کی صورت اختیار کی۔ یہودیوں میں اسی عزلت خواہانہ تصور نے، احبار اور اہل قبالہ کو جنم دیا اور یہی وہ شے تھی، جس نے عیسائی دنیا میں رہبانیت کا روپ دھارا۔ سوال یہ ہے کہ کیا خلوت وانزوا کی یہ ذہنیت اسلامی ہے؟ کیا اس سے اسلام کے تمدنی تقاضوں کو گزند تو نہیں پہنچتا اور سب سے آخر میں، آیا یہ نفسیاتی طور پر ممکن بھی ہے کہ کوئی شخص دنیا کی دلچسپیوں سے علیحدہ رہ کر، صحت مند ذہنی وفکری زندگی گزار بھی سکے۔

آیئے! ہم ان نکات پر علی الترتیب غور کریں۔

اس میں شبہ نہیں کہ اسلام نے رہبانیت کی مذمت کی ہے اور اسے صاف اور کھلے انداز میں بدعت قرار دیا ہے اور اس حقیقت کو مان لینے میں بھی قطعی پس وپیش یا تامل کی گنجائش نہیں ہے، کہ اسلام ہی وہ پہلا اور آخری مذہب ہے، جس نے دنیا کے چیلنج کو جرائت سے قبول کرنے کی دعوت دی ہے۔ یہی نہیں اس کے لئے قوانین، عبادات، فرائض اور حقوق انسان کا ایک نہایت ہی عمدہ اور متوازن نقشہ بھی پیش کیا ہے، جو حد درجہ معقول ہونے کے ساتھ قابل عمل بھی ہے۔ اسلام کی یہی وہ خصوصیت ہے، جو اغیار کی نظروں میں کھٹکتی ہے۔ حتیٰ کہ ایک صاحب نے بزعم خود اسلام کو اسی جرم کی پاداش میں، مذاہب کی صف ہی سے نکال باہر کیا، اس کا مزاج،

اس کی ساخت اور کائنات انسانی کے بارے میں اس کا نقطۂ نظر، ایسی چیزیں ہیں، جو روحانیت سے قطعی میل نہیں کھاتیں۔ ان کے خیال میں اسلام مذہبی شکل وصورت میں غیر دینیت کا حامی ہے۔ ہم انہیں اس سلسلہ میں معذور سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک چونکہ مذہب کو صرف روحانی اقدار پر مبنی ہونا چاہیے تھا اور ظاہر ہے کہ اسلام کی جامعیت ہرگز اس کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔ لہٰذا محض اس بنا پر یہ مجبور ہوئے کہ اس کو مذاہب کی صف سے نکال دیں۔

اسلام کی جامعیت کے معنی یہ نہیں، کہ اس میں دین و دنیا کی کوئی تفریق موجود نہیں، اس میں جسدانی اور روحانی اقدار میں ثنویت تسلیم نہیں کی جاتی اور یہ نہیں مانا جاتا کہ تہذیب وتمدن کے صحت مند تقاضے، اس عالم آب و گل کی رونق اور گہما گہمی، علوم وفنون کا ارتقا یا انسانی عزم وحوصلہ کی بلندیاں روحانیت کے منافی ہیں۔

سوال صرف یہ ہے کہ کاروبار دنیا میں، شرکت کا وہ اعلیٰ ترین طریق کیا ہے، جس سے معاشرہ کو اس کی مضرتوں سے بچایا جاسکے، جس میں رونق اور ہنگامہ ہائے طرب وانبساط تو ہوں، مگر روح مردہ نہ ہونے پائے، جس میں ارتقا و تقدم کے تقاضے تو پائے جائیں، مگر دل زنگ خوردہ نہ ہونے پائے اور قلب وضمیر کی وہ لطافتیں قائم رہیں، جو کسی زندہ تمدن اور پاکیزہ طرز حیات کا سرمایۂ ناز ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اصل اشکال یہ نہیں، کہ دنیا کی نعمتوں سے بہرہ مندی جائز ہے یا نہیں۔ اسے ناپاک اور نجس سمجھ کر چھوڑ دینا چاہیے یا پاکیزہ اور مقصود سمجھ کر حرز جاں بنانا زیادہ انسب ہے۔ اصل اشکال یہ ہے کہ دنیا میں ایک وقت خاص تک، چونکہ بہرحال رہنا ہے اور اس لیے سوچا جائے کہ وہ اسلوب حیات کون ہے، جو زیادہ صحیح اور زیادہ برکتوں کو اپنے آغوش میں لیے ہوئے ہو۔

سوال اس لیے حل طلب ہے کہ اس گلستان حیات میں جہاں پھول ہیں،

وہاں کانٹوں کی بھی کمی نہیں، جہاں اور گہما گہمی ہے، وہاں ویرانی اور ہولناک گڑھے بھی ہیں، جہاں علوم وفنون اور تہذیب وتمدن کی استواریاں ہیں، وہاں بے راہ روی اور انحراف کی مثالیں بھی کم نہیں۔ ان حالات میں بے خطر دنیائے دوں کے سمندر میں، کود پڑنا چاہیے اور بلا محابہ بغیر کسی تربیت اخلاقی اور تحفظ کے، اپنے کو اس گرداب میں پھینک دینا چاہیے یا اس طریق سے انسان دنیائے رنگ وبو کے اس چیلنج کو قبول کرے کہ اس کا دامن طلب صرف پھول ہی چنے، کانٹوں سے نہ الجھے اور برکات ہی سمیٹے، نحوستیں نہیں۔ یعنی اس کا دل و دماغ علوم وفنون سے صرف روشنی ہی حاصل کرے۔ مادیت کی تاریکیوں سے اسے داغ دار نہ کرے۔ اسی طرح اس کے حصہ میں تہذیب وتمدن کی استواریاں ہی آئیں، فسق وفجور کے داعیات سے سیرت وکردار کی سطح کو پست نہ ہونے دے۔

یہ ہے اصل سوال اور اصل اشکال، بلکہ صاف صاف لفظوں میں کہنا چاہیے کہ یہ وہ موڑ ہے، جہاں رہبانیت اور اسلام کی راہیں جدا ہوتی ہیں، کیونکہ رہبانیت کی بنیاد عیسائیت کے اس اذعانی عقیدہ پر ہے، کہ دنیا ناپاک اور نجس ہے اور ہرگز اس لائق نہیں کہ اس کو منہ لگایا جائے، یا اس کے بارے میں ادنیٰ دلچسپی کا اظہار کیا جائے۔ لیکن اسلام کا اس کے برعکس موقف ہے کہ دنیا ناپاک اور نجس نہیں، رہنے کے قابل ہے۔ حصہ لینے اور شرکت کے قابل ہے، بلکہ اس لائق ہے کہ اس کی مسرتوں میں اضافہ کیا جائے۔ اس کے ممکنات کو ترقی دی جائے اور اس کے قافلہ ہائے ارتقا وتقدم کو تیز تر کر دیا جائے۔ تحفظ، احتیاط اور تربیت وہ عناصر ہیں، جنہوں نے مل جل کر، شریعت وقانون یا فقہ اسلامی کی شکل اختیار کی ہے۔

رہبانیت سے اسلام کو جدا کرنے والی دوسری چیز یہ ہے کہ اسلام دنیا اور دنیوی خواہشات میں اصولی فرق قائم کرتا ہے۔ دنیا کا مفہوم اس کے نزدیک یہ کارگاہ حیات ہے اور اس کا کارگاہ حیات کو واسطہ اور ذریعہ کے بجائے نصب العین

قرار دینا اور اس کی ادنیٰ نعمتوں پر زندگی کی اعلیٰ اقدار کو قربان کر دینا، خواہشات دنیا کے مترادف ہے۔ اسلام یا اسلامی تصوف اس کارگاہ حیات سے تو پوری پوری دلچسپی لیتا ہے، مگر اس کو اس درجہ سے بڑھا کر نصب العین کے درجہ تک پہنچا دینے کا حامی نہیں۔

یہ مسئلہ کا ایک رخ ہے۔ دوسرا رخ یہ ہے کہ تمام سامی مذاہب میں بالعموم اور اسلام میں بالخصوص اللہ تعالیٰ کا تصور یہ ہے کہ وہ محبوب ترین ہستی ہے، عزیز ترین نصب العین ہے اور ان تمام تر نزاہتوں کے باوجود اس لائق ہے کہ اس کو ماننے اور اس کے اخلاق سے متجلی ہونے کے لیے، مجاہدہ و ریاضت کی ہر صورت آزمائی جائے۔ جب تک اللہ تعالیٰ کا یہ تصور ہمارے ہاں موجود ہے اور جب تک انسان کی تمدنی جبلت کے پہلو بہ پہلو، انسان کے ضمیر و فطرت میں، اسی اہمیت کا اور اسی قدر توانا و قوی تر یہ وجدان پایا جاتا ہے کہ اس ذات گرامی کے ساتھ، تعلقات عبودیت و محبت استوار کیے جائیں، اس وقت تک خلوت و انزوا کی شرعی و عقلی ضرورت قائم رہے گی اور مجاہدہ و مراقبہ کی وہ تمام شکلیں برقرار رہیں گی، جو اس مقصد کے لیے مفید ہوں۔ اس کو زیادہ وضاحت کے ساتھ سمجھنے کے لیے، اس حقیقت پر غور فرمائیے کہ جب دنیا کا ادنیٰ نصب العین آپ کی تمام تر ذہنی و فکری قوتوں کو گھیر لیتا ہے اور آپ کی توجہات فکری کو، ایک خاص مرکز پر، اس طرح مرکوز کر دیتا ہے کہ باقی دنیا کے جھمیلوں سے، آپ بے نیاز اور غافل ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ کے عشق و محبت کے تقاضے، کیا کچھ وسیع نہیں ہوں گے؟ اور کس درجہ آپ کے قلب و ذہن کی فراغتوں کا احاطہ نہیں کر پائیں گے؟

نصب العین کوئی ہو، بہرحال توجہ و التفات چاہتا ہے، یکسوئی اور فراغت چاہتا ہے، بے غل و غش جدوجہد اور سعی و کوشش چاہتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تڑپ اور جستجو چاہتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ چیزیں، خلوت و یکسوئی کے بغیر حاصل

ہو سکتی ہیں۔ پھر اگر صوفیا انہی تقاضوں سے مجبور ہو کر، خلوت کو پسند کرتے اور اپناتے ہیں تو وہ اس نصب العین اور آرزو کی بلندی کے پیش نظر، ان کو مطعون کیونکر ٹھہرایا جا سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں قرآن و حدیث میں اللہ تعالیٰ کی محبت اور ذکر کے، جو فضائل آئے ہیں، یا آنحضرت کی زندگی میں تعلق باللہ کی جو والہانہ مثالیں پائی جاتی ہیں، ان کو اس بنا پر نظر انداز کرتے ہیں کہ وہ سب معلوم اور مدون و متعین ہیں۔ اس طرح خود اسلامی نظام و عبادات میں خلوت و انزوا کے لطائف کی جو جھلک کبھی روزہ کی شکل میں دکھائی دیتی ہے، کبھی نوافل کی صورت میں جلوہ آرا معلوم ہوتی ہے، کبھی اعتکاف کے رنگ میں پائی جاتی ہے اور کبھی تہجد اور قیام اللیل کے انداز میں نظر آتی ہے، اس کے بارے میں بھی ہم وضاحت غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ اس لیے کہ ہمارا مقصود صرف اصول کی حد تک مسئلہ کی تشریح کرنا ہے۔ تفصیلات سے تعرض ہمارے دائرہ بحث سے خارج ہے۔

دوسری تنقیح یہ تھی کہ کیا خلوت گزینی اور عزلت و علیحدگی، خلق کی صورت اسلام کے تمدنی و تہذیبی تقاضوں کے خلاف تو نہیں۔ اس سوال کا جواب کچھ مشکل نہیں۔ اگر پہلے نکتہ کی وضاحت کے دوران میں، جن افکار کا ہم نے اظہار کیا، وہ مستحضر ہیں اور قلب و ذہن نے پوری طرح اس کی روح کو سمجھ لینے اور پا لینے میں کوتاہی نہیں کی، تو صورت مسئلہ نکھر کر سامنے آ جاتی ہے۔ ہم نے جو کچھ عرض کیا، اس کا خلاصہ دو لفظوں میں یہ ہے کہ اسلام یا تصوف کا اشکال یہ نہیں کہ دنیا اور اس کے ممکنات ارتقا کو قبول کیا جائے یا نہیں، بلکہ اس کے برعکس اس کے سامنے جو حل طلب سوال ہے، وہ یہ ہے کہ دنیا کو اس کی خوبیوں کے ساتھ کیونکر حاصل کیا جا سکتا ہے۔ نیز کس طرح اس کو عقبیٰ و آخرت کی حقیقی زندگی کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

ربنا آتنا فی الدنیا حسنة وفی الاخرة حسنة وقنا عذاب النار.

(البقرہ: ۲۰۱)

"اے پروردگار ہمیں دنیا میں بھی عمدگی سے بہرہ ور کر اور آخرت میں بھی خوبی سے نواز اور دوزخ کی آگ سے محفوظ رکھ۔"

مزید وضاحت کی خاطر مندرجہ ذیل نکات ہمیشہ ملحوظ رہنا چاہیں:

۱۔ اصولاً اگرچہ تصوف کے دروازے سب کے لیے کھلے ہیں، تاہم یہ دعوت تزکیہ اپنے مزاج اور ساخت کے اعتبار سے، سب کے لیے یکساں قابل عمل نہیں، اس کے لیے خاص تعلیم، ذہن اور ظرف چاہیے۔

۲۔ خلوت و عزلت گزینی کا مفہوم محققین کے نزدیک یہ ہے کہ اس میں بُعد مکانی ضروری نہیں، یعنی یہ خلوت ضروری نہیں کہ مکانی ہو، بلکہ دنیا کی ہنگامہ آرائیوں میں شریک و سہیم رہنے کے باوجود بھی خلوت ممکن ہے۔ صحیح ترین پیرایۂ بیان یوں سمجھیے کہ اس سے مقصود ذہن و فکر کے انداز کی تبدیل ہے یا زندگی کے بارے میں ایک خاص نقطۂ نظر کو اپنانا ہے، اور وہ یہ ہے کہ آپ چاہے، کسی کام میں مصروف ہوں اور کام کی کسی نوعیت میں مشغول ہوں، دل میں ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے ذکر اور یاد کی شمع فروزاں رہے اور یہ کوشش رہے کہ ہمیں ہر ہر درجہ و مرتبہ کی برائیوں سے بچنا ہے اور ہر ہر درجہ و مرتبہ کے حسنات کو اختیار کرنا ہے۔ ظاہر ہے، اس غرض کے لیے جنگلوں اور ویرانوں میں رہنے کی ضرورت نہیں، بلکہ دنیا کی انہی مشغولیتوں میں کچھ فرصتیں تلاش کرنے کی حاجت ہے، جن میں ذکر و فکر کے مجاہدات کو جاری رکھا جاسکے۔

اس مفہوم کو عارف قشیری نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

والعزلة فی الحقیقة اعتزال الخصال المذمومة فالتاثیر لتبدیل الصفات لا للتنائی عن الاوطان.

"اصل عزلت خصائل مذمومہ کو ترک کرنا ہے۔ یعنی عزلت بعد مکانی کا نام نہیں، تبدیلی صفات سے تعبیر ہے۔"

ابو علی دقاق کا کہنا ہے:

البس مع الناس مایلبسون وتناول مما یاکلون وانفرد عنهم بالسر.

"لوگ جو پہناوا اختیار کرتے ہیں، وہی تم بھی اختیار کرو۔ کھانے پینے میں بھی امتیاز کی حاجت نہیں۔ امتیاز صرف قلب و اسرار کی تبدیلی ہے۔"

اسی حقیقت کو انہوں نے ایک واقعہ کے ضمن میں بھی بیان فرمایا ہے:

ایک صاحب بہر استفادہ ان کے پاس آئے اور کہنے لگے: حضرت، ایک طویل مسافت طے کرنے کے بعد آپ تک پہنچ پایا ہوں۔

آپ نے کہا:

لیس هذا الحدیث من قطع المسافة ومقاساة الاسفار فارق نفسک بخطوة وقد حصل مقصودک.

بھائی! استفادۂ معرفت، قطع مسافت اور سفر کی مشکلات سے تعلق نہیں رکھتا۔ اس کا تعلق محض قطع نفس سے ہے۔ چنانچہ نفس سے ایک قدم کی دوری اختیار کرو، معرفت آپ سے آپ حاصل ہوجائے گی۔

غرض یہ ہے کہ خلوت کا اعلیٰ مرتبہ بہرحال یہی ہے، کہ انسان 'کائن و بائن' رہے۔ یعنی بیک وقت اپنے گردوپیش پھیلی ہوئی کائنات سے بھی تعلق رکھے اور دل کے لطائف سے بھی بے گانہ نہ ہونے پائے۔

۳۔ وہ لوگ جو اس درجہ عالی صفت نہ ہوں، کہ جلوت میں بھی خلوت آرائی کے لطف سے اپنے کو بہرہ مند رکھیں، ان کے لیے بُعد مکانی کے اختیار کرلینے میں کوئی مضائقہ نہیں، بشرطیکہ ان کی ذہنی سطح اتنی اونچی ہو، کہ دینی علوم و فنون پوری طرح سمجھ سکیں اور عقائد و افکار کے معاملہ میں اس درجہ، پختگی اور استواری حاصل ہو

کہ نفس کی ابلہ فریبیوں کا اچھی طرح جائزہ لے سکیں اور ان سے محترز اور مجتنب رہ سکیں۔ ہمارے نزدیک اس طرح کی خلوت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اصول صحت کا خاص طور پر خیال رکھا جائے۔ یعنی ذکر وفکر یا مجاہدات کو صرف اسی حد تک جاری رکھا جائے جس حد تک کہ ذہن جسم کی شادابیاں اجازت دیں یا جس حد تک کہ عبادت ومجاہدہ قلب وذہن پر بار نہ ہوں۔

۴۔ خصوصیت سے قابل لحاظ بات خلوت کے سلسلہ میں یہ ہے، کہ خلوت گزینی کی یہ صورت بھی عارضی ہونی چاہیے اور اس کی غرض وغایت صرف یہ ہونا چاہیے، کہ سالک اپنے نفس کی خرابیوں کا نہایت یکسوئی اور غیر جانبداری کے ساتھ جائزہ لے سکے اور اپنے آپ کو اس طرح بدل سکے، کہ جس وقت اس خلوت سے نکل کر جلوت میں آئے اور لوگوں سے ملے جلے، تو ان کے لیے اس کا وجود مفید و بابرکت ثابت ہو۔

اس سلسلہ کا آخری سوال یہ تھا کہ آیا یہ ممکن بھی ہے، کہ خلوت گزینی نفسانی تسکین وطمانیت کے اسباب فراہم کرسکے اور سالک کے لیے حقیقی دلجمعی وسکون کی دولت مہیا کرسکے۔ یہ سوال اس درجہ سے ابھرتا ہے کہ بقول ارسطو کے انسان حیوان اجتماعی ہے، جو بہرحال کسی نہ کسی معاشرہ اور ماحول میں پیدا ہوتا ہے، اسی میں جیتا، بڑھتا یا تعلیم وتربیت کی منزلیں طے کرتا ہے، اسی سے اس کی ذہنی وفکری صلاحیتوں میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے، اسی سے یہ اخلاقی معیار اور سانچہ حاصل کرتا ہے اور اسی معاشرہ و ماحول کی بدولت اس کو موقع ملتا ہے، کہ اپنی شخصیت کی بلندیوں اور صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کرسکے اور جس معاشرہ سے اس نے اب تک اتنا کچھ حاصل کیا ہے، اس کو کچھ دے بھی سکے، یعنی اس کی تمدنی وتہذیبی ہمتوں کو موڑ سکے۔ اس کے لیے صحت مند اخلاقی فضا پیدا کرسکے اور اس کو نئے نئے افکار اور تصورات سے مالا مال کرسکے۔

ایسے اشخاص اگر گوشہ ہائے خلوت میں جا بیٹھیں گے، تو ذکر وفکر کی مشغولیتیں کب تک ان کا جی بہلا سکیں گی اور کب تک ان کی بیقرار طبیعت معاشرہ کی ہنگامہ آرائیوں سے الگ تھلگ رہ سکے گی؟ کیا ان کا ذہن اس سے پریشان نہ ہوگا؟ ان کا قلب توحش محسوس نہیں کرے گا اور ان کا بھرپور اور پرخروش انا معاشرہ میں لوٹ آنے کے لیے بے چین نہیں ہوجائے گا۔ اور یہی بے چینی بالآخر ان کے جذبہ خلوت میں مخل نہیں ہوگی۔

بلاشبہ یہ سوال اجتماعیات اور نفسیات کے لیے ٹیڑھا اور پریشان کن ہے۔ لیکن یہ انسانی شخصیت کا ادھورا تجزیہ ہے اور اس کی بنیاد اس غلط مفروضہ پر ہے، کہ نفس کی تگ وتاز، اس کی دلچسپیاں اور ترقی و بالیدگی کا تمام تر انحصار خارجی ماحول پر ہے، حالانکہ یہ صحیح نہیں، نفس کے اندر بجائے خود ایک اقلیم افکار آباد ہے، ایک دنیائے تصورات ہنگامہ آرا ہے، اس کے باطن میں اپنے ہنگامے اور شورشیں ہیں۔ منزلیں ہیں، حسن ہے، دل آویزی اور دلبری کے انداز وتیور ہیں۔ شرط یہ ہے کہ کوئی شخص بیرونی جاذبیتوں سے عنان توجہ کو موڑ کر نفس کے اندر جھانک کر دیکھے۔ غور وتعمق کی خو ڈالے اور اس بحر بیکراں میں ڈوب جانے کی لذت سے آشنا ہو۔ پھر دیکھے کن کن لذات سے دوچار ہونے کا موقعہ ملتا ہے، اور کیا کیا لطائف اور گہرہائے معانی ہاتھ آتے ہیں اور اگر غور وخوض کا مطلب، اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی ہو اور اس محبوب نصب العین کا حصول ہو، جس کے جمال جہاں افروز کی ادنیٰ جھلک کا ظہور یہ گلستان حیات ہے، جس کو آپ خارجی و مادی دنیا سے تعبیر کرتے ہیں، تو اندازہ کیجیے، یہی ذات اپنے عشاق اور دیوانوں کے لیے، دنیائے باطن میں کن کن دلچسپیوں کا سامان مہیا نہیں کرسکتی اور ان کے دل ویران کے لیے آبادی و معموری کا کیا کیا اہتمام نہیں کرسکتی۔

دراصل اس سوال کا تفصیلی جواب کچھ وہی لوگ دے سکتے ہیں، جو اصحاب

حال ہیں اور وہ بھی عمل سے بات چیت اور گفتگو و بحث سے نہیں۔ ہم اہل قال کے لیے اس سے زیادہ کہنے سننے کی گنجائش نہیں کہ نفسیاتی طور سے، اس طرح کی خلوت لذت آفریں ہو سکتی ہے۔ ثبوت میں ان ہزاروں پاکباز اور پاک نہاد انسانوں کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ جنہوں نے برسوں انسانی آبادی سے دور، دنیاوی ہنگاموں سے الگ تھلگ رہ کر، زندگی گزار دی اور کبھی بھی حرف شکوہ و آرزو زبان پر نہیں لائے۔ ظاہر ہے یہ لوگ نہ تو مریضانہ ذہنیت رکھتے تھے۔ نہ اتنے پاگل اور دیوانے تھے کہ دلچسپی نہ ہونے کے باوجود، اس طرز حیات کو سینے سے لگائے رہیں۔

یہی وہ حقیقت ہے، جس کو مالک بن مسعود نے ایک سائل کے جواب میں فرمایا:

سائل نے پوچھا تھا: اما تستوحش وحدک (کیا آپ اس وحدت وخلوت میں احساس وحشت سے دوچار نہیں ہوتے) ان کا جواب یہ تھا: ما کنت ادری ان احداً لیستوحش مع اللہ (میں نہیں سمجھتا، کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی محبت و معیت میں وحشت کیونکر محسوس کر سکتا ہے۔ (یعنی جو آرام جان اور راحت جاں ہے، وہ تو دل کی گہرائیوں میں پوری سج دھج کے ساتھ جلوہ آرا ہے۔ پھر گھبراہٹ اور اضطراب کے کیا معنی؟

ایک آخری کھٹک یہ رہ جاتی ہے کہ اگر خلوت وانزوا کی یہ برکات ہیں، تو صحابہ اس سے کیوں آشنا نہیں تھے اور ان کی زندگی میں کیوں ایسی کیفیات کا پتا نہیں چلتا؟ جواب واضح ہے۔ انجیل کے مثالی پیرایۂ بیان میں یوں سمجھیے۔ جس برات میں دولہا موجود ہو، اس کو مجاہدہ و ریاضت کی کیا ضرورت ہے؟ جب آنحضرت ﷺ کے عمل تزکیہ نے، جلوت ہی میں ان لطائف سے ان کو بہرہ مند کر رکھا تھا، جو انبیاء علیہم السلام کے بعد عموماً خلوت سے حاصل ہوتے ہیں۔ تو ان کو اس تدبیر کی حاجت ہی نہیں تھی، کیونکہ تصوف کا نصب العین، دراصل اسی خلا کو پُر کرنا تو ہے، جو انبیاء

علیہم السلام کے بعد معاشرہ میں پیدا ہو جاتا ہے۔ مذہب کا اصلی اشکال یہ ہے کہ جب تک یہ نفوس قدسیہ زندہ رہتے ہیں، جنہیں ہم انبیاء و رسل کے نام سے تعبیر کرتے ہیں، اس وقت تک یہ اپنے ماننے والوں میں عرفان و عمل کے شمعوں کو فروزاں رکھتے ہیں اور تزکیہ و تربیت سے ان کی سیرت و کردار کو چمکائے رکھتے ہیں۔ لیکن جونہی ان حضرات کا انتقال ہوا اور کچھ عرصہ اس پر گزر گیا، طبائع و قلوب میں تکدر پیدا ہوا اور آخر میں نوبت یہاں تک پہنچی، کہ وہی جاہلیت اولیٰ لوٹ آئی، وہی دنیا کی محبت مال و دولت کا عشق، تکلفات و نفسیات کا چسکہ دلوں پر متولی ہوگیا۔ ایسے لمحوں میں قدرتاً ضرورت محسوس ہوتی ہے، ایسے ارباب ھمم کی علمائے ربانی اور صوفیائے کرام کی، جن کا نصب العین آخرت ہو، اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہو۔ مزید برآں جنہوں نے مجاہدہ و ریاضت سے، اپنے قلوب کو سنوار لیا اور مزکی کرلیا ہو کہ میدان عمل میں اتریں اور اصلاح و تزکیہ کی ذمہ داریوں کو سنبھال لیں۔ اگر تصوف سے اصلاح معاشرہ کا یہ مقصد پورا ہوتا ہے اور صوفیا کے پاک نمونوں سے معاشرہ کے دنیاوی و مادی رجحانات میں خوشگوار اور صحت مند تغیر پیدا ہوتا ہے۔ تب یہ زندہ متحرک اور جاندار تصوف ہے اور ان کے حاملین کو ہم کامیاب صوفیا کہیں گے۔ لیکن اگر اس سے یہ مقصد پورا نہیں ہوتا، تو یہ اور جو کچھ ہو، صحت مند، جاری رہنے والا اور اعلیٰ تصوف بہرحال نہیں ہے۔

بلاشبہ کچھ ایسے حضرات ضرور ہیں، جو خلوت وانزوا کی دلچسپیوں میں، اس درجہ کھو جاتے ہیں کہ ان کے دلوں میں جلوت میں لوٹ آنے اور اصلاح و تزکیہ کے فرائض انجام دینے کے لیے، کوئی طلب یا آرزو ہی باقی نہیں رہتی۔ ان لوگوں کے بارے میں ہماری محتاط رائے یہ ہے کہ یہ ارباب ھمم میں سے نہیں ہیں اور یہ کہ اپنے نفسیاتی حالات کی بنا پر انہیں قطعی معذور سمجھنا چاہیے۔ یہ مانا کہ باطن کی دلچسپیاں اور جاذبیتیں ایسی گہری، ایسی عمیق اور پر منفعت ہیں کہ کوئی شخص بھی ان سے آسانی

کے ساتھ، دست کش ہونا پسند نہیں کرے گا، لیکن مناسب تربیت کے بعد انہیں لطائف جلوت میں بھی رکھا جاسکتا ہے اور یہی تصوف کا نصب العین بھی ہے، اس کے لیے ذہن وقلب کی سلامتی اور ظرف وتحمل کی صلاحیت البتہ درکار ہے۔

تخصیص:- اس سے ہماری مراد صوفیا کی اس امتیازی خصوصیت کی طرف اشارہ کرنا ہے، کہ یوں تو ان کا کردار توازن واعتدال کے ساتھ ان تمام اخلاق و حسنات سے آراستہ ہونا ہے، جن سے بہرہ مند ہونا ایک اچھے فرد اور صالح معاشرہ کے لیے ضروری ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ بعض اقدار اخلاقی یا بعض حسنات ہیں، ان کا پایہ نسبۃً بہت اونچا ہوتا ہے، جس میں مرتبۂ اختصاص حاصل ہوتا ہے۔ اس میں یہ غایات اخلاق کو اس طرح اپنے روز مرہ کے عمل میں سمو لیتے ہیں، کہ جس سے دیکھنے والا خواہ مخواہ متاثر ہوتا ہے۔ اس حقیقت کو علوم وفنون کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ ایک عام ڈاکٹر اور ایک متخصص میں کیا فرق ہے؟ یا ایک عام سائنسدان اور محقق سائنسدان میں کیا حدود و امتیاز ہیں؟ یہی نا کہ ایک ڈاکٹر جسم انسان کے تمام عوارض کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور جانتا ہے۔ لیکن کسی بھی مرض میں اس کا مقام اونچا نہیں اور متخصص وہ ہے، جو تمام امراض کے بارے میں تو بحیثیت مجموعی کچھ نہ کچھ جانتا ہی ہے۔ اس کے علاوہ یہ کسی ایک مرض کا ایسا ماہر ہے کہ اس کے بارے میں اس کی رائے سند کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی طرح ایک عام سائنسدان کے بارے میں تصور یہ ہے، کہ یہ طبیعات کی تمام شاخوں سے تھوڑا بہت واقف ہے، لیکن متخصص وہ ہے، جو اس اجمالی علم کے پہلو بہ پہلو سائنس کی کسی ایک شاخ سے متعلق ماہرانہ اور مجتہدانہ رائے رکھتا ہے۔

بالکل یہی انداز اخلاقیات وحسنات میں صوفیا کا ہے۔ اگرچہ یہ حضرات سخاوت، امانت، رقت، گداز و تاثر، انسانیت، شرافت، حیا وعفات ایسے تمام اور اوصاف سے کسی نہ کسی حد تک بہرہ مند ہوتے ہی ہیں۔ مگر ان کا جذبۂ احسان،

صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتا اور صرف انہی نیکیوں میں محدود ہوکر اور سمٹ کر نہیں رہ جاتا، بلکہ یہ کسی ایک نیکی کو اس طرح درجۂ کمال تک پہنچا دیتے ہیں کہ جس سے ان کی سیرت و کردار میں ایک طرح کا امتیاز سا پیدا ہوجاتا ہے۔ پھر یہی وہ امتیاز و تخصص ہے، جس کی بدولت ان کی شخصیت نسبۃً زیادہ اونچی، زیادہ مؤثر اور زیادہ جاذب بن جاتی ہے۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ صوفیا کا کمال یہ ہے کہ اخلاق وحسنات میں غایات کو اپنی آراستہ و پیراستہ سیرت کا نقش ونگار ٹھراتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سخاوت کی انتہائی حدود کو، شجاعت کی آخری صورت کو، حیا وتعفف اور ایمان ورجا کے کامل ترین تقاضوں کو یہ حضرات اپنانے کی کوشش کرتے ہیں، بالکل اسی طرح، جس طرح ایک طبیب خاص یا ایک ماہر طبیعیات کسی ایک ہی مرض کے علاج، طبعیات کی ایک ہی شاخ کے اپنانے میں، علوم وتجربہ کے انتہائی حدود کو چھونے کی کوشش کرتا ہے اور یہی اس کا حد سے بڑھا ہوا کمال اور خوبی بھی ہے، جو دوسروں سے اس کو ممتاز کرتی ہے اور لوگوں کی توجہات محبت وعقیدت کا مدار ومحور ٹھراتی ہے۔ صوفیا بھی اسی درجۂ کمال کی بدولت معاشرہ کی توجہات کو اپنی طرف منعطف کرنے میں، کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

اخلاقیات کے بارے میں یہ اشکال بہت پرانا ہے کہ انسان کو بعض مخصوص نیکیوں میں درجہ کمال حاصل کرنا چاہیے یا تمام حسنات میں برابر کا شریک وسہیم ہونا چاہیے؟ ارسطو نے توسط واعتدال کے سنہرے اصول کو پیش کیا ہے اور اسلام کا عمومی مطالبہ بھی معاشرہ کے ہر فرد سے یہی ہے کہ توسط واعتدال کے تقاضوں کو ملحوظ رکھیں اور ہر نیکی کو اپنانے اور اپنی سیرت وکردار کا جز بنانے کی کوشش کریں، لیکن اس میں جو دقت ہے، وہ یہ ہے کہ اس طرح غیر معمولی شخصیتیں پیدا نہیں ہوتیں اور اخلاق وحسنات کے اونچے نمونے پیدا نہیں ہو پاتے، جو معاشرہ کو متاثر کرسکیں اور

ان کے غیر اخلاقی رجحانات کو بدل سکیں۔ اسلام نے اس غرض کو پورا کرنے کے لیے عوام سے ہٹ کر اخلاق وحسنات کی کچھ اونچی سطحوں کی نشان دہی بھی کی ہے، جن پر فائز ہونا، صرف خواص کا حصہ ہے۔ کیونکہ توسط واعتدال کی روش سے جو اخلاقی نمونے پیدا ہوں گے، وہ لامحالہ متوسط درجہ ہی کے ہوسکتے ہیں، اعلیٰ اور اونچے درجے کے نہیں۔

اس سلسلہ میں قابل لحاظ نکتہ یہ ہے کہ علوم وفنون میں، کھیل کود میں آخر ناموری کن لوگوں نے حاصل کی اور کن لوگوں نے اختراع وایجاد یا ہمت وعزم کے علم گاڑے، کن لوگوں کی مساعی سے سائنس کے عجیب و غریب معجزات اور خوارق ظہور پذیر ہوئے اور کن کن لوگوں کی توجہات اور کوششوں سے علوم و معارف کے قافلے آگے بڑھے۔ ظاہر ہے، ان سب کمالات کا سہرا ان لوگوں کے سر ہے، جنہوں نے علم وفن اور عمل وسعی کے عالم اور متوازن حدود سے آگے بڑھ کر، کمال و نبوغ کے دروازوں پر دستک دینے کی کوشش کی اور توازن واعتدال کی سطحوں سے کچھ اونچا اٹھنا چاہا۔ ان کا ذکر ان لوگوں کی فہرست میں ہرگز نہیں آسکتا، جنہوں نے معمول کے مطابق اور توازن کے سانچوں میں ڈھلی ہوئی زندگی بسر کی۔

علوم وفنون کی معرکہ آرائیاں ہوں یا اخلاق وحسنات کے، سیرت وکمال کو چمکانے کا سوال، کھیل کود کے میدان ہوں یا زندگی کی الجھنیں۔ ان میں جو لوگ دوسروں کو متاثر کرسکتے ہیں یا ذہنوں اور دلوں پر پوری طرح چھا سکتے ہیں اور دوسروں کے لیے مثال اور نمونہ ثابت ہوسکتے ہیں۔ وہ وہی ہیں، جنہوں نے اپنی صلاحیتوں کو غیر معمولی طور پر برت کر دکھایا اور سعی فکر کے عام اور جانے بوجھے میدانوں سے آگے گزر کر، جھنڈے نصب کیے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے، یہاں صرف پہاڑوں کی سیر کافی نہیں، ہمالیہ کی سب سے اونچی چوٹی کو سر کرنے کی ضرورت ہے۔ چاند کے حسن و جمال اور روشنی سے دیدہ و دل کو مستنیر اور محظوظ

کر لینے سے کام نہیں چلتا، اس پر کمندیں پھینکنا ہوں گی اور اس کو مسخر کرنا ہوگا، تب جا کر کہیں ناموری حاصل ہوگی۔

غرض یہ ہے کہ ارسطو کے سنہرے اصول اخلاق، ایک متوازن اور اوسطہ درجہ کے معاشرہ کو بلاشبہ پیدا کرسکتے ہیں، مگر غیر معمولی کردار وسیرت کے نمونے اس سے ابھرنا مشکل ہیں۔ اسلام نے اس مشکل کو ملحوظ رکھا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس نے جہاں تعلیمات میں عوام کے لیے اخلاق وحسنات کی حدیں مقرر کی ہیں، وہاں ارباب ہمم کے لیے بھی کچھ منزلوں کی تعیین میں کوتاہی نہیں کی اور انہی منزلوں کی طرف بڑھنا تخصیص یا اختصاص ہے، جو صوفیا کا طرۂ امتیاز ہے۔

کیا توازن واعتدال کے ساتھ غایات اخلاق، یعنی درجات کمال کو حاصل نہیں کیا جاسکتا؟ یہ اس سلسلہ کی آخری کڑی اور اہم سوال ہے۔ جواب یہ ہے کہ کیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ صرف انبیاء کا حصہ ہے، عام انسانوں کا نہیں۔ ان کے لیے دو ہی راہیں کھلی ہیں یا تو یہ جامعیت و توازن لیے ہوئے، ہر ہر نیکی سے بقدر استطاعت بہرہ ور ہونے کی کوشش کریں اور یا پھر انہی کے بعض غایات وکمالات کی طرف قدم فرسا ہوں۔ تیسری کوئی صورت نہیں۔

اخلاص

اعمال وحسنات میں یہ خوبی تصوف کی جان ہے۔ صوفیا اس کا اطلاق کن کن لطیف معانی پر کرتے ہیں۔ اس کی تفصیل انہی کے اقوال کی روشنی میں دیکھیے۔ ابو علی دقاق کا قول ہے: الاخلاص التوقی عن ملاحظة الخلق. (اخلاص کے معنی یہ ہیں کہ اعمال میں عارف مخلوق کی رائے سے بے نیاز ہوجائے)۔ یعنی اللہ کی رضا اور خوشنودی مدنظر ہو۔ یہی نہیں، اخلاص کی اعلیٰ ترین سطح یہ ہے کہ اعمال اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر، اس طرح آپ سے آپ صادر ہونے لگیں کہ خود جذبۂ اخلاص پر غور وخوض کرنے کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔ ابو یعقوب السوسی کا کہنا ہے:

متی شھد وا فی اخلاصھم الاخلاص احتاج اخلاصھم الی اخلاص.

"جب لوگوں کو اپنے اخلاص میں اخلاص کا احساس ہونے لگے، تو انہیں تجدید اخلاص کرنا چاہیے۔"

اخلاص کی علامات کیا ہیں؟ ذی النون مصری فرماتے ہیں:

ثلاث من علامات الاخلاص استواء المدح والذم من العامة ونسیان رویة الاعمال ونسیان اقتضاء الثواب فی الاخرة.

"اخلاص کی تین نشانیاں ہیں، عوام کی مدح و قدح سے بے پروا ہو جانا، اس حقیقت کو بھلا دینا کہ ہم نے کچھ اعمال اخلاص کی بنا پر کیے ہیں اور ثواب و آخرت کے جذبہ کو فراموش کر دینا۔"

کیا عوام و خواص کے درجۂ اخلاص میں فرق ہے؟ ابو عثمان مغربی کا کہنا ہے:

الاخلاص مالا یکون للنفس فیه حظ بحال وھذا الاخلاص العوام.

"عوام کا اخلاص یہ ہے کہ ان کے محرکات اعمال میں نفس کو کوئی حصہ نہ ہو۔"

واما اخلاص الخواص فھو یجری علیھم لابھم فتبدوا منھم الطاعات وھم عنه بمعزل ولا یقع علیھم رویت ولا بھا اعتذار.

"اور خاص الخاص حضرات کا تقاضائے اخلاص یہ ہے کہ ان کے اعمال کا سرچشمہ اور محرک خود ذات باری ہو۔ بندگی واطاعت کا، ان سے اس طرح آپ سے صدور ہو کہ گویا انہیں اس سے کچھ غرض نہیں۔ نہ یہ اپنے اعمال میں اخلاص کو دیکھیں اور ٹٹولیں اور نہ اس کے لیے انہیں کوئی تیاری ہی کرنا پڑے۔"

دیکھا آپ نے نقطۂ نظر کی بلندی اور پاکیزگی! فقہا تو نیکی کا صرف اوپری تصور ہی رکھتے ہیں، یعنی یہ کہ کسی نیکی کو کیونکر انجام دینا چاہیے اور اس سے زیادہ کے فن کے اعتبار سے وہ مکلف بھی نہیں۔ متکلمین نیکی کی تعیین میں کھو گئے۔ اشاعرہ نے کہا، نیکی معقول المعنی نہیں اور شریعت کے تابع ہے۔ معتزلہ نے ایک قدم بڑھ کر

تصریح کی کہ نیکی کو باور کرنے کے لیے عقلی وجود نہیں۔ حکما کا یہی مذہب ہے اور اس میں ان کی پرواز اس سے آگے نہیں بڑھتی کہ نیکی کو نفس نیکی سمجھ کر، اختیار کیا جائے۔ کانٹ نے اخلاقیات کا یہی اونچا معیار پیش کیا اور کہا کہ نیکی بجائے خود نیکی ہے اور انسانی عقل اس پر شاہد ہے۔ لہٰذا قطعی اس لائق ہے کہ اسے سیرت و کردار کا جز بنایا جائے۔

صوفیا نے ان دونوں سے الگ ایک راہ اختیار کی۔ انہوں نے کہا یہ دونوں نقطہ ہائے نظر اعمال میں وزن پیدا کرنے والے نہیں۔ اصل شے جس سے نیکیوں میں وزن ابھرتا اور روح پیدا ہوتی ہے، اخلاص ہے۔ اعمال میں دیکھنے کی چیز یہ نہیں کہ ان کے اچھا یا برا ہونے میں عقل کو دخل ہے یا شرع کو۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ ان کا محرک کون ہے۔ کیا اعمال حسنہ اور عبادات میں شہرت، ریا اور جلب منفعت مقصود ہے یا اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا؟ پھر اس اخلاص کے بارے میں بھی ان کا زاویۂ نظر یہ ہے کہ اعمال حسنہ کو اس طرح اس سانچے میں ڈھل جانا چاہیے کہ آپ سے آپ بغیر کسی قصد و تعمد کے صادر ہونے لگیں۔ کیونکہ قصد و تعمد کا مطلب یہ ہے کہ ہنوز، نیکیاں قلب وضمیر میں رچی نہیں اور نفس کی اصلاح اس درجے کی نہیں ہو پائی کہ اس سے صرف حسن و خوبی ہی کی توقع کی جائے۔

اس سلسلے میں باوجود انتہائی عقیدت کے، جو ہمیں اس پاک نہاد گروہ سے ہے، ایک اہم شبہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا اخلاص کے اس مرتبہ بلند پر فائز ہونا، نفسیاتی اور عملی طور پر ممکن بھی ہے؟ کیا نیکیوں سے شعور و ادراک کو ہم کسی موڑ پر بھی الگ کر سکتے ہیں اور ہم پر ایسی کیفیت فی الواقع طاری ہو سکتی ہیں اور نفس و روح، اصلاح و تزکیہ کی ایسی منزلیں طے کر سکتی ہے کہ جہاں قصد و تعمد کے شوائب اور تقاضے کلیتہً مفقود ہو جائیں؟

اور اگر یہ ممکن ہے تو دوسرا شبہ یہ ابھرتا ہے، جو اس شبہ سے زیادہ خطرناک

ہے کہ پھر ان اعمال کو ہم نیکیاں کہہ بھی سکتے ہیں؟ یا دوسرے لفظوں میں اگر اخلاص کا اعلیٰ ترین مفہوم یہی ہے کہ اس کو بھی نظر انداز کر دیا جائے تو کیا ارادہ و تعمد کی اس نفی کے بعد، خود اس جذبہ کی کوئی مقدار قلب و ذہن کے کسی گوشے میں بھی باقی رہ جاتی ہے، جسے ہم اخلاص سے تعبیر کرتے ہیں؟ اس تضاد سے نکلنے کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ممکن ہے کوئی صاحب حال اور صاحب علم بزرگ اس پر روشنی ڈال سکیں۔ ہم بہرحال اپنے عجز کا اعتراف کرتے ہیں۔ تطبیق کی ایک صورت یہ البتہ ہوسکتی ہے، کہ صوفیا کے ان اقوال کو جن میں اس مرتبہ بلند کی نشان دہی کی گئی ہے، محض پیرائیہ بیان قرار دیا جائے اور ان سے مقصود یہ سمجھا جائے کہ اصحاب تصوف تا بہ حد امکان اخلاص کی اعلیٰ سے اعلیٰ منزلوں تک پہنچنے کی جدوجہد جاری رکھیں اور ریا و سمعہ کے تقاضوں کو اس طرح چھانٹتے چلے جائیں کہ آخر آخر میں وہ ختم ہوجائیں اور ایسے نقطہ پر پہنچ جائیں کہ جہاں ان کا کوئی تعلق قصد و ارادہ کی پاکیزگی کو بگاڑ نہ سکے۔

معرفت یا نظریۂ علم:۔علم و معرفت کی عموماً تین سطحیں پائی جاتی ہیں:

(۱) اپنے گرد و پیش کی جزئیات کا علم۔ اس کا تعلق سطح حیوانی ہے۔

(۲) منطقی قضایا کو ترتیب دینا اور جزئیات سے بطور استقرا کے نتائج مستنبط کرنا۔ یہ انسانی وصف ہے، جس میں تمام انسان شریک ہیں۔ اس کو پیش نظر رکھ کر انسان کو حیوان ناطق کہا جاتا ہے، جس کے معنی کلیات کے ادراک و فہم رکھنے والے حیوان کے ہیں۔

(۳) بغیر ترتیب قضایا کے، ذہن انسانی پر بعض حقائق کا دفعۃً انکشاف۔ اس سے با اختلاف مراتب وہ تمام حضرات بہرہ مند ہیں، جن کا تعلق کسی نہ کسی طرح فکر و تعمق کی گہرائیوں سے ہے اور علم کی یہی صورت اس وقت زیر بحث ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ علم صرف منطقی استدلال کی تنگنائے ہی میں محصور نہیں ہے، بلکہ اس

کا تعلق ایک اور بحر بیکراں سے بھی ہے، جس کی موجیں کبھی کبھی ساحل ذہن سے ٹکراتی رہتی ہیں اور علوم و معارف کے ایسے انمول موتی بکھیرتی رہتی ہیں کہ جس پر منطقی عقل و خرد حیران و ششدر رہ جاتی ہے۔ طفرہ جس کو اول اول نظام نے پیش کیا اور اب حیاتیات کا مسلمہ اصول ہے، صرف مادی ارتقا کے سلسلہ ہی میں کام آنے والا نہیں ہے، بلکہ اس کی کارفرمائیوں کے حدود ذہن و فکر اور تصورات و کشوف کی وسعتوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ چنانچہ جہاں حیاتیات میں اس کے معنی یہ ہیں کہ ارتقا کی تمام کڑیاں ضروری نہیں کہ باہم پیوستہ اور معلوم ہوں، وہاں اس طرح خیالات و افکار کے لیے بھی منطق واستدلال کی کڑیوں کا باہم مربوط و مسلسل ہونا ضروری نہیں، بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم اشہب فکر کو ایک خاص میدان میں دوڑا رہے ہیں اور وہ اس کو چھوڑ کر، یکایک بغیر کسی سبب کے جست لگا کر ایک دوسرے میدان میں پہنچ گیا، جس کے عجائب و خوارق ایسے اچھوتے، ایسے نادر ہیں اور افق ذہن کو ایسی وسعتیں عطا کرنے والے ہیں کہ جو باقاعدہ سوچ بچار سے حاصل ہونے والے نہیں۔ چنانچہ بلند پایہ شعرا کے جتنے شہ پارے ہیں، اونچے مفکرین کے جس درجہ تخلیقی کارنامے ہیں اور علوم و فنون میں جتنے اہم موڑ ہیں، یہ سب اسی جست فکر کا کرشمہ ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ اس مقام تک پہنچنے کے لیے غور و فکر، ذہنی صلاحیتیں اور کد و کاوش ضروری ہے، بلکہ بمنزلہ اولین شرط کے ہے، لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ صرف غور و فکر ہی سے علم و معرفت کی گرہیں کھلتی ہیں، بلکہ حقائق اشیا کا کھوج لگانے کے سلسلہ میں کچھ موڑ ایسے بھی آتے ہیں جہاں شعور و ادراک بے بس ہو جاتا ہے اور ان کے بجائے کوئی دوسری قوت، دوسری ہی قسم کی صلاحیتیں آگے بڑھ کر ہاتھ پکڑتی ہیں اور ایسی منزلوں تک پہنچا دیتی ہیں، جن کا پہلے سے کوئی ادراک نہیں ہوتا۔ وہ یہ منزلیں ہیں، جہاں پہنچ کر ایک شاعر، ایک مفکر اور غور و تعمق میں ڈوب

جانے والا شخص ایسا محسوس کرتا ہے کہ گویا اشیا کی اوپری سطح سے گزر کر، خود اشیا کے باطن اور روح میں محو سیر ہے، حقائق اشیا میں گھوم پھر رہا ہے اور تجرد و محویت کے لیے ایسے عالم میں پہنچ گیا ہے، جہاں کی ہر شے روشناس اور محرم راز معلوم ہوتی ہے۔

انگریزی کے ایک صوفی مذاق شاعر [illegible] نے، اپنے بعض اشعار میں کچھ اسی قسم کے احساسات کی نشان دہی کی ہے اور غور و تعمق کے کچھ ایسے ہی اطوار کا تذکرہ کیا ہے، جہاں جسمانی ذہن کی سرحدیں ختم ہوجاتی ہیں اور روحانی ذہن کے دریچے پوری پوری تابانی کے ساتھ کھل جاتے ہیں۔

ان کے ان بے مثال اشعار کا مفہوم قریب قریب یہ ہے:

"خیالات و احساسات کا یہ وہ مقدس اور بابرکت موڑ ہے، جہاں پہنچ کر جسمانی نفس کا سانس رک جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خون کی روانی بھی رک گئی ہے۔ بلکہ ہمارا جسم اگرچہ سوگیا ہے، تاہم باطن و روح کی بیداریاں برابر اپنی طرف متوجہ کر رہی ہیں۔ اس وقت ہم کائنات پر باطنی آنکھ کی روشنی میں نظر ڈالتے ہیں، جو اشیا میں غضب کا تناسب وہم آہنگی تلاش کرنے میں کوتاہی نہیں کرتی اور جو ہر شے میں ایک طرح کے طرب و انبساط کو جاری و ساری دیکھتی ہے۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ براہ راست حقائق اشیا میں مصروف خرام ہیں اور ان کی زندگی کی تہوں میں تیر رہے ہیں۔"

غور وفکر کے اس موڑ کو ہم حدس سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس سے آگے ایک اور درجہ ماورائے حدس کا ہے، جس کا تعلق ولایت و نبوت کے معارف و حقائق سے ہے۔ صوفیا نے اپنی اسی حقیقت کی طرف مختلف اصطلاحوں میں اشارہ کیا ہے۔ یعنی: کبھی لوائح، لوامع اور خواطر کا پیرایہ بیان اختیار کیا ہے اور کبھی مشاہدہ کے نام سے پکارا ہے۔ جب اس میں قطعیت کے عناصر ابھر آتے ہیں تو مرتبۂ علم کو عین

الیقین کے وصف سے متصف کیا جاتا ہے۔

اس میں اور حدس میں ایک اصولی فرق یہ ہے کہ حدس تو آخر میں بہرحال ذہن وفکر ہی کا کرشمہ ہے، لیکن علم کی یہ نوعیت جس کا تعلق معارف نبوت و ولایت سے ہے، اس میں آغاز دوسری طرف ہوتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ بعض حقائق کو ان لوگوں کے دلوں پر منکشف کر دیتا ہے۔

والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا. (العنکبوت: ۶۹)

"اور جن لوگوں نے ہمارے لیے کوشش کی، ہم ان کی ضرور رہنمائی کریں گے اور اپنے راستے دکھائیں گے۔"

اس مرتبۂ علم پر جس کا اس آیت میں ذکر ہے۔ اولیاء صوفیا فائز ہوتے ہیں۔ نبوت اس سے جداگانہ مرتبہ کی متقاضی ہے۔ اس کے معارف براہِ راست وحی الٰہی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

فاوحیٰ الیٰ عبدہ ما اوحیٰ. (النجم - ۱۰)

"پھر خدا نے اپنے بندے کی طرف جو وحی بھیجی سو بھیجی۔"

واتل ما اوحی الیک من کتاب ربک. (الکھف: ۲۷)

"اور وہ کتاب پڑھ کر سناؤ، جو تمہارے پروردگار نے بذریعہ وحی تمہاری طرف بھیجی۔"

وحی ولایت اور وحی نبوت میں فرق نوعیت کا ہے یا کمیت کا۔ اس سلسلہ کی یہ اہم بحث ہے اور اس پر اختصار ہی سے سہی، اظہار خیال بہرحال ضروری ہے۔ موجودہ طبیعیاتی انکشافات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ نوعیت وکمیت کا اختلاف محض اصطلاحی ہے۔ اگر آپ پانی کو کھولاتے چلے جائیں تو گرمی اور کھولاؤ آخر آخر میں ایک ایسے فیصلہ کن نقطۂ حرارت تک پہنچ جائے گا، جہاں پانی کی یکسر قلب ماہیت ہوجاتی ہے اور وہ پانی پانی نہیں رہتا، بلکہ بھاپ بن کر ایک زبردست قوت میں بدل

جاتا ہے اور بھاری بھرکم مشینوں کو چلانے لگتا ہے، اسی طرح حیاتیات کے میدان میں آئیے۔ ایک انڈے کو مناسب ماحول میں مناسب حرارت پہنچائیے۔ کچھ عرصہ کے بعد، یہی بے جان انڈا چٹخے گا اور اس میں جیتے جاگتے بچے نکل آئیں گے، جو انڈے کے مزاج اور نوعیت سے قطعی مختلف ہوں گے، یہی حال ارتقا کی دوسری صورتوں کا ہے اور یہی وہ حقیقت ہے، جس کو قرآن نے جنین کے متعلق ارتقائی منزلوں کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: وانشاناہ خلقا آخر۔ کہ یہ قطرۂ آب ایک حقیر جرثومہ ہے۔ علقہ و مضغہ کی منزلیں طے کر کے، یکایک زندگی کے ایک ایسے طور میں داخل ہو جاتا ہے، جہاں عقل وخرد کے امتیازات ابھرنا شروع ہو جاتے ہیں۔

غرض یہ کہ جب مقدار اور نوعیت مناسب ماحول اور شرائط کے [illegible]، نوعیت میں اکثر و بیشتر بدل جاتی ہے تو ان دونوں میں حقیقی اور بنیادی فرق [illegible] مدارج اور مراتب کا فرق ٹھرا۔

علم نبوت و ولایت میں بھی فرق اسی انداز کا ہے، یعنی نبی، ولی سے بمراحل اونچا اور بہ مدارج بلند ہوتا ہے۔ حالانکہ دونوں میں جو علم کا انداز ہے، وہ چنداں مختلف نہیں، کیونکہ دونوں استدلالی و منطقی علم کے بجائے الہام سے استفادہ کرتے ہیں۔

اس مرحلہ پر، اس نکتہ کو ذہن میں ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ کمیت کا یہ فرق بسا اوقات اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ اس پر بعض دوسرے پہلوؤں کے لحاظ سے نوعی فرق کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ولی ہزار مجاہدہ و مراقبہ کر لے، جب بھی نبی یا رسول ہرگز نہیں ہوسکتا، بہرحال دونوں میں فرق درجہ و مرتبہ کا رہے گا۔

وہ دوسرے پہلو کیا ہیں، جو نبی و ولی کے علوم و معارف میں خط امتیاز کھینچتے ہیں؟

وہ یہ ہیں:

(۱) نبی کا علم سراسر معروضی ہوتا ہے اور ولی علم میں موضوعیت کی آمیزش سے پاک نہیں ہوتا۔

(۲) ولایت اکتساب سے تعلق رکھتی ہے اور نبوت فیضان ربوبیت سے۔

(۳) نبی تبلیغ حقائق پر مامور ہوتا ہے، لیکن ولی مامور نہیں ہوتا۔

(۴) نبی کا علم بجائے خود سند ہوتا ہے اور ولی کے معارف خارجی کسوٹیوں کے محتاج۔

(۵) ولی اپنی روحانی پرواز اور سیر باطن میں اگر مقامات نبوت کے بالمقابل آتا بھی ہے تو ان مقامات پر نہ فائز ہی ہوتا ہے اور نہ ٹھرتا ہی ہے، بلکہ تیزی سے گزر جاتا ہے، بخلاف نبی کے کہ وہ ان مقامات کی محرمانہ سیر بھی کرتا ہے، ان میں سے گزرتا بھی ہے اور ٹھرتا یا استقرار بھی حاصل کرتا ہے۔

(۶) دونوں کے پیرایۂ بیان میں بھی فرق ہے۔ جہاں انبیاء کے اسلوب تبلیغ میں وضاحت اور تعیین ہوتی ہے، وہاں صوفیا حقائق کے بیان کرنے میں اکثر رمز و اشارے سے کام لیتے ہیں۔

اس پوری بحث کا حاصل یہ ہے کہ علوم و معارف کا ایک سرچشمہ ایسا بھی ہے، جو انسانی قلب و ذہن کی گہرائیوں میں پایا جاتا ہے اور عقل واستدلال کے حدود کے ماورا اور وحی نبوت سے [illegible] علوم و معارف کے کچھ سوتے جاری ہیں، جن سے کہ ضمیر و وجدان کی تسکین ہوتی ہے۔

غزالی نے اس کی ضرورت پر [illegible] حکیمانہ دلیل پیش کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ علوم نبوت کی اگر براہ راست تصدیق [illegible] اور ایک ولی اور اللہ کا بندہ، اگر حقائق نبوت کو اپنی چشم باطن سے نہیں دیکھ سکتا، تو پھر ان حقائق کو قطعی الثبوت کیونکر کہیں گے؟ آپ جواب میں کہہ سکتے ہیں کہ پیغمبر کی صداقت خود اس کا پیغام ہے، اس کی دعوت کی منطقی استواریاں ہیں اور زندگی کا وہ نقشہ ہے، جسے آزمایا اور برتا

جاسکتا ہے۔ لیکن غزالی کی تسکین اس سے نہیں ہو پاتی۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ساری باتیں زیادہ سے زیادہ اغلبیت بخش سکتی ہیں، لیکن ان سے وہ عین الیقین قطعی حاصل نہیں ہو پاتا، جو حقیقت نبوت کو نکھار کر نظر و بصر کے سامنے لے آئے۔ اس مقصد کی تکمیل بہرحال بلا واسطہ تجربہ ہی سے ممکن ہے۔ ایسے تجربہ سے جو شک و ریب اور ظن وتخمین کے پردوں کو چاک کر کے، شاید حقیقت کو اپنے سامنے جلوہ گر پائے۔

ولایت کس حد تک معروضی علوم کا حامل ہوتی ہے اور کس حد تک اس میں موضوعیت کی کارفرمائیوں کا دخل ہے؟ یہ سوال بھی متوجہ والتفات نہیں چاہتا۔ مگر اس پر ہم چونکہ اپنی کتاب "افکار غزالی" میں کھل کر بحث کر چکے ہیں، اس لیے یہاں اس کا اعادہ غیر ضروری ہوگا۔ غیر ضروری بھی اور شاید غیر دلچسپ بھی۔ لہٰذا قارئین کرام بحث کے اس پہلو کو وہیں دیکھ لیں۔

ترجیح آخرت:- اسلام کا موقف دنیا کے مقابلہ میں کیا ہے؟ ہم اس کی تفصیل انفرادیت کے تحت بیان کر چکے ہیں اور تخصیص کے ضمن میں اس حقیقت کی بھی وضاحت کر چکے ہیں کہ صوفیہ کا پاک نہاد گروہ وہ گروہ ہے، جو اسلام کی عمومی اور متوازن دعوت کو ملحوظ و مرعی رکھنے کے ساتھ ساتھ اقدار روحانی واخلاقی کو خصوصیت سے زیادہ اہمیت دیتا ہے، بلکہ انہی اعلیٰ اقدار کے لیے جیتا اور مرتا بھی ہے۔ ترجیح آخرت کا مسئلہ اسی وضاحت وتفصیل کا ایک پہلو ہے۔ اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ یہ حضرات آخرت کو اس درجہ اہم ضروری اور حقیقی سمجھتے ہیں اور اس کے ہموم و افکار میں، اس درجہ مستغرق اور مشغول رہتے ہیں کہ دنیا کی جھوٹی اور عارضی رعنائیوں کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی ان کو فرصت ہی نہیں ملتی۔ ان کا برتاؤ اس عالم رنگ و بو کے ساتھ، ایک ایسے شخص کا سا ہوتا ہے، جو اس مرحلۂ عیش کو محض عبوری سمجھتا ہے اور اس سے اسی قدر دلچسپی رکھتا ہے، جس درجہ عارضی اور عبوری شے سے رکھنا ضروری ہے، جسے اس کو پھاند کر آگے بڑھنا ہے اور اسے جاوداں اور سدا بہار گلستان

جمال میں داخل ہونا ہے، جس کی جاذبیتیں اس سے کہیں بڑھ کر ہیں، جس کا حسن اور نکھار دائمی اور ابدی ہے۔ جہاں قرب یار کی مسرتیں ہیں اور اتصال حبیب کی بشارتیں ہیں۔ لیکن کیا اس کا مطلب یہ سمجھا جائے کہ اسلام عیسائیت کی طرح اس دنیا کو محقر اور قطعی ناقابل اعتنا سمجھتا ہے اور اس کی ترقیات کا ساتھ دینا نہیں چاہتا۔ تصوف کے اس رجحان کا یہ مطلب ہرگز نہیں۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، اس باب میں اصل شے یہ نہیں کہ آپ دنیا کی ترقیات کا ساتھ دیتے ہیں یا نہیں۔ یہ سوال بھی اصل اور بنیادی نہیں کہ آپ کے دامن میں کس درجہ دنیا سمٹی ہوئی ہے، آپ، کیا پہنتے ہیں، کیا کھاتے ہیں اور کس درجۂ معیشت کو اختیار کیے ہوئے ہیں۔ یہ تمام سوالات زیر بحث نہیں۔ تصوف، انسان میں تین طرح کی اصولی تبدیلیاں چاہتا ہے۔

(۱) یہ کہ اس دنیا کو بہرحال عارضی سمجھا جائے اور نظر و التفات کے گوشے، زیادہ تر عقبیٰ و آخرت کے مہمات پر مرکوز رہیں، جس کے یہ معنی ہیں کہ زندگی وعیش کا جتنا بھی اطمینان آپ کو یہاں حاصل ہے، اس کے بارے میں ہمیشہ یاد رکھیے کہ یہ عقبیٰ و آخرت کے مقابلہ میں بہرحال کم ہے اور ادنیٰ درجہ کا ہے۔

(۲) اس طرز فکر کا منطقی نتیجہ یہ نکلے گا اور نکلنا چاہیے کہ دنیا کے ساز و سامان کے ساتھ اگرچہ وہ بہت زیادہ اور ڈھیر سارا ہو، تعلق خاطر کی وہ نوعیت نہ رہے، جو ایک دنیا پرست کا طرۂ امتیاز ہے۔

وہ بلا محابا بنگلہ اور کوٹھی میں رہے، کار میں بیٹھے اور ہوائی جہاز میں اڑے، لیکن اس کے دل پر ان چیزوں کا اثر نہ ہو، یعنی ان چیزوں سے اس کی روحانیت متاثر نہ ہو، اس کی انسانیت پست نہ ہو اور اس کی کیفیت کچھ اس طرح کی ہو کہ اگر یہ چیزیں میسر ہیں، تب بھی خوش ہے اور یہ چیزیں چھین لی گئی ہیں، تب بھی خوش ہے، بلکہ زیادہ خوش ہے کہ ذمہ داریوں کا بار گراں ہلکا ہوا۔

(۳) آخری چیز جو تصوف چاہتا ہے، وہ یہ ہے کہ دنیا اور اس کے پورے ٹھاٹھ کو اس طرح اللہ کی خوشنودی کے لیے کام میں لایا جائے، کہ اس میں حظ نفس کو کوئی دخل نہ ہو۔ غزالی رحہ نے اس سلسلہ میں ایک دلچسپ قصہ بیان کیا ہے، جس سے اس نقطہ کی اچھی طرح وضاحت ہوجاتی ہے۔ ایک عارف نے صوفیہ کے ایک گروہ کو کھانے پر بلایا اور دعوت کے لیے جس کمرے کو منتخب کیا، اس کو تا بحد مبالغہ سجایا، حتیٰ کہ اس میں سینکڑوں شمعیں روشن کیں۔ صوفیہ کا یہ گروہ حسب وعدہ ان کے مکان پر پہنچا اور جونہی کمرے میں داخل ہوا، ان کی آنکھیں روشنی اور نور کے ان فواروں سے خیرہ ہوگئیں۔ اس سے ان کو سخت حیرت ہوئی کہ جس شخص کے عرفان و زہد کے اتنے چرچے تھے۔ یہ تو دنیادار نکلا۔ میزبان نے اٹھ کر ان کی غلط فہمی کو دور کیا کہ اعزاز وتکریم کے ان تکلفات کا تعلق تمہارے جذبۂ خشیت و خوف سے ہے، تقویٰ و زہد سے ہے، جس کا یہ مطلب ہے کہ یہ اعزاز فقر و پاکبازی کا اعزاز ہے، اشخاص و افراد کا نہیں اور پھر فرمایا کہ تم میں سے ہر شخص کو اجازت ہے کہ وہ اٹھے اور جس شمع کو دیکھے کہ اللہ کی خوشنودی کے لیے نہیں جلائی گئی ہے، اس کو بجھادے۔

اس طرز فکر سے، رہبانیت کی قسم کے، جو شبہات اسلامی تصوف کے بارے میں پیدا ہوتے ہیں، انہیں ختم ہوجانا چاہیے اور سمجھنا چاہیے کہ اسلام یا تصوف کا نصب العین اس کے سوا کچھ نہیں کہ ذہن وفکر سے متعلق بدرجہ غایت صحت مند اور خوشگوار تبدیلیاں روا رکھی جائیں اور بس۔

آخرت کے بارے میں تصوف کا یہ رجحان خود ساختہ نہیں، قرآن سے ماخوذ ہے۔ ہم اس سلسلہ میں صرف چند آیتیں پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

۱- ولاجر الآخرة اکبر. (النحل: ۴۱)

اور آخرت کا اجر وصلہ تو کہیں بڑھ کر ہے۔

۲- وللدار الاخرة خير. (الانعام: ۳۲)

اور اچھا گھر تو آخرت ہی کا گھر ہے۔

۳- وابتغ فيما اتک الله الدار الاخرة (القصص: ۷۷)

اور جو کچھ تمہیں اللہ نے دے رکھا ہے، اس سے آخرت کی بھلائی کا سامان فراہم کرو۔

۴- وان الدار الآخرة لهی الحيوان. (العنكبوت: ۶۴)

اور دار آخرت کی زندگی ہی اصل اور حقیقی زندگی ہے۔

جن لوگوں نے صوفیہ کے حالات وسوانح کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ ان میں اکثر ایسے ہیں، جو کھانے پینے اور رہنے سہنے کے جن معیاروں کو اختیار کیے ہوئیں ہیں، ان کا کوئی بھی تعلق، بظاہر اس تعبیر و وضاحت سے نظر نہیں آتا، جو ہم نے ان کے دفاع وحمایت کے جوش میں اختیار کی ہے، کیوں کہ ان میں ایک بڑی تعداد ایسی ہے، جس کا لباس صاف ستھرا نہیں، جس کی غذا کافی اور صحت وتوانائی کے لیے کافی نہیں اور جن کے رہنے کی جگہ اور طریق ایسے نہیں، جو دل کو بھائیں، اور دیکھنے والے کو متاثر کریں۔ یہی نہیں، یہ حضرات اسی کو فقر کا حاصل سمجھتے ہیں۔

ہمارے نزدیک یہ شبہ بجا ہے، لیکن اس کے باوجود ہم کہیں گے کہ نصب العین تصوف ہمارے نزدیک وہی ہے، جس کی ہم نے تشریح کی ہے۔ مزید برآں اگر تصوف کو ایک محرک اعلیٰ اور مؤثر ترین عنصر حیات کی صورت اختیار کرنا ہے اور معاشرہ کے رجحانات کو بدلنا ہے اور اہل دنیا کو آخرت کی طرف مائل کرنا ہے، تو پھر اس کی صحیح شکل یہی ہے کہ حضرات صوفیہ اس سابقہ ذوق و رجحان سے دست بردار ہوں اور ایک جیتا جاگتا اور اونچا تصور حیات اپنائیں، جو دلوں میں اللہ کی محبت پیدا کرے اور دنیا میں خوبصورتی اور توانائی کے ساتھ رہنا سکھائے۔

صوفیا میں سے اکثر قدما نے یہ انداز حیات کیوں اختیار کیا؟ اس کے بارے میں ہمارے نزدیک چار عذر پیش کیے جاسکتے ہیں:

۱- یہ دراصل اس حد سے بڑھے ہوئے جذبۂ دنیاداری اور دنیا طلبی کے خلاف ایک ردعمل یا بغاوت تھی۔ جس کے مسرفانہ تقاضے اپنی انتہا کو پہنچ چکے تھے۔

۲- ایک حد تک، اس میں ایسے رجحانات اور جذبات وعواطف کا بھی دخل تھا، جو بالکل ذاتی اور انفرادی نوعیت کے تھے۔

۳- اس انداز زیست کو اول اول محض عارضی اور آزمائشی طور پر اختیار کیا گیا ہوگا، تاکہ نفس کی اچھی طرح تہذیب و اصلاح ہو سکے، لیکن کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد، ان حضرات نے ازراہ تساہل اس اسلوب حیات کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تصوف اور اصلاح احوال کے لیے طرۂ امتیاز قرار دے لیا۔

۴- جو لوگ ہموم آخرت کو نصب العین قرار دیں گے اور صرف اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنے کی جدوجہد کریں گے، ان کا دنیا کے بارے میں کسی نہ کسی حد تک تساہل ہونا مستبعد نہیں، بلکہ اگر یہ لوگ متساہل نہ ہوں، تو البتہ تعجب آفریں ہے۔

ان نکات کو ذہن میں رکھیے تو شبہ کی شدتیں بڑی حد تک ختم ہو جائیں گی۔

صحیح اور غلط تصوف

اپنے تجربات و مشاہدات
کے حوالے سے جائزہ

خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ نقشبندی سلسلہ کے ایک ذیلی سلسلہ کے بانی ہیں۔ موصوف نے مشاہدہ حق کی خاطر ۲۲ سال تک مجاہدے کئے، تقسیم ہند کے بعد وہ ہجرت اختیار کر کے، لاہور میں آباد ہوئے، تصوف اور زوال امت کے اسباب کے موضوع پر ان کی مختلف کتابیں موجود ہیں۔ لاہور میں ان کے سلسلہ کے بزرگ حضرت غلام رسول صاحب اس سلسلہ کے فروغ کے لئے کوشاں ہیں۔

زیر نظر مضمون حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کے خطبات پر مشتمل کتاب "چراغ راہ" سے ماخوذ ہے۔

مجھے مطلق یاد نہیں کہ مجھے تصوف اور فقیری کا ذوق کب سے پیدا ہوا۔ ہاں، اتنا جانتا ہوں کہ جب سے آنکھ کھولی اور ہوش سنبھالا، اپنے آپ کو فقر وتصوف کے جال میں پھنسا ہوا پایا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ میرے دادا حضرت مولاناؒ عبدالعزیز صاحب رحمتہ اللہ علیہ نہ صرف اپنے وقت کے ایک جید عالم دین، بلکہ ایک بہت بلند پایہ ولی اللہ بھی تھے۔ میں نے انہی کی آغوش محبت میں آنکھ کھولی اور دس برس کی عمر تک، انہی کے سایہ شفقت میں پروان چڑھا۔ دادا صاحب کے پاس ہر قسم کے بزرگ آتے تھے اور دس پانچ تو ہر وقت موجود ہی رہتے تھے۔ ان میں مولوی بھی ہوتے تھے اور صوفی بھی۔ اول درجے کے متشرع بزرگوں سے لے کر رسول

شاہیوں، قلندروں بلکہ ملنگوں تک، ہر قسم کے لوگوں کو میں نے دیکھا اور ان سے نادانستہ طور پر طرح طرح کا تاثر حاصل کیا۔ میں دس برس کا تھا کہ دادا صاحب کا انتقال ہوگیا۔ اس وقت سے بیس برس کی عمر تک برابر اس کوشش میں رہا کہ کسی بزرگ سے بیعت ہوکر باقاعدہ سلوک طے کروں اور اس غرض سے سینکڑوں بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جہاں کسی اچھے بزرگ کی خبر سنی، وہیں پہنچا، لیکن کہیں بھی طبیعت نہ جمی۔

دادا صاحب کے فیض تربیت اور تعلیم سے طبیعت میں توحید کا رنگ بہت گہرا ہوگیا تھا۔ اور ایک ایسے بزرگ کی جستجو تھی، جو شریعت کا پابند ہونے کے ساتھ ساتھ روشن خیال بھی ہو۔ تنگ خیالی سے مجھے بچپن ہی سے کوفت ہوتی تھی۔ میں صرف کشف وکرامات کو بزرگی کا ثبوت نہ جانتا تھا۔ مجھے تو ایسے بزرگ کی تلاش تھی جو صاحب علم، صاحب عرفان اور صاحب تحقیق ہو۔ کشف وکرامات دکھانے والے تو بہت مل جاتے ہیں۔ لیکن عارف اور محقق کہاں نظر آتے ہیں۔ چنانچہ دس سال اسی بے چینی اور تگ و دو میں گزر گئے۔

ان دس سالوں میں سینکڑوں فقیروں سے ملنا ہوا۔ عجب عجب رنگ کے لوگ دیکھے۔ زیادہ تر تو ایسے لوگ ملے، جو بالکل جھوٹے اور جعلساز تھے۔ فقیری کی الف بے تے بھی ان کو نہ آتی تھی۔ صرف لباس فقیرانہ تھا۔ اور کچھ شعبدے اور چٹکلے جانتے تھے۔ کوئی روپیہ کو مٹھی میں بھینچ کر دودھ نکال دیتا تھا۔ کوئی پانی دم کرکے، اس کو میٹھا کر دیتا تھا۔ کوئی سونا اور چاندی بنا کر دکھا دیتا تھا۔ کوئی زیور اور نوٹ دگنے کر دیتا تھا۔ دنیا تھی کہ ان کے شعبدوں کو کرامات سمجھ کر، اس طرح ٹوٹی پڑتی تھی، جیسے شہد پر مکھیاں۔ لیکن میں نے جب ان کو قریب سے دیکھا اور رازہائے اندرون پردہ معلوم کیے، تو یہ ظاہر ہوا کہ وہ سب جھوٹے، دغاباز، انتہائی گندے اور بے ایمان بلکہ بدمعاش تھے۔ ان کے علاوہ ایک اور گروہ سے سابقہ پڑا۔ یہ لوگ عملیات اور

تعویذ گنڈوں کے بل بوتے پر فقیری کرتے تھے۔ ان میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے، جن کے تابع کوئی موکل یا ہمزاد تھا۔ ان کی سب سے بڑی کرامت یہ تھی کہ لوگوں کو کہیں سے کوئی چیز منگا دیتے تھے یا ان کے گھر کی کوئی بات بتادیتے تھے۔ ان میں ایسے بدمعاش بھی تھے، جو اپنے موکل یا جن کو حکم دیتے کہ فلاں عورت کے سر پر سوار ہوجاؤ۔ پھر خود عامل بن کر وہاں پہنچتے اور اس خبیث کو اتار کر خوب روپیہ بٹورتے۔ ان میں کوئی ایسا بھی تھا، جو اپنے موکل کے ذریعہ بیماروں کا مرض معلوم کرکے، بیان کردیتا اور پھر گنڈے تعویذ سے اس مرض کا علاج کرتا اور سینکڑوں روپے فیس لیتا۔ دہلی میں ایک ایسے ہی عامل کو میں نے دیکھا، جس نے اس کام سے لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ کمایا اور سینکڑوں ایکڑ زمین خریدی۔ تعویذ گنڈے کرنے والوں میں خال خال ایسے لوگ بھی دیکھے جو نہایت نیک اور عبادت گزار تھے۔ اور ان کے عملیات سے خلق خدا بہت فائدہ اٹھاتی تھی۔

لیکن تصوف اور سلوک سے یہ لوگ بھی بالکل نابلد اور محض ناآشنا تھے۔ مگر لوگ ان کو ولی اللہ سمجھ کر، ان سے مرید ہوتے اور خوب نذرانے دیتے تھے۔

ایک اور گروہ دیکھا، یہ لوگ آبادی سے باہر تکیوں اور خانقاہوں میں رہتے۔ شرع سے بالکل بے نیاز اور شرعی عبادات سے بالکل ناآشنا۔ دن رات چرس کے دم لگاتے، بھنگ کے پیالے چڑھاتے اور ہر وقت ہو، حق مچاتے تھے۔ یہ لوگ بدن پر بھبوت ملتے، ہاتھوں میں لمبے لمبے چمٹے اور سر پر بڑے بڑے بال رکھتے تھے۔ اور اپنے آپ کو ملنگ اور قلندر کہتے تھے۔ میں نے ان لوگوں میں بھنگ اور چرس کے سوائے اور کوئی بدچلنی یا بدکاری نہیں دیکھی اور اگر ہو تو خدا ہی جانتا ہے۔ تعجب تو یہ ہے کہ ان میں سے بعض بعض میں بے پناہ روحانی قوت تھی۔ ایک ہی نظر میں انسان کا قلب جاری کردیتے تھے۔ یہ بیماروں کا علاج بھی کرتے اور ایک چٹکی راکھ یا ایک گھونٹ پانی سے، بڑی بڑی پرانی بیماریاں منٹوں، سیکنڈوں میں دور ہوجاتی

تھیں۔ ان میں کشف بھی اعلیٰ درجہ کا تھا۔ ماضی کا حال ایسے بیان کرتے، جیسے آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں۔ مستقبل کی بابت پیشین گوئیاں بھی کرتے، جو اکثر ٹھیک ہوتی تھیں۔ ان کی طرف میرے دل نے بہت رجوع کیا، لیکن دادا صاحب کی دی ہوئی تعلیم آڑے آئی اور میں نے باوجود ان کرامات کے، ان سے بھی کنارہ کشی اختیار کرلی۔

ایسے لوگ بھی دیکھے جو بڑے پاک باز عابد زاہد اور مرتاض تھے۔ یہ دنیا سے الگ پہاڑوں اور جنگلوں میں رہتے اور دن رات اللہ اللہ کرتے تھے۔ یہ واقعی بزرگ تھے۔ کشف وکرامات ان کے لیے بہت معمولی بات تھی۔ میرے دل میں اب بھی ان کی عزت ومحبت اور بڑی قدرو منزلت ہے۔ لیکن ان میں بھی ایک نقص تھا۔ یعنی ان کی زندگی رہبانیت کی زندگی تھی اور رہبانیت خلاف اسلام ہے۔ اس لیے میں نے ان سے ملنا اور ان کے پاس جانا بھی چھوڑ دیا۔

ان کے علاوہ ایک اور جماعت سے شرف نیاز مندی حاصل ہوا۔ یہ علمائے دین کی جماعت تھی۔ یہ بھی صوفیوں کی طرح عوام کو بیعت کرتے اور ہزارہا مریدوں کو ہدایت فرماتے تھے۔ لیکن ان میں سے خال خال ہی ایسے تھے، جو تصوف والی روحانیت کے حامل ہوں۔ زیادہ تعداد ایسے بزرگوں کی تھی، جو صرف تقویٰ وعبادت کے لیے بیعت کرتے تھے۔ یعنی صرف صاحب قال تھے، صاحب حال نہ تھے۔ بہرحال اس جماعت کے پاس بھی میرے درد دل کا مداوا نہ تھا۔ تاہم میں ان کے کام کو عوام کے لیے مذہبی نقطۂ نظر سے بہت اہم اور لازمی سمجھتا ہوں۔

ایک ایسی جماعت بھی دیکھی، جو سرتاپا تصوف کے رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اور اس کے افراد ہر لحاظ سے صوفی اور بزرگ نظر آتے تھے۔ میرا اشارہ ان پیروں اور بزرگوں کی طرف ہے، جو بڑی بڑی درگاہوں اور آستانوں کے سجادہ نشین تھے۔ ان میں کثیر تعداد ایسے پیروں کی تھی۔ جو صرف ظاہری رکھ رکھاؤ اور آستانوں کی

شان و شوکت کی وجہ سے مرجع خلائق تھے۔ ورنہ حقیقتاً روحانی طاقت اور معرفت وحقیقت کے لحاظ سے صفر ہی تھے۔ ہاں! جہاں تک کتابی مسائل تصوف کا تعلق ہے۔ خاصہ اچھا علم رکھتے تھے۔ پھر بھی اس جماعت میں کئی بزرگ ایسے ملے، جو تصوف کے ظاہری علم کے ساتھ ساتھ باطنی دولت سے بھی مالا مال تھے۔ اور انہی میں سے بعض بعض کو علم معرفت بھی خوب حاصل تھا۔ ان بزرگوں میں سے کسی نہ کسی سے میں ضرور بیعت ہوجاتا۔ لیکن ایک بات مانع ہوئی اور وہ تھی ان کی دربار داری، دنیوی شان وشوکت اور کروفر۔ فقیرانہ سادگی ایک جگہ بھی نظر نہ آئی۔ ہر ایک آستانہ کے ساتھ، صاحب آستانہ کے آباؤ اجداد کی ایک دو قبریں ضرور تھیں، جن کا احترام اس قدر کیا جاتا تھا۔ جو کعبہ کے احترام سے بھی بڑھ جاتا تھا۔ اور پوجا کی حد تک پہنچ جاتا تھا۔ بہت سے آستانوں کے صاحبان سجادہ ان قبروں سے بھی زیادہ پوجے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کو باقاعدہ سجدے کیے جاتے تھے۔ اور یہ سب باتیں اس تعلیم کے خلاف تھیں جو مجھے ملی تھی۔

مختصر یہ کہ دس برس اسی تلاش وطلب میں گزر گئے۔ لیکن اس زمانہ میں جو علم اور تجربہ فقیری کی بابت ہوا، وہ بہت ہی بیش قیمت تھا۔ بزرگوں اور فقیروں کی ملاقات کے علاوہ اسی زمانہ میں تصوف کی بہت سی کتابوں کا مطالعہ بھی کیا۔

دادا صاحب مرحوم ایک بہت بڑا کتب خانہ بھی چھوڑ گئے تھے، جس میں کم وبیش دو ہزار کتابیں سیر وسلوک اور تصوف پر تھیں۔ ان میں سے کئی سو کتابیں پڑھ ڈالیں۔ اگرچہ بہت سی کتابیں مطلق سمجھ میں نہ آئیں، تاہم کچھ نہ کچھ علم تو حاصل ہو ہی گیا۔ آخرکار اس تلاش وطلب کا نتیجہ نکلا اور بہت اچھا نکلا۔ سچ ہے دیر آید درست آید۔ مطلب یہ کہ اچانک اور اتفاقاً حضرت مولانا کریم الدین احمد رحمتہ اللہ علیہ سے ملاقات ہوگئی۔

پہلے ہی دن میں حضرت مولاناؒ کی خدمت میں چھ گھنٹے حاضر رہا اور بیعت

ہوکر ہی اٹھا۔ حضرت صاحب نے فرمایا بھی کہ دو چار ماہ ہماری صحبت میں رہو۔ اور ٹھوک بجا کر پرکھ لو۔ پھر بیعت ہونا، مگر میں نے عرض کیا، خدا جانے پھر وقت اور موقعہ ملے نہ ملے۔ جو کچھ مجھے دیکھنا تھا دیکھ لیا۔ مہربانی فرمائیں اور مجھے بیعت کرلیں۔

مولاناؒ نے دریافت فرمایا۔

''کس غرض سے بیعت ہونا چاہتے ہو؟''

میں نے عرض کیا۔

''تین مقاصد ہیں۔'' اول روحانی طاقت، دوسرے تزکیہ اخلاق، تیسرے دیدار باری تعالیٰ مولاناؒ نے فرمایا۔

''پہلی دو چیزیں تو تم کو میرے ذریعہ سے مل جائیں گی۔ لیکن تیسری چیز یعنی دیدار باری تعالیٰ میرے بس کی بات نہیں۔ اس کے بدلے میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ معرفت باری تعالیٰ کسی نہ کسی قدر حاصل ہوجائے گی۔''

میں نے عرض کی کہ ''دیدار خدا ممکن بھی ہے۔'' مولاناؒ نے فرمایا ''ممکن کیوں نہیں، رسول اللہ ﷺ کو حاصل ہوا۔ حضور ﷺ کے صحابہ کبار کو میسر آیا۔ حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ ''میں دل کی آنکھ سے اللہ کو دیکھتا ہوں۔'' پھر حضور ﷺ کی امت، اس سے کس طرح محروم رہ سکتی ہے۔ اکابر اولیاء جتنے بھی گزرے ہیں، سبھی جیتے جی اپنے رب کے دیدار سے مشرف ہوئے۔ لیکن اللہ کا دیدار ان ظاہری آنکھوں سے نہیں ہوتا، بلکہ ایک باطنی آنکھ پیدا ہوجاتی ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کو اپنی طاقت کے مطابق یقیناً دیکھتی ہے۔ اور اسی کے بعد ہی ایمان کا وہ درجہ نصیب ہوتا ہے۔ جس میں کبھی کمی اور شک پیدا نہیں ہوسکتا۔''

اس پر میں نے پوچھا کہ ''آپ اتنا بتادیں کہ یہ دولت میری قسمت میں ہے بھی یا نہیں۔'' مولاناؒ نے تھوڑی دیر سکوت فرمانے کے بعد کہا ''ہاں تمہارے دل میں اللہ تبارک تعالیٰ نے ایک ایسی چیز پیدا کی ہے کہ جب تک تم زندگی میں خدا کو نہ دیکھ لوگے، مروگے نہیں۔''

میں نے عرض کی۔ ''اتنا اور بتادیں کہ کس عمر میں یہ دولت حاصل ہوگی۔''

مولاناؒ نے فرمایا۔ ''ساٹھویں سال میں۔'' میں نے پوچھا۔ ''آپ اس وقت حیات ہوں گے۔'' جواب دیا۔ ''واہ میری تو قبر کا نشان بھی اس وقت نہ ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''پھر یہ چیز کس کے توسل سے ملی گی۔'' جواب دیا کہ ''میاں صاحبزادے ایک گندم کا دانہ یا ایک قطرہ پانی، جو تمہارے حلق سے نیچے اترتا ہے، اس پر تمہارا نام لکھا ہوتا ہے۔ اور اللہ کے حکم اور قضا وقدر کے انتظام سے تم تک پہنچایا جاتا ہے۔ تو کیا یہ روحانی دولت اس قدر سستی اور بے حیثیت چیز ہے کہ یونہی بغیر اللہ کی مرضی کے جس کا دل چاہے وہ حاصل کرلے۔ یہ بھی اللہ کے حکم اور فضل ہی سے ملتی ہے۔ اور جس کو وہ نوازنا چاہے، اس کے لیے ہزار وسیلے بھی پیدا کردیتا ہے۔ تم کو بھی کوئی ایسا بزرگ مل جائے گا۔ جس کی تعلیم اور صحبت سے تمہارے اندر وہ صلاحیتیں پیدا ہوجائیں گی۔ جو جیتے جی اللہ کا دیدار حاصل کرنے کے لیے لازمی ہوتی ہیں۔'' اس پر میں نے بڑی بے صبری اور عاجزی سے دریافت کیا کہ ''وہ باتیں کون کون سی ہیں، جن سے یہ صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ کچھ بیان فرمادیں تاکہ میں ابھی سے وہ خوبیاں پیدا کرنے کی کوشش کروں۔''

مولاناؒ: صرف دو باتیں، پہلی بات تو تزکیہ اخلاق ہے۔ دوسری بات یہ ہے۔ سب کچھ چھوڑ کر اللہ کے ہوجاؤ۔ جیسا کہ سورہ مزمل میں خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ وتبتل الیہ تبتیلا.

میں: قبلہ اس سے تو میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ ذرا تفصیل سے ارشاد فرمائیں تزکیہ اخلاق سے کیا مراد ہے؟

مولاناؒ: مفصل تو بہت وقت طلب ہے، مختصر یوں سمجھئے کہ دنیا میں دو چیزیں

ہیں۔ خیر وشر، نیکی، بدی، برائی، بھلائی یا گناہ وثواب، ان میں سے آپ جہاں تک ہو سکے، برائی کو کم کریں اور بھلائی یا نیکی پر عمل زیادہ کرتے جائیں۔ جیسے جیسے برائی کم اور نیکی زیادہ ہوتی جائے گی۔ آپ کا ذہن اور آپ کی روح لطیف اور پاکیزہ ہوتی جائے گی۔ یہاں تک کہ جب کبیرہ گناہوں سے آپ بالکل محفوظ ہو جائیں گے۔ تو آپ کے قلب میں پہلا درجہ اس صلاحیت کا پیدا ہوگا، جو اللہ کی صفاتی تجلیات کے مشاہدہ کے لیے ضروری ہے۔ اور جب آپ یہاں تک قلب کی صفائی کرلیں گے کہ برائی کا خیال بھی ذہن میں نہ آئے تو آپ کے قلب میں یہ صلاحیت پیدا ہو جائے گی۔ کہ اللہ کی ذات کو اپنی صلاحیت کی مقدار کے لحاظ سے کم یا زیادہ مشاہدہ کرسکیں۔

میں: مگر قبلہ، یہ تو بہت مشکل کام ہے۔

مولاناؒ: ہاں! ہے تو مشکل۔ مگر برخوردار من، خدا کا دیدار بھی تو معمولی چیز نہیں۔ دنیا کے کسی معمولی حاکم یا گورنر وغیرہ کے حضور میں جانا ہو تو اس کے لیے کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ تو خدا تک پہنچنے اور اس کا مشاہدہ کرنے کے لیے تو اگر جان بھی دینی پڑے تو کچھ بڑی بات نہیں۔

میں: تو یہ کس طرح ہوسکتا ہے؟

مولاناؒ: سچی طلب اور تڑپ اور ان تھک محنت سے کیا کچھ نہیں ہوسکتا۔

میں: قبلہ، مجھے تو صاف الفاظ میں یہ بتادیں کہ تزکیہ اخلاق کے لیے کیا کیا کرنا چاہیے۔

مولاناؒ: اچھا سنیے۔ پہلی بات تو یہ کہ پانچ وقت نماز کے پابند رہو۔

دوسری بات، یہ کہ ذکر جتنا بھی ہو سکے کرو۔ ذکر سے مراد یہ ہے کہ، زبان سے اللہ اللہ کہو اور دل میں اس کی یاد مستقل طور پر قائم کرلو۔

تیسری بات، یہ کہ دنیا کے تمام حقوق خوشی سے پوری طرح ادا کرو۔ کراہت اور مجبوری سمجھ کر نہیں بلکہ خوشی سے ادا کرو۔ انہی میں تمہارے منصبی فرائض بھی شامل ہیں۔

چوتھی بات، یہ ہے کہ طبیعت میں عاجزی اور فروتنی پیدا کرو۔ اپنے آپ کو کسی سے افضل اور کسی دوسرے کو اپنے سے کمتر یا ذلیل نہ سمجھو۔

پانچویں بات، خلق خدا سے محبت کرو۔ اور کسی کو اپنی کسی حرکت سے رنج نہ پہنچاؤ۔

میں: بجا فرمایا جزاک اللہ۔ اب کچھ تبتل الیہ تبتیلا کے متعلق ارشاد فرمائیں کہ وہ کس طرح کیا جاتا ہے۔

مولاناؒ: اس کو تصوف کی اصطلاح میں ترک ماسویٰ اللہ کہتے ہیں۔ اس کا مطلب بہت سے بزرگوں نے یہ لیا کہ دنیا اور دنیا والوں سے بالکل قطع تعلق کر کے، جنگلوں اور پہاڑوں میں جا بیٹھو اور ہر وقت اللہ کے ساتھ مشغول رہو۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور بڑے بڑے مراتب پائے۔ لیکن باوجود ازیں وہ غلطی پر تھے۔ کیونکہ ایک مسلمان کو فہم قرآن کے لیے ضروری ہے کہ قرآن کے ہر حکم وہدایت کو رسول اللہ ﷺ کی زندگی اور حضور ﷺ کے اسوہ حسنہ کی روشنی میں سمجھے۔

اب حضور اکرم ﷺ کی زندگی پر ایک سرسری نظر بھی ڈالیں، تو صاف نظر آتا ہے کہ حضور ﷺ نے تو یہ کبھی بھی نہیں کیا، کہ دنیا سے بالکل بے تعلق ہوکر، راہبانہ زندگی بسر کی ہو بلکہ حضور ﷺ نے تو ہمیشہ ایک متاہل زندگی بسر کی۔ اور اس کے ساتھ عوام کی ہدایت و خدمت میں بھی ہمیشہ مصروف رہے۔ حضور ﷺ نے ملازمت بھی کی۔ تجارت بھی کی، مزدوری بھی کی اور بادشاہت بھی کی۔ حضور ﷺ ایک بہترین شوہر، بہترین باپ، اور بہترین دوست تھے۔ حضور ﷺ اعلیٰ درجے کے قانون ساز، حاکم وناظم اور جج بھی تھے۔ یہی نہیں بلکہ آپ ایک اول درجے کے سپاہی اور بے مثال جرنیل بھی تھے۔ اور ان سب چیزوں کے ساتھ ساتھ، آپ کا دلی

تعلق، سوائے خدا کے اور کسی چیز کے ساتھ نہ تھا۔ سوتے جاگتے، اٹھتے، بیٹھتے ایک سیکنڈ کے لیے، خدا کی یاد سے غافل نہ ہوتے تھے۔ اسی کا نام ہے، ترک ما سویٰ اللہ۔

میں: سبحان اللہ۔ مگر قبلہ یہ تو بہت ہی مشکل بات ہے۔

مولاناؒ: پھر وہی۔ برخوردار، جتنا عظیم و عالی شان مقصد ہوتا ہے۔ اتنی ہی زیادہ مشکلات اس کے حصول میں پیش آتی ہیں۔ اگر خس وخاشاک اور کنکر، پتھر اکٹھے کرنے ہوں تو گھر سے باہر نکلو اور فوراً گٹھڑی باندھ کر لے آؤ۔ لیکن اگر کان میں سے سونا حاصل کرنا ہو، تو معلوم ہے کس قدر مصیبتیں اور تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ سیدھی سی بات تو یہ ہے کہ اگر مشکلات کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ تو اس راہ میں قدم ہی نہ رکھو۔ کس نے آپ سے کہا ہے کہ بیٹھے بٹھائے آرام وآسائش کی زندگی چھوڑ کر، اس بکھیڑے میں پڑو اور اپنی جان کو روگ لگاؤ۔

میں: بالکل بجا فرمایا۔ اچھا تو اب مجھے بیعت کر لیں۔

مولاناؒ: ان تمام باتوں کو جان لینے کے بعد بھی آپ بیعت ہونا چاہتے ہیں۔

میں: جی ہاں۔

مولاناؒ: اچھا! یک بات اور بتایئے کہ آپ محض روحانی ترقی کے لیے بیعت ہو رہے ہیں۔ دنیوی ترقی کا تو کوئی خیال مدنظر نہیں۔

میں: جی نہیں۔

مولاناؒ: دل کو خوب ٹٹول لو۔ کبھی یہ خیال ہو کہ ہمارے مرشد بہت بڑے بزرگ ہیں۔ کرامات کے زور سے لکھ پتی بنا دیں گے، سونا بنانا بتادیں گے یا دست غیب سکھادیں گے۔ اگر اس قسم کا ذرا سا بھی کوئی خیال ہے تو خوب کان کھول کر سن لو کہ مجھے ان چیزوں میں سے کسی پر بھی قدرت حاصل نہیں۔ دوسری بات یہ کہ اگر دنیوی فوائد کا ذرا سا خیال بھی دل میں ہے اور زباں سے آپ اس کا انکار کر رہے

ہیں تو آپ جھوٹے ہیں، منافق ہیں اور ایسے آدمی کو روحانیت تو کیا نصیب ہوگی۔ آخر میں سخت گھاٹا اور نقصان ہی رہے گا۔ اب فرمایئے کیا ارادہ ہے؟

میں: بیعت فرما لیجیے۔

مولاناؒ: بہت اچھا۔

اس کے بعد مولاناؒ نے اپنی جیب سے کچھ پیسے دے کر مٹھائی منگوائی اور مجھے بیعت کر لیا۔ مولاناؒ سلسلہ نقشبندیہ کے بزرگ تھے۔ بہت مختصر سا ذکر وغیرہ کرنے کو بتایا۔ وہی جو میں آپ حضرات کو بتایا کرتا ہوں۔ یعنی چوبیس گھنٹے پاس انفاس اور کسی ایک نماز کے بعد نفی اثبات۔ فرق صرف یہ ہے کہ، مولاناؒ نے مجھ کو پانچ ہزار مرتبہ نفی اثبات کا ذکر بتایا تھا۔ اور میں آپ کو ایک تسبیح سے لے کر، زیادہ سے زیادہ پانچ تسبیح تک بتاتا ہوں۔ تعجب یہ ہے کہ خاندان نقشبندیہ میں ذکر بالجہر منع ہے، لیکن مولاناؒ نے مجھے ذکر بالجہر ہی بتایا تھا۔ اس کے علاوہ تزکیہ اخلاق کی ہدایت کی تھی۔

بیعت ہونے کے بعد میں نے بڑی جانفشانی اور جوش وخروش سے تین برس متواتر اپنے اوراد جاری رکھے اور ان تین برسوں میں، اللہ کے فضل وکرم سے تین لطیفے قلب، روح اور سر روشن ہوگئے اور ان کے دوائر کی سیر بھی میسر آگئی۔ اس پر مولاناؒ نے مجھے مبارک باد دی اور تحریری اجازت بیعت کرنے کی عطا فرمائی۔ اس وقت میری عمر بمشکل ۳۱ برس کی ہوگی۔ بدیں وجہ مولاناؒ نے اجازت نامہ میں یہ لکھ دیا کہ اگرچہ بیعت کرنے کی اجازت دے دی گئی ہے۔ لیکن جب تک چالیس سال کی عمر نہ ہوجائے، کسی کو بیعت نہ کرنا۔ اس کے ساتھ ہی یہ ہدایت کی کہ اب تم نوافل تہجد پر بہت زور دو اور جس قدر زیادہ ممکن ہو، تلاوت اور تفکر یعنی مراقبے میں وقت گزارا کرو۔ اس صحبت کے بعد حضرت مولاناؒ سے بہت دفعہ ملاقات ہوئی، یہاں تک کہ ۱۹۲۰ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔

اب مجھ کو یہ بتانا چاہیے کہ مولاناؒ کی تعلیم کیا تھی۔ لیکن، اس سے پہلے یہ بتا

دینا بہت ضروری ہے کہ جب دس سال تک میں بڑے بڑے بزرگوں سے ملتا رہا اور ان میں سے کسی کے ہاتھ پر بیعت نہ کی، تو مولاناؒ کریم الدین احمد رحمتہ اللہ علیہ میں وہ کونسی خوبی تھی کہ، پہلی ہی ملاقات اور پہلی ہی نشست میں ان سے بیعت ہوگیا۔ تو وجہ اس کی یہ ہوئی کہ میں نے اپنے دادا حضرت رحمتہ اللہ علیہ سے جو خوبیاں اور نشانیاں ایک اچھے بزرگ کی سنیں اور کتب تصوف میں پڑھی تھیں۔ حضرت مولاناؒ میں وہ سب کی سب موجود تھیں۔ اول تو یہ کہ وہ شریعت کے بہت سخت پابند، بلکہ شریعت مجسم تھے۔

دوسرے یہ کہ وہ نہ صرف ایک جید عالم دین تھے۔ بلکہ دنیوی علوم حاضرہ میں بھی کافی دستگاہ رکھتے تھے۔

تیسرے یہ کہ ان کا اخلاق بہت ہی اچھا تھا۔ غریب اور امیر بادشاہ اور فقیر سب کو ایک نظر سے دیکھتے اور اس قدر نرمی، پیار، تواضع، اور خلوص سے ملتے جس کی نظیر ملنی مشکل تھی۔

چوتھے یہ کہ آپ نہایت سادہ مزاج تھے اور بہت ہی سادہ زندگی گزارتے تھے۔ دہلی سے کوئی پچیس تیس میل جنوب میں ''دھوج'' نامی ایک قصبے کے باہر ایک کچا احاطہ تھا، جس میں تین چار چھپر پڑے ہوئے تھے۔ یہی مولاناؒ کا کاشانہ تھا۔ دو چار میو خدمت کیا کرتے تھے اور روٹی وغیرہ پکا دیتے اور دوسری خدمات انجام دیتے تھے۔ مولاناؒ صرف ایک جوڑا کپڑا کھدر کا رکھتے تھے۔ جس کو وہ ہر جمعہ کے دن نماز سے پہلے خود دھوکر پہن لیتے تھے۔ ہر چھ ماہ بعد ایک نیا جوڑا بناتے اور پرانا جوڑا کسی غریب کو دے دیا کرتے۔

مولاناؒ کے بال بچے بڑی عمر کے تھے۔ اور سب اپنے اپنے گھروں میں خوش تھے۔ مولاناؒ پر کسی کا بوجھ نہ تھا، وہ اکیلے ہی رہتے تھے۔ مہینے میں ایک مرتبہ جمعہ کی نماز کے لیے دہلی تشریف لاتے اور بعض اوقات پندرہ بیس دن تک قیام فرماتے۔

آپ ہمیشہ چاندنی چوک کے کسی بہترین ہوٹل میں ٹھہرتے اور دو تین کمرے کرایہ پر لے لیتے۔ یہاں ہر وقت مریدوں کا تانتا لگا رہتا اور مولاناؒ خود سب کو کھانا کھلاتے۔ میں نے مولاناؒ کو کبھی کسی دعوت میں جاتے نہیں دیکھا۔

مولاناؒ مشہور بالکل نہ تھے۔ بلکہ ایک گمنام بزرگ اور ہر لحاظ سے کامل فقیر تھے۔ مولاناؒ کسی گدی یا خانقاہ کے سجادہ نشین نہ تھے۔ وہ قبروں بلکہ بڑے بڑے مزاروں پر جانے کو بھی اچھی نظر سے نہ دیکھتے تھے۔ بزرگوں کا بڑا احترام کرتے، لیکن خدا کے سوا مشکل کشا، کسی کو نہ مانتے تھے۔ غرض یہ کہ وہ ایک بہت پکے موحد تھے۔ موحد میں نے غلط کہا، موحد نہیں بلکہ پکے توحیدی تھے۔

آپ کو موحد اور توحیدی کا فرق معلوم ہے؟ موحد آج کل کے تصوف کی اصطلاح میں اس شخص کو کہتے ہیں جو وحدت الوجود یعنی ''ہمہ اوست'' کا قائل ہو۔ یعنی یہ سمجھتا ہو کہ جو کچھ موجود ہے، سب خدا ہے اور جتنی چیزیں نظر آتی ہیں یہ بھی خدا ہی کی تجلیات ہیں۔ یہ عقیدہ چونکہ تعلیم قرآن کے خلاف ہے۔ اس لیے میں ''توحیدی'' کا لفظ استعمال کرتا ہوں روحانی طاقت اور کشف وکرامات کے لحاظ سے بھی مولاناؒ عدیم المثال نہیں، تو فقید المثال ضرور تھے۔ مجھے جو مولاناؒ کی بات سب سے زیادہ پسند آئی وہ ان کی سادگی اور جدید علوم سے واقفیت تامہ تھی۔ وہ بڑے بڑے الجھے ہوئے مسائل حیات اور مسائل الہیات کو ایسے دلکش اور معمولی بات چیت کے انداز میں بیان فرماتے تھے کہ بڑے بڑے فلاسفروں اور ڈاکٹروں سے لے کر، معمولی سے معمولی تعلیم یافتہ آدمی بھی آسانی سے سمجھ جاتے تھے۔؟ مولاناؒ صرف شراب طہوریٰ پلانے والے ساقی ہی نہ تھے۔ بلکہ تشنگان علم وادب کی پیاس بجھانے والے دریا بھی تھے۔ موجودہ زمانے کے مسائل حیات پر مولاناؒ کی نظر بہت گہری تھی۔ وہ صرف اللہ اللہ ہی نہیں سکھاتے تھے، بلکہ یہ بھی بتاتے تھے کہ دنیا میں آرام وسکون اور عزت وترقی کی زندگی بسر کرنے کا راز کیا ہے۔

علامہ اقبال کے بڑے مداح تھے۔ مولاناؒ سے ایک دو مرتبہ قوم کے زوال اور موجودہ زبوں حالی پر گفتگو ہوئی، تو مولاناؒ نے کئی گھنٹے اس قدر سیر حاصل بحث اس موضوع پر کی، کہ سننے والے جن میں سب کے سب انگریزی تعلیم یافتہ اور کئی پی۔ ایچ ڈی تھے عش عش کر اٹھے۔

مولاناؒ نے جو کچھ فرمایا، وہ سب کا سب بیان کرنا تو ان صفحات میں ممکن نہیں، ہاں تصوف کے نقطہ نظر سے جو کچھ فرمایا، اس میں سے جو کچھ اس وقت یاد آ رہا ہے، اس کے بیان کرنے میں مضائقہ نہیں۔ بلکہ کچھ مفید ہی معلوم ہوتا ہے۔

مولاناؒ فرمایا کرتے تھے کہ صوفیوں اور فقیروں کی قسمیں تو بہت سی ہیں، لیکن تصوف کی قسمیں صرف دو ہیں۔ ایک صحوی، دوسری سکری۔

صحوی تصوف کے معنی ہیں، تصوف بیدار۔ سکری تصوف کے معنی ہیں تصوف خفتہ۔ جب تک کسی قوم کے صوفیوں میں تصوف بیدار کار فرما ہوتا ہے، وہ قوم برابر ترقی کرتی رہتی ہے۔ اس قوم میں زندگی، خوشی، خوشحالی اور فارغ البالی کا دور دورہ رہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قوم کے صوفی، یعنی روحانی علماء زندگی کے تمام راز ہائے سربستہ اور انسانی فطرت سے خوب واقف ہوتے ہیں۔ اور یہی تعلیم وہ اپنے مریدوں اور اپنی قوم کو دیتے ہیں۔ تصوف بیدار، صوفی میں دانشمندی، فراست اور دانشوری پیدا کرتا ہے۔ ایسے صوفی بین الاقوامی مسائل اور اپنے معاشرے اور قوم کی خوبیوں اور خامیوں سے خوب اچھی طرح واقف ہوتے ہیں۔ وہ آئندہ صدیوں تک آنے والے واقعات اور انقلابات کو اس طرح دیکھتے اور سمجھتے ہیں۔ جیسے روز روشن میں یہ سب ان کی آنکھوں کے سامنے موجود ہوں۔ یہ لوگ آئندہ پیش آنے والے واقعات کو کشف سے کم، لیکن اپنے علم وفراست سے زیادہ معلوم کرتے ہیں اور اپنی قوم کے لیے اپنے علم وفراست کی روشنی میں ایک ایسا لائحہ عمل اور دستور پیش کرتے ہیں کہ اگر قوم اس پر کاربند رہے، تو دوسری قوموں سے کبھی شکست نہیں کھا

سکتی۔ اس کو ہرگز زوال نہیں ہوتا۔ بلکہ ہمیشہ دن دونی، رات چوگنی ترقی کرتی رہتی ہے۔

اسلام کے پہلے تیس سالہ دور میں ترقی کا موجب رسول اکرم ﷺ کا پیش کردہ دستور العمل ہی تھا۔ حضور اکرم ﷺ نے مکتبی تعلیم بالکل نہیں پائی تھی۔ باوجود ازیں آپ انسان کے معیشتی اور معاشرتی مسائل کو جتنی اچھی طرح سمجھتے اور جانتے تھے، کیا کوئی بڑے سے بڑا فلاسفر یا عالم اس بات کا دعوی کر سکتا ہے کہ وہ ان مسائل کو رسول خدا ﷺ سے زیادہ اچھی طرح سمجھتا اور جانتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ حقیقت ذات وصفات باری تعالیٰ کی معرفت کے ساتھ ساتھ حقیقت الاشیاء اور حقیقت فطرت انسانی کا اتنا وسیع عرفان رکھتے تھے۔ جو دنیا میں کسی اور انسان کو نہ کبھی حاصل ہوا اور نہ آئندہ ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی حضور ﷺ کو تائید الٰہی بھی حاصل تھی۔ یعنی وحی بھی ہوتی تھی۔ پھر حضور ﷺ سے اچھا دستور العمل انسان کے لیے کون پیش کر سکتا تھا یا کر سکتا ہے۔ دنیا کی جتنی قومیں اس وقت ترقی کے نقطہ عروج پر پہنچی ہوئی ہیں۔ سب کے معاشرتی اور معیشتی قوانین وقواعد پر، غور سے نظر کرو تو صاف معلوم ہوجائے گا کہ ان سب نے اسلام ہی کے قوانین وقواعد کو اپنا رکھا ہے۔ لیکن افسوس اور رونا اس بات کا ہے کہ مسلمانوں نے صرف تیس چالیس برس حضور ﷺ کی تعلیم پر عمل کیا۔ اس کے بعد تاریخ شاہد ہے کہ جیسے جیسے مسلمان حضور اکرم ﷺ کے بنائے ہوئے دستور العمل سے ہٹتے گئے، ان پر زوال آتا گیا۔ یہاں تک کہ آج ہم جیسے کچھ مسلمان ہیں اور اسلام کی تعلیم پر جیسا کچھ عمل کر رہے ہیں اور دنیا میں ہماری جو کچھ حیثیت دوسری اقوام کے مقابلہ میں ہے وہ ظاہر وباہر ہے۔

مولاناؒ فرمایا کرتے تھے کہ رسول خدا ﷺ دنیا کے نہ صرف سب سے بڑے صوفی بلکہ تمام گزشتہ اور آئندہ صوفیوں کے سردار تھے۔ اگر کوئی شخص حضور ﷺ کو

صوفی نہیں سمجھتا تو سمجھ لو کہ وہ جاہل ہے، تصوف کو نہیں جانتا۔

صوفی ہونے کے لیے جتنی شرطیں ضروری ہیں۔ رسول اکرم ﷺ میں وہ سب بدرجہ اتم موجود تھیں۔ صوفی موٹے، جھوٹے بلکہ اونٹ کے بالوں سے بنے ہوئے کپڑے پہنتے تھے۔ حضور ﷺ بھی کملی پوش تھے۔ اللہ نے بڑے لاڈ سے سورہ مزمل میں حضور ﷺ کو کملی والا کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ صفائے قلب، تزکیہ اخلاق، خوش خلقی، عاجزی، انکساری، مساوات سب صوفیوں کی صفات ہیں اور یہ سب رسول خدا ﷺ میں بدرجہ کمال موجود تھیں۔ روحانی طاقت وکشف وکرامات یعنی معجزات میں حضور ﷺ فرو تھے اور ہمیشہ ہی فرو ہی رہیں گے۔ آخری زمانہ میں حضور ﷺ کے پاس مال غنیمت سے اتنی دولت آتی تھی۔ کہ حضور ﷺ کے برابر عرب میں کوئی مالدار ہی نہ تھا۔ خود اللہ تعالیٰ نے سورہ والضحیٰ میں فرمایا ہے۔

ووجدک عائلا فاغنیٰ

یعنی ”کیا ہم نے نہیں پایا تم کو تنگ دست اور نہیں کردیا تم کو مالدار۔“

لیکن باوجود اس افراط دولت کے حضور ﷺ کا یہ حال تھا کہ جتنا مال اور سونا چاندی کسی دن حضور ﷺ کو ملتا، وہ سب کا سب شام کا سورج غروب ہونے سے پہلے غریبوں اور حاجتمندوں کو دے ڈالتے اور خود اکثر فاقے سے رہتے۔ کیا یہ صوفیوں کی سنت اور عادت نہیں ہے۔ علاوہ ازیں جب سارا عرب مسلمان ہوگیا۔ تو حضور ﷺ تمام ملک کے بادشاہ یا حاکم مطلق تھے۔

حضور ﷺ کے حکم کے خلاف کوئی نظر بھی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ لیکن حضور ﷺ نے اپنی اس حیثیت سے کبھی ذاتی فائدہ نہیں اٹھایا۔ حضور ﷺ بادشاہ ہو کر بھی فقیر ہی رہے۔ نہ صرف اپنا بلکہ غریب سے غریب لوگوں کا ہر کام اپنے ہاتھ سے کرتے تھے۔ معمولی لباس زیب تن فرماتے، چٹائی پر سوتے، کمبل اوڑھتے اور ہر وقت

خدمت خلق میں مصروف رہتے۔ کیا یہ سب باتیں صوفیوں اور تصوف کی شرائط اور لوازمات سے نہیں ہیں۔ پھر کون کہہ سکتا ہے کہ حضور ﷺ صوفی نہ تھے۔

ہاں! یہ ضرور ہے کہ حضور ﷺ کا تصوف، تصوف بیدار تھا اور یہ اسی کی برکت ہے کہ آج اس سطح زمین پر ساٹھ کروڑ مسلمان موجود ہیں۔ لیکن اگر یہ مسلمان دوسری اقوام عالم کے مقابلہ میں کمزور ہیں، تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ کے ہر لفظ سے سوز دروں، امعان نظر، وسعت فکر اور پختگی جھلکتی ہے۔ ان کے لہجہ میں خلوص ومحبت کی خوشبو ہے۔ بقول حافظ۔

صوفیاء کا تاریخی کردار

اور اس پر ایک نظر

یوسف سلیم چشتی صاحب، شروع میں تحریک الحاد سے متاثر تھے، علامہ اقبال کی صحبت سے وہ اسلامیت کی طرف گامزن ہوئے۔ اقبال سے صحبت و دوستی کا تعلق رہا۔ علامہ اقبال نے ان کی صلاحیتوں کے پیش نظر انہیں اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپال بننے کی سفارش کی، وہ کئی سال تک اس عہدے پر کام کرتے رہے۔ موصوف نے اقبال کے کلام کی ترجمہ و تشریح پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ "تاریخ تصوف" کے نام سے ان کی ایک معرکتہ الآرا کتاب شائع ہوئی ہے۔ کتاب میں شامل ان کے دونوں مضامین اسی کتاب سے ماخوذ ہیں۔ (مرتب)

تاریخ اسلام میں صوفیائے حق نے، جو شاندار علمی، دینی اور تبلیغی کارنامے انجام دیے ہیں وہ اس قدر طویل الذیل ہیں کہ ان کی تفصیل کے لیے جداگانہ تصنیف درکار ہے، اس لیے اس فصل میں ان کی طرف صرف اجمالی اشارات پیش کیے جاسکتے ہیں۔

(۱) صوفیائے کرامؒ کا پہلا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اسلامی تعلیمات کی حقانیت کو قیل وقال کے بجائے، اپنے عمل سے مبرہن کیا۔ ان کی پاکیزہ زندگیاں اسلام کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔

تصوّف کے ارکان سہ گانہ:

اسلامی تعلیمات کا خلاصہ تین لفظوں میں بیان کیا جاسکتا ہے:

(۱) محبت الٰہی۔ (۲) مکارم اخلاق اور (۳) خدمت خلق۔

روح اسلام کے ان اجزائے ثلاثہ میں منطقی ربط یہ ہے:

(الف) صوفی کی زندگی کا آغاز اور انجام یعنی محور، محبت الٰہی ہے۔ اس کی نظر میں اللہ صرف معبود ہی نہیں ہے، بلکہ مقصود بھی ہے، مطلوب بھی ہے اور محبوب بھی ہے۔ وہ اللہ ہی کے لیے جیتا ہے اور اسی کے لیے مرتا ہے۔ اس کا جینا اور مرنا، یعنی ساری زندگی اللہ ہی کے لیے ہے۔ وہ اس آیت کی زندہ تصویریں ہیں۔

"قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العلمین." (۶: ۱۶۲)

اے رسول (ﷺ) آپ کہہ دیجیے کہ میری نمازیں اور میری رسوم دینی اور میری زندگی اور میری موت، سب اللہ کے لیے ہے، جو ساری کائنات کا خالق اور پروردگار ہے۔

(ب) چونکہ صوفی کا مطمح نظر اور نصب العین اللہ ہوجاتا ہے، اس لیے وہ ہر وقت اس کی خوشنودی یا رضا حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے اور چونکہ اللہ تعالیٰ فاسقوں اور فاجروں، ظالموں اور باغیوں کو ناپسند کرتا ہے، اس لیے وہ تمام منکرات وفحشاء سے مجتنب رہتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ رذائل اخلاق کا ازالہ ہوکر، اس میں مکارم اخلاق پیدا ہوجاتے ہیں۔ مرشد رومیؒ نے اس نکتے کو یوں بیان کیا ہے:

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما
اے طبیب جملہ علت ہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموس ما
اے تو افلاطون و جالینوس ما

یعنی عشق وہ بھٹی ہے، جس میں پڑ کر صوفی کندن ہوکر نکلتا ہے۔

(ج) جب عشق کی بدولت اس میں مکارم اخلاق پیدا ہوجاتے ہیں، تو لامحالہ

اس کا وجود بنی آدم کے حق میں سراپا رحمت بن جاتا ہے اور وہ صحیح معنی میں ان کی خدمت کا اہل ہو جاتا ہے۔

اب ہم ان ارکان سہ گانہ کو صوفیوں کی زندگی سے واضح کریں گے۔

(الف) محبت الٰہی:

سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاءؒ ایک خط میں، اپنے مرید شیخ فخر الدینؒ کو لکھتے ہیں کہ: ''اصحابِ طریقت اور اربابِ حقیقت کا اس باب میں اتفاق ہے کہ انسان کی پیدائش سے، اہم مطلوب اور اعظم مقصود، رب العالمین کی محبت ہے۔''

یہی وجہ ہے کہ صوفیائے کرامؒ نے محبت الٰہی کو، اپنی زندگی کا اصلی مقصد قرار دے لیا تھا۔ چنانچہ حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلیؒ اکثر اوقات میں یہ رباعی نہایت سوز وگداز کے ساتھ پڑھا کرتے تھے:

دنیا شہ را و قیصر وخاقاں را
دوزخ بد را، بہشت مر نیکاں را
تسبیح فرشتہ را، صفا انسان را
جاناں ما را و جانِ ما، جاناں را

سلطان المشائخؒ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں نے اپنے مرشد حضرت بابا فریدؒ کو دیکھا کہ اپنے حجرے میں پشت پر دونوں ہاتھ رکھے کھڑے ہیں، قبلے کی طرف چند قدم بڑھتے ہیں اور یہ رباعی پڑھ کر وجد کر رہے ہیں:

خواہم کہ ہمیشہ در ہوائے تو زیم
خاکے شوم و بزیرِ پائے تو زیم
مقصودِ منِ بندہ ز کونین توئی
از بہرِ تو میرم و برائے تو زیم

یعنی اے اللہ! میں تیرا بندہ ہوں اور تو ہی میرا مقصود ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں، کہ تیرے ہی لیے زندہ رہوں اور تیرے ہی لیے مروں۔

واضح ہو کہ جب، ایک شخص اپنی زندگی اللہ کے لیے وقف کر دیتا ہے، تو اس کے باطن میں ایک انقلاب عظیم رونما ہو جاتا ہے۔ پھر ہر کام میں اس کی نیت یہ ہوتی ہے کہ میرا اللہ مجھ سے راضی ہو جائے۔ وہ کھانا کھاتا ہے، تو اس لیے نہیں۔ اسے لذت حاصل ہو یا اس کا جسم تنومند و توانا ہو، بلکہ اس لیے کہ وہ اس کا ذکر کر سکے۔ کیا خوب کہا ہے شیخ سعدیؒ نے:

خوردن برائے زیستن و ذکر کردن است
تو در گمان کہ زیستن از بہر خوردن است

جب صوفی اس نہج سے زندگی بسر کرنے لگتا ہے، تو اس کا ہر قول اور ہر فعل عبادت بن جاتا ہے۔ اس کی تجارت میں مشغولیت بھی عبادت بن جاتی ہے، کیوں کہ عین خرید و فروخت کے وقت بھی وہ اپنے اللہ کو مدنظر رکھتا ہے۔ وہ تجارت اس لیے نہیں کرتا کہ دولت جمع کرے، بلکہ اس لیے کہ جو نفع حاصل ہو اسے راہِ خدا میں خرچ کرے۔ یہ آیت انہی خاصانِ خدا کی شان میں آئی ہے:

''رجال لا تلهيهم تجارة ولا بيع عن ذكر الله.'' (۲۴ : ۳۷)

یہ وہ لوگ ہیں، جن کو تجارت یا خرید و فروخت اللہ کے ذکر سے غافل نہیں کرتی۔

اس نیت سے اگر لاکھوں کروڑوں روپیہ بھی جمع کیا جائے، تو وہ اکتنازا کے حکم میں نہیں آ سکتا۔ چنانچہ مرشد رومیؒ فرماتے ہیں:

مال را گر بہر دین باشی حمول
نعم مال صالح گوید رسولؐ

یعنی اگر دولت دینی کاموں میں صرف کرنے کی نیت سے جمع کی جائے، تو وہ

مال صالح ہے۔ چنانچہ علامہ اقبالؒ لکھتے ہیں:

گر نداری اندریں حکمت نظر
تو غلام و خواجہ تو سیم و زر
از تہی دستاں کشاد امتاں
از چنیں منعم، فساد امتاں

محبت الٰہی کا انسان پر پہلا اثر یہ مرتب ہوتا ہے کہ اس کی زندگی میں مرکزیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یعنی وہ موحدِ کامل بن جاتا ہے۔ دوسرا اثر یہ مرتب ہوتا ہے کہ انسان ہر وقت یہ محسوس کرتا ہے کہ میں خدا کے سامنے ہوں اور وہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ چنانچہ شیخ علی ہجویریؒ لکھتے ہیں:

"جب بندہ از روئے یقین اس بات کو جان لیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے، تو وہ ہرگز کوئی ایسا کام نہیں کر سکتا، جس سے اس کو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔"

تیسرا اثر یہ مرتب ہوتا ہے کہ اس شخص (عاشق) کی نگاہ میں پتھر اور سونا دونوں برابر ہو جاتے ہیں، بلکہ اس دنیا ہی کی کوئی قیمت باقی نہیں رہتی۔ وجہ یہ ہے کہ جب وہ شخص اللہ سے محبت کرتا ہے، تو اسے بطفیل محبت، عرفان حاصل ہو جاتا ہے اور عارف دنیا کی حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے کہ یہ دار الغرور ہے، کیوں کہ بفحوائے نص قرآنی، دنیاوی زندگی سراسر "متاع الغرور" ہے، یعنی دھوکے کی پونجی ہے۔

عالم اور عارف میں یہی تو فرق ہے کہ عالم اس دنیا کے ظاہر سے واقف ہوتا ہے، لیکن عارف اس کی حقیقت سے آشنا ہوتا ہے، یعنی وہ دنیا کی حقیقت کو پہچان جاتا ہے۔ چوتھا اثر یہ مرتب ہوتا ہے کہ سالک میں توکل اور استغناء کی وہ شان پیدا ہو جاتی ہے، جس کی بدولت شاہانِ عالم، اس کے آستانے پر حاضری کو اپنے لیے باعثِ افتخار، بلکہ باعثِ حصولِ سعادت یقین کرتے ہیں۔ تاریخ ہند کے مطالعے

سے یہ صداقت واضح ہو سکتی ہے کہ التتمش، غیاث الدین بلبن، فیروز تغلق، اکبر، جہانگیر اور شاہجہان نے عاشقانِ الٰہی کے آستانوں پر حاضری دی ہے۔ ناظرین کو تاریخ کی اوراق گردانی سے بچانے کے لیے، ان عاشقانِ الٰہی کے اسمائے گرامی ذیل میں درج کیے دیتا ہوں:

(الف) التتمش، سیدی حضرت اقدس قطب الاقطاب خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کا غلام تھا۔

(ب) بلبن، شیخ شیوخ عالم شاہباز، لامکان خواجہ فرید الدین گنج شکر اجودھنیؒ کا غلام تھا۔

(ج) فیروز تغلق، حضرت اقدس خواجہ نصیر الدین چراغؒ دہلی کا غلام تھا۔

(د) اکبر، حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کا مرید تھا۔

(ہ) جہانگیر، حضرت اقدس شیخ میاں میرؒ کا معتقد تھا۔

(و) شاہجہان، حضرت اقدس شیخ میاں میرؒ اور حضرت شیخ فضل اللہ برہانپوریؒ کا معتقد تھا۔

(ز) سلطان احمد خاں بہمنی، حضرت بندہ نواز سید محمد گیسو درازؒ کا غلام تھا۔

(ح) فاتح جونا گڑھ وچانپانیر سلطان محمود الملقب بہ بے گڑھا (دو قلعوں والا) حضرت اقدس سید شاہ عالمؒ (نبیرۂ مخدوم جہانیاں) کا غلام تھا۔

(ط) بانیٔ سلطنت گجرات سلطان احمد خاں اول، حضرت اقدس شیخ احمد کھٹوؒ کا غلام تھا۔

ان سب بادشاہوں کا یہ عالم تھا کہ ان فقیروں کے سامنے دست بستہ کھڑے رہتے تھے اور ان کی کفش برداری کو اپنی عزت خیال کرتے تھے، جبھی تو اقبالؒ نے یہ لافانی شعر لکھا ہے:

نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیبِ حاضر کی تجلی میں
کہ پائی میں نے استغناء میں معراج مسلمانی

اور میں پورے یقین کے ساتھ یہ بات لکھ رہا ہوں کہ یہ شانِ استغناء صرف مسلکِ تصوف اختیار کرنے سے حاصل ہو سکتی ہے۔

پانچواں اثر یہ مرتب ہوتا ہے کہ سالک (عاشق) اپنے رزق کی طرف سے، اسی رزق کی طرف سے جس کے حصول کے لیے انسان ضمیر اور ایمان تک بیچ دیتا ہے۔ بالکل بے نیاز ہو جاتا ہے، کیوں کہ اسے اس آیت کی صداقت پر کامل یقین ہوتا ہے۔

"ومن یتق اللہ یجعل له مخرجا. ویرزقه من حیث لا یحتسب ومن یتوکل علی اللہ فهو حسبه." (۶۵: ۲، ۳)

اور جو شخص اللہ کی نافرمانی سے ڈرے گا، تو اللہ اس کے لیے مصیبت سے نجات کا راستہ بنا دے گا، (اس کی پریشانی دور کر دے گا) اور اسے ایسی جگہ سے رزق دے گا، جہاں اس کا گمان بھی نہ پہنچ سکے۔ اور جو شخص اللہ پر توکل کرے گا تو وہ (اللہ) اسے کافی ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ صوفی کسی دولت مند کے دروازے پر نہیں جاتا، کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ رازق اللہ ہے نہ کہ انسان۔

اکبر الہ آبادی نے اسی حقیقت کو یوں بیان کیا ہے:

دل میں تو ضعفِ عقیدت کو کبھی راہ نہ دے
کوئی کچھ دے نہیں سکتا اگر اللہ نہ دے

اور اقبالؒ نے اسی صداقت کو یوں نظم کیا ہے:

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاجِ ملوک
اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا وجم

کشف المحجوب میں حضرت اقدس شیخ ہجویریؒ نے لکھا ہے کہ "ایک بادشاہ نے کسی فقیر سے کہا کہ مجھ سے کچھ مانگ، میں تیری خواہش بخوشی قبول کروں گا۔ فقیر نے زیرِ لب تبسم کیا اور کہا "میں اپنے غلاموں کے غلام سے کیا مانگوں؟"

بادشاہ نے متعجب ہو کر پوچھا "یہ کیا کہا؟" فقیر نے جواب دیا "اے بادشاہ سن! تو حرص اور امید دونوں کا غلام ہے اور یہ دونوں میرے غلام ہیں، اس لیے تو میرے غلاموں کا غلام ہے۔"

"انسانی کردار کے نشوونما اور تشکیل پر اس احساس کا بڑا مہلک اثر مرتب ہوتا ہے، کہ وہ اپنی روزی کے لیے کسی دنیوی طاقت کا محتاج ہے۔ تعمیر خودی اس وقت تک ممکن ہی نہیں، جب تک انسان اپنے پورے ایمانی جذبے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو اپنا روزی رساں نہ مان لے۔"

(ب) مکارم اخلاق:

سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: "بعثت لاتمم مکارم الاخلاق" میری بعثت کی غایت یہ ہے کہ میں بہترین اور خوب ترین اخلاق کی تکمیل کر دوں۔

اس لیے صوفیائے کرامؒ نے سلوک کو تمام تر مکارم اخلاق کی تحصیل پر موقوف کیا ہے بلکہ بعض مشائخ نے تو تصوف سے اخلاق حسنہ ہی مراد لیا ہے۔

مشائخ کے نزدیک تصوف کا مقصد صرف یہ ہے کہ پہلے انسان خود اپنے اندر اخلاق حسنہ پیدا کرے پھر بنی آدم کے اندر ان کی تخم ریزی کرے، چنانچہ سلطان المشائخ فرماتے ہیں:

"بہت نماز پڑھنا، وظائف میں بکثرت مشغول رہنا، تلاوتِ قرآن میں بہت مصروف رہنا، یہ سب کام چنداں مشکل نہیں ہیں، ہر باہمت شخص کر سکتا ہے، بلکہ ایک ضعیف بڑھیا بھی کر سکتی ہے۔ وہ روزوں پر مداومت کر سکتی ہے، تہجد ادا کر سکتی ہے، قرآن مجید کے چند پارے بھی پڑھ سکتی ہے۔ لیکن مردانِ خدا کا کام کچھ

اور ہی ہے۔"

خلاصۂ کلام اینکہ تمام مشائخ حقہ میں کے نزدیک تصوف ایک مکمل ضابطۂ اخلاق کا نام ہے۔ چنانچہ کشف المحجوب میں شیخ ابو الحسنؒ کا یہ قول مرقوم ہے کہ:

"لیس التصوف رسوما و لا علوما ولکنہ اخلاق" یعنی تصوف نہ چند رسوم مذہبی ادا کرنے کا نام ہے اور نہ بعض علوم حاصل کرنے کا، بلکہ یہ تو سراسر اخلاص حسنہ کے مجموعے کا نام ہے۔

چونکہ اس موضوع پر آئندہ اوراق میں اکابر صوفیہ کے اقوال درج کیے جائیں گے اس لیے سردست اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

(ج) خدمت خلق:

اس موضوع پر سب سے پہلے شیخ سعدیؒ کا مشہور شعر درج کرتا ہوں:

طریقت بجز خدمت خلق نیست
بہ تسبیح وسجادہ و دلق نیست

خدمت خلق کی جس قدر صورتیں ممکن ہیں، صوفیائے کرامؒ نے ان سب پر عمل کر کے دکھا دیا ہے۔ ان کی زندگیاں خدمت خلق کے لیے وقف ہوگئی تھیں۔ انہوں نے لاکھوں انسانوں کو شیطان کی غلامی سے نکال کر، اللہ کی غلامی میں داخل کیا، یعنی ان کی زندگی کو بامقصد بنا دیا۔

واضح ہو کہ دراصل کار نبوت یہی ہے۔ انبیاءؑ نے ساری عمر یہی کیا اور ساری عمر یہی کہا کہ "اعبدوا اللہ واجتنبوا الطاغوت" یعنی اے اللہ کے بندو! اللہ کی اطاعت کرو اور شیطان سے اجتناب کرو۔

صوفیائے کرامؒ نے صحیح معنوں میں اتباع رسول اللہ (ﷺ) کا نمونہ پیش کیا اور اللہ کے بندوں کو شیطان کی غلامی سے نکال کر اللہ سے ملایا۔ تاریخ گواہ ہے کہ یہ کام نہ علماء سے ہو سکا، نہ متکلمین سے، نہ معتزلہ سے، نہ حکماء سے نہ فقہاء سے۔ یہ

کام اگر ہو سکا تو ان نفوس قدسی سے، جن کو صوفیائے اسلام کہا جاتا ہے اور جن کا نام آج بھی لاکھوں کروڑوں انسانوں کے دلوں میں عقیدت اور محبت کے جذبات پیدا کر دیتا ہے۔

صوفیائے کرامؒ کے ملفوظات کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو سکتی ہے کہ خدمت خلق کو ان بزرگوں نے اپنی زندگی کا اہم ترین فریضہ بنا لیا تھا۔ سیر الاولیاء میں مرقوم ہے کہ:

"سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاءؒ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے خواب میں ایک کتاب دی گئی، جس میں لکھا ہوا تھا کہ جہاں تک ہو سکے، دلوں کو راحت پہنچا، کیونکہ مومن کا دل، اسرار الٰہی کا محل ہے۔ نیز فرمایا کہ قیامت کے بازار میں کوئی اسباب اس قدر قیمتی نہ ہوگا، جس قدر دلوں کو راحت پہنچانا۔"

یہی وجہ ہے کہ صوفیائے کرامؒ بلا امتیاز مذہب وملت ہر شخص کی دلداری کیا کرتے تھے۔ بلکہ ہر وقت دوسروں کے غم میں گھلتے رہتے تھے، چنانچہ جب حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کے ایک عزیز حضرت سلطان المشائخؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو انہوں نے کہا کہ میں ایک دعوت میں گیا تھا، وہاں لوگ کہہ رہے تھے کہ شیخ نظام الدینؒ کو بڑا فراغ باطنی حاصل ہے، انہیں اس جہاں کا کوئی غم نہیں ہے۔ یہ سن کر حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا:

"جس قدر غم و اندوہ مجھے دامن گیر رہتا ہے، شاید کسی کو نہ ہو، کیونکہ بہت سے لوگ میرے پاس آتے ہیں اور اپنا درد و غم مجھ سے بیان کرتے ہیں۔ ان کے رنج و غم کا بوجھ میرے دل پر پڑتا ہے۔"

حضرت محبوب الٰہیؒ فرماتے ہیں کہ [illegible] ہے، جو دشمنوں کے ساتھ بھی بھلائی کرے۔ ایک دن فرمایا:

"اگر کوئی شخص تیری راہ میں کانٹا رکھے اور تو بھی اس کے جواب میں اس کی

راہ میں کانٹا رکھ دے، تو ساری دنیا کانٹوں سے معمور ہو جائے گی۔ عموماً لوگ ایسا ہی کرتے ہیں، لیکن درویشوں کا یہ دستور نہیں ہے۔ انہیں نیک اور بد دونوں کے ساتھ نیکی کرنی چاہیے۔"

پھر فرمایا: "برا کہنا بے شک برا ہے، مگر برا چاہنا اس سے بھی زیادہ برا ہے۔"

حضرت محبوب الٰہیؒ کی شفقت کا یہ عالم تھا کہ ایک دن گرمی کے موسم میں حاضرین کی تعداد اس قدر بڑھ گئی کہ سائے میں جگہ نہ رہی۔ لوگ دھوپ میں بیٹھنے لگے تو فرمایا: "آگے سرک آؤ۔ پاس پاس مل کر بیٹھو تاکہ وہ لوگ بھی سائے میں بیٹھ سکیں، جو دھوپ میں بیٹھے ہیں۔ بات یہ ہے کہ دھوپ میں وہ بیٹھے ہیں اور جلتا میں ہوں۔"

ایک دن حضرت محبوب الٰہیؒ کے خادم نے عرض کی، آپ اگر سحری کے وقت بھی کچھ نہیں کھائیں گے تو ضعف بہت بڑھ جائے گا۔ یہ سن کر آپؒ نے فرمایا "بہت سے درویش مسجدوں میں بھوکے پڑے ہوئے ہیں، اس صورت میں کھانا میرے حلق سے کس طرح نیچے اتر سکتا ہے؟"

صوفیائے کرام کے کارنامے:

آئندہ اوراق میں صوفیائے کرامؒ کے کارناموں کی تفصیل درج کی جائے گی، اس لیے اس جگہ اختصار سے کام لے کر، چند اشارات پر اکتفا کرتا ہوں:

(۱) اسلام کی جو پاکیزہ تعلیمات کتابوں میں درج ہیں اور مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں، صوفیہ نے اپنی خانقاہوں میں ان پر عمل کر کے دنیا کو دکھایا۔

(۲) صوفیہ نے ہر زمانے میں اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کو زندہ رکھا۔

(۳) صوفیہ سے بڑھ کر تبلیغ اور تعمیر سیرت کا فریضہ کسی جماعت نے انجام نہیں دیا۔

(۴) صوفیہ نے بادشاہوں کے سامنے علی الاعلان کلمۂ حق کہا۔

(۵) جب مسلمانوں میں عقلیت کا مذاق پیدا ہوا اور انہوں نے قرآن کو اپنی عقل کے تابع بنانا شروع کیا، تو صوفیوں نے محبت الٰہی کا درس دے کر، عقلیت کے مضر نتائج کا ازالہ کیا۔

(۶) جب فقہاء نے دین کے ظواہر پر زور دیا تو صوفیہ نے باطنی اصلاح اور قلبی طہارت کا درس دے کر قوم کو اعتدال کی راہ دکھائی۔

(۷) صوفیہ نے ہر دور میں غیر اسلامی عقائد، شرک اور بدعت کی تردید کی۔

(۸) سرمایہ داری کے مقابلے میں انفاق فی سبیل اللہ کی اہمیت واضح کی۔

(۹) بادشاہوں کو دینداری کی تلقین کی۔

(۱۰) جب معتزلہ، فقہاء اور متکلمین منطقی بحثوں میں الجھے ہوئے تھے اور امت کو فرقوں میں منقسم کر رہے تھے، اس وقت صوفیوں نے مسلمانوں کو توحید اور یک نگاہی کا درس دیا۔

(۱۱) جب فقہاء مسلمانوں کو آپس میں لڑا رہے تھے، اس نازک دور میں صوفیوں نے ان کو محبت اور ہمدردی کا درس دیا۔

(۱۲) فقہاء اور متکلمین نے مسلمانوں کو کافر بنایا، مگر صوفیائے کرامؒ نے اپنی پاکیزہ زندگی کے ذریعے کافروں کو مسلمان بنایا۔

(۱۳) فقہاء اور متکلمین اور معتزلہ نے مختلف مذہبی گروہ بنا کر مسلمانوں کے شیرازۂ ملی کو منتشر کر دیا، مگر صوفیہ نے مسلمانوں کو جامِ وحدت پلایا۔

(۱۴) علماء اور فقہاء بادشاہوں کا قرب حاصل کرتے رہے، مگر صوفیہ دربار شاہی سے الگ تھلگ رہ کر، ملوکیت کے مفاسد بیان کرتے رہے۔

(۱۵) جب علماء بادشاہوں کو خوش کرنے کے لیے تاویلات میں مشغول تھے، اس وقت صوفیہ بادشاہوں کو خوفِ خدا کا درس دیتے رہے۔

(۱۶) معتزلہ، متکلمین اور حکماء نے اپنا وقت ذات وصفات باری کی بحثوں

میں ضائع کیا۔ صوفیہ نے کہا کہ خدا کے باب میں بحث فضول ہے، خدا منطق کے ذریعہ سے نہیں مل سکتا۔ آئینۂ قلب کو صاف کرو تا کہ اس کا دیدار ہو سکے۔

(۱۷) علماء نے دینی کتابیں لکھیں۔ صوفیہ نے وہ آدمی تیار کیے، جنہوں نے ان کتابوں کے احکام پر عمل کر کے انقلاب برپا کر دیا۔

(۱۸) علماء (متکلمین، معتزلہ، حکماء) نے صرف دماغ کی آبیاری کی، صوفیہ نے دماغ کے ساتھ ساتھ دل کی تربیت اور اصلاح کا فریضہ بھی انجام دیا۔ اور یہ بات محتاج بیان نہیں ہے کہ اسلام میں اصلی چیز دل ہے نہ کہ دماغ۔ اگر دل فاسد ہوجائے تو دماغ کا فاسد ہوجانا یقینی ہے۔ چنانچہ سرکار دو عالم ﷺ فرماتے ہیں کہ:
"آگاہ ہوجاؤ انسان کے جسم میں ایک عضو ہے، اگر وہ فاسد ہوجائے تو سارا جسم (انسان) فاسد ہوجائے گا اور اگر وہ صالح ہوجائے، تو سارا جسم صالح ہوجائے گا اور وہ عضو قلب ہے۔"

(۱۹) علماء نے مسلمانوں میں گروہ بندی پیدا کی۔ صوفیہ نے انسانوں کو "الخلق عیال اللہ" کا درس دیا۔

(۲۰) علماء نے دلیلوں سے اسلام کی حقانیت کو واضح کیا۔ صوفیہ نے مشاہدۂ باطنی کے ذریعے سے اسلام کی صداقت واضح کی۔

لوگوں نے امام احمد ابن حنبلؒ سے پوچھا کہ بشر حافیؒ تو عالم دین نہیں ہیں، پھر آپ ان کے پاس کیوں جاتے ہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ میں کتاب اللہ سے آگاہ ہوں، مگر بشر حافیؒ، اللہ سے واقف ہیں، اس لیے ان کا مرتبہ میرے مرتبے سے بدرجہا زیادہ بڑھا ہوا ہے۔ (ماخوذ: "تاریخ تصوف")

یوسف سلیم چشتی

تصوف کی شرعی حیثیت

قرآن و حدیث کی روشنی میں

نفس مضمون کی اہمیت کا تقاضا تو یہ تھا کہ میں اس بحث کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ لکھتا، مگر بخوف طوالت اختصار کو مد نظر رکھا ہے۔

(۱) تصوف کی اصل بلکہ اصل الاصول، لقاء رب کی آرزو ہے۔ سالک یہ تمام مجاہدات، ریاضات، مراقبات، اسی لیے برداشت کرتا ہے کہ وہ اپنے محبوب کا دیدار کر سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ یہ یقین رکھتا ہے کہ مقصد حیات "دیدار یار" ہے۔ یہ اصل اس آیت سے ماخوذ ہے:

فمن کان یرجو لقاء ربہ فلیعمل عملا صالحا ولا یشرک بعبادۃ ربہ احدا (۱۸:۱۱۰)

پس جو شخص اپنے رب سے ملاقات کا آرزو مند ہوتا ہے، اسے لازم ہے کہ اعمال صالحہ بجا لائے اور اپنے رب کی اطاعت میں کسی کو شریک نہ کرے۔

(۲) تصوف کے عناصر ترکیبی تین ہیں: کامل توحید۔ کامل تقویٰ۔ کامل محبت اور یہ تینوں عناصر قرآن سے ماخوذ ہیں:

(الف) کامل توحید: سارا قرآن توحید کی تعلیم سے معمور ہے، بلکہ میری رائے میں قرآن کے نزول کی علت غائی ہی تعیین توحید ہے، کیوں کہ قبل بعثت نبوی ﷺ خالص اور کامل توحید، دنیا سے مٹ چکی تھی۔ تمام اقوام عالم، انسان پرستی، یعنی شرک میں مبتلا تھیں۔

تبرکاً صرف ایک آیت درج کرتا ہوں۔

"ھو الاول والآخر والظاھر والباطن وھو بکل شیء علیم۔"

(۳:۵۷)

بس وہی ہر شے کا اول ہے اور ہر شے کا آخر ہے اور ہر شے کا ظاہر ہے اور ہر شے کا باطن ہے (یعنی وہی وہ ہے) اور وہ ہر شے کی ماہیت سے آگاہ ہے۔

(ب) درس توحید کے بعد سارا قرآن ہدایت تقویٰ سے بھرا پڑا ہے، بلکہ یہ قرآن صرف متقی افراد ہی کے لئے ہدایت ہے۔ غیر متقی اس سے ہدایت یاب نہیں ہوسکتا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ متقی کو اللہ کی معیت نصیب ہوجاتی ہے۔ صرف ایک آیت لکھتا ہوں:

ان اللہ مع الذین اتقوا والذین ھم محسنون. (۱۶-۱۲۸)

بیشک اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے، جو متقی ہیں اور محسن (بھی) ہیں۔

(ج) تصوف کا دارومدار عشق یا محبت الٰہی پر ہے، یعنی محبت ہی حصول مقصود کا واحد ذریعہ ہے یا حریم ناز تک پہنچنے کے لیے بمنزلہ نردبان ہے۔

صرف دو آیتیں لکھتا ہوں:

والذین آمنوا اشد حباً للہ۔ (۲:۱۶۵)

اور جو لوگ مؤمن ہیں، وہ سب سے زیادہ محبت اللہ ہی سے کرتے ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل اس آیت میں فرمادی، تا کہ کوئی ابہام باقی نہ رہے۔

"قل ان کان آباؤکم وابناؤکم واخوانکم وازواجکم وعشیرتکم واموال اقترفتموھا وتجارۃ تخشون کسادھا ومسٰکن ترضونھا احب الیکم من اللہ ورسولہ وجھاد فی سبیلہ فتربصوا حتیٰ یاتی اللہ بامرہ واللہ لایھدی القوم الفٰسقین." (۹:۲۴)

(اے رسول ﷺ) مسلمانوں سے کہہ دیجئے، کہ اگر تمہیں اپنے باپ دادا اور بیٹے اور بھائی اور بیویاں اور رشتے دار اور وہ اموال جو تم نے (بڑی محنت سے) کمائے ہیں اور وہ تجارت، جس کے مندا پڑجانے سے تم بہت ڈرتے ہو اور وہ

مکانات، جنہیں تم بہت عزیز رکھتے ہو۔ اگر ان میں سے کوئی چیز بھی تمہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ پیاری یا زیادہ محبوب ہو تو پھر انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ صادر ہوجائے اور یاد رکھو کہ اللہ فاسقوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

تصوف کے عناصر ترکیبی میں ربط باہمی:

تصوف کے عناصر ترکیبی میں ربط باہمی کی تفصیل یہ ہے کہ:

(الف) محبت کرنا انسان کی فطرت میں داخل ہے، اس لئے تصوف جب انسان کو محبت کی تلقین کرتا ہے، تو گویا اس کے فطری تقاضے کی تکمیل کا سامان مہیا کرتا ہے۔

(ب) چونکہ انسان اپنی کوتاہ بینی یا نادانی کی وجہ سے، کسی نااہل ہستی کو بھی محبوب بنا سکتا ہے، اس لیے تصوف نے اسے آگاہ کیا کہ محبوب اسے بناؤ، جو (۱) حسین بھی ہو (۲) غیرفانی بھی ہو اور تمہاری محبت کا جواب بھی دے سکے اور ایسی ہستی صرف اللہ ہے۔

چونکہ کامل ترین ہستی صرف ایک ہی ہوسکتی ہے، اس لیے تصوف توحید کی تعلیم دیتا ہے، یعنی لاالٰہ الا اللہ۔

(ج) تقویٰ کا مطلب ہے یہ دیکھتے رہنا کہ ایسی کوئی بات سرزد نہ ہوجائے، جس سے محبوب حقیقی ناراض ہوجائے۔ لغوی اعتبار سے تقویٰ کا مفہوم محبوب کی نافرمانی سے بچنا ہے، کیونکہ نافرمانی سے محبوب ضرور ناراض ہوجائے گا۔

الغرض سالک کی زندگی، انہیں تین اجزا سے مرکب ہوتی ہے۔ وہ محبوب حقیقی سے جو واحد لاشریک ہے، محبت کرتا ہے اور ہر وقت یہ دیکھتا رہتا ہے، (اسی کو مراقبہ اور محاسبہ کہتے ہیں) کہ کوئی قول یا فعل محبوب کی مرضی کے خلاف سرزد نہ ہو۔

(۳) تصوف قرب الٰہی کی تلقین کرتا ہے یا صوفی، قرب الٰہی کا خواہاں ہوتا

ہے۔ اس کی یہ خواہش اس آیت پر مبنی ہے:

"واسجد واقترب." (۱۹:۹۶)

اے رسول! سجدے کیے جایئے اور قرب حق حاصل کیے جایئے۔

(۴) صوفی اللہ کی طرف راغب ہوتا ہے یا تصوف رغبت الی اللہ کا اظہار کرنا ہے۔ یہ تعلیم اس آیت پر مبنی ہے:

"فاذا فرغت فانصب والی ربک فارغب." (۹۴:۷،۸)

پس اے رسول! جب آپ فرض منصبی، یعنی تبلیغ اسلام سے فارغ ہوں تو عبادت میں محنت کیجئے اور اپنے رب کی طرف راغب رہیے۔

بس اسی لیے صوفی بھی اللہ ہی کو اپنا مرغوب بناتا ہے۔

(۵) تصوف کا ثمرہ معیت الٰہیہ ہے اور یہ بات بھی قرآن ہی سے ماخوذ ہے:

"وهو معكم اينما كنتم" (۵۷:۴)

اور وہ تمہارے ساتھ ہے، جہاں بھی تم ہو۔

یہ معیت عمومی ہے اور کافر اور مؤمن دونوں پر حاوی ہے۔

"ان الله مع الذين اتقوا والذين هم محسنون." (۱۶-۱۲۸)

بیشک اللہ ساتھ ہے، ان لوگوں کے جو متقی بھی ہیں اور محسن بھی ہیں۔

یہ محبت خصوصی ہے۔ کفار اس نعمت سے محروم ہیں اور اس محرومی کے ذمہ دار وہ خود ہیں۔

تصوف کا دستور العمل:

تصوف کا دستور العمل یا طریق، جسے اصطلاح میں تزکیہ نفس کہتے ہیں، قرآن ہی سے ماخوذ ہے اور تزکیہ نفس خود قرآن سے ثابت ہے:

(الف) "هو الذى بعث فى الاميين رسولاً منهم يتلوا عليهم ايٰته

ويزكيهم ويعلمهم الكتٰب والحكمة." (۶۲:۲)

اللہ ہی وہ ذات پاک ہے، جس نے امیوں میں ایک عظیم المرتبت رسول مبعوث فرمایا، جو انہیں اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کے نفوس کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔

(ب) تزکیۂ نفس کا دستور العمل سورہ مزمل کی ابتدائی آیات میں درج ہے۔ جن کے مطالعہ سے واضح ہو جائے گا کہ صوفیہ صحیح معنوں میں متبع سنت نبوی ہیں اور ان کی زندگی صحیح معنوں میں اسلامی زندگی ہے:

"يايها المزمل. قم الليل الا قليلا. نصفه او انقص منه قليلا. او زد عليه ورتل القرآن ترتيلا. انا سنلقى عليك قولاً ثقيلا. ان ناشئة اليل هى اشد وطأً واقوم قيلا. ان لك فى النهار سبحاً طويلا. واذكر اسم ربك وتبتل اليه تبتيلا. رب المشرق والمغرب لااله الا هو فاتخذه وكيلا. واصبر على ما يقولون واهجرهم هجراً جميلا. وذرنى والمكذبين اولى النعمت ومهلهم قليلا." (۷۳:۱ تا ۱۱)

ان کا ترجمہ یہ ہے: "اے کپڑا اوڑھنے والے! کھڑا رہا کر رات کو، مگر تھوڑی دیر کے لئے۔ آدھی رات یا اس سے بھی کم کر لیا کر یا کچھ بڑھا دیا کر اور قرآن کو خوب آہستہ آہستہ پڑھا کر۔ تحقیق ہم ڈالنے والے ہیں، تیرے اوپر ایک بھاری حکم کا بوجھ۔ تحقیق اٹھنا رات کا وہ بہت سخت (مؤثر) ہے، نفس کو کچلنے میں اور بہت سیدھا کرنے والا ہے بات کو۔ (یعنی اس وقت دعا بھی ٹھیک دل سے نکلتی ہے) تحقیق تیرے لیے دن میں (بسلسلہ تبلیغ) بڑا مشغلہ رہا کرے گا اور ذکر کر، اپنے پروردگار کے نام کا اور اسی کا ہو رہ سب سے ٹوٹ کر، وہ پروردگار ہے مشرق اور مغرب کا۔ نہیں ہے معبود، اس کے سوا۔ پس بنالے اسی کو اپنا کارساز اور صبر کر اوپر ان باتوں کے، جو (کافر) تیری نسبت کہتے ہیں اور قطع تعلق کر لے، ان سے وضع داری کے

ساتھ اور چھوڑ دے، مجھ کو اور ان جھٹلانے والوں کو، جو خوش حال اور دولت مند ہیں، (میں ان سے بھگت لوں گا) اور انہیں تھوڑی سی مہلت دے۔

میں نے قصداً لفظی ترجمہ کیا ہے۔ اب ناظرین اس ترجمے کو غور سے پڑھیں، انہیں خود معلوم ہوجائے گا کہ صوفیائے کرام نے سلوک کے تمام بنیادی اصول انہی آیات سے مستنبط کیے ہیں۔ جن کی تفصیل ذیل میں درج کرتا ہوں:

۱- شیخ طریقت سالک کو حکم دیتا ہے کہ آخر شب میں اٹھو۔ یہ حکم اس آیت سے ماخوذ ہے۔ "قم الیل" کھڑا رہا کر رات کو۔

۲- اٹھ کر نماز تہجد پڑھو۔ یہ حکم اس آیت سے ماخوذ ہے، جو سورہ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۷۹ میں مندرج ہے اور یہ حکم سورہ مزمل کی آیت نمبر ۳ کی شرح ہے۔ 'ومن اللیل فتھجد بہ نافلت لک' اور رات کے ایک حصے میں نماز تہجد پڑھا کر (اور نمازیں تو فرض ہیں لیکن یہ) تمہارے لیے نفلی نماز ہے۔ واضح ہو کہ یہ نماز فرض نہیں ہے، مگر جو شخص قرب ایزدی کا طالب ہو، اس کے لیے اشد ضروری ہے، کیونکہ حضور کریم علیہ السلام فرماتے ہیں کہ بندہ نوافل کے ذریعے سے قرب خداوندی حاصل کرسکتا ہے۔

۳- نماز تہجد میں ترتیل کے ساتھ قرآن پڑھو۔ یہ حکم اس آیت سے ماخوذ ہے۔ 'ورتل القرآن ترتیلا' اور نہایت آہستہ آہستہ یعنی واضح طور پر قرآن پڑھ۔ اس آیت میں "رتل" کے بعد "ترتیل" کا لفظ تاکید کے لیے لایا گیا ہے، یعنی بہت رک رک کر قرآن پڑھو، تاکہ معانی میں تدبر حاصل کرسکو، جس کا ثمرہ یہ ملے گا کہ قرآن کے معانی ذہن نشین ہوجائیں گے اور اس کی بدولت باطن میں وہ انقلاب پیدا ہوجائے گا، جو مقصود تلاوت ہے۔ اس کا ثبوت صحابہ کرام رضہ کی زندگیوں سے بخوبی مل سکتا ہے۔

ترتیل کے لفظی معنی ہیں، الفاظ کا منہ سے درستی کے ساتھ بسہولت ادا کرنا۔ آہستہ آہستہ واضح اور صاف طور پر پڑھنا، لیکن اس کے وہ معنی جو حضور انور علیہ السلام کی مراد ہیں، کچھ اور ہیں، جو ذیل کی حدیث سے واضح ہوسکتے ہیں:

"وقد روی الحسن ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم مر برجل یقرا آیت ویبکی، فقال: الم تسمعوا الی قول اللہ تعالیٰ "ورتل القرآن ترتیلا" ھذا الترتیل"

حضرت حسنؓ راوی ہیں کہ ایک دن حضور انور علیہ السلام ایک شخص کے پاس سے ہو کر گزرے، جو قرآن کی ایک آیت پڑھا رہا تھا اور رو رہا تھا۔ یہ دیکھ کر آپ (علیہ السلام) نے فرمایا کیا تم نے اللہ تعالیٰ کا یہ قول نہیں سنا کہ 'ورتل القرآن ترتیلا'، یہ ہے ترتیل۔

اس حدیث سے ترتیل کا حقیقی مفہوم واضح ہوگیا، یعنی ترتیل کا دراصل مطلب یہ ہے کہ قاری اس طرح رک رک کر قرآن پڑھے کہ تدبر یعنی معانی میں غور و فکر کرسکے اور جب وہ ایسا کرے گا، تو معانی ذہن نشین ہو کر اس میں رقت کی کیفیت پیدا کردیں گے۔

۴- ذکر و فکر، مراقبہ، مجاہدہ، اوراد، اشغال اور جملہ لوازم سلوک سے مقصود صرف یہی ہے کہ نفس امارہ مغلوب ہوجائے۔ یہ مقصود اس آیت سے ثابت ہے:

ان ناشئۃ الیل ھی اشد وطاً واقوم قیلاً۔

بیشک اٹھنا رات کا بڑا مؤثر ہے، نفس کو کچلنے میں اور اس وقت ذکر الٰہی دل سے بطرز احسن نکلتا ہے۔

۵- شیخ طریقت سالک کو ذکر اسم ذات کی تلقین کرتا ہے۔ یہ تلقین اس حکم (آیت) سے ماخوذ ہے:

واذکر اسم ربک (اور اپنے رب کے نام کو یاد کر)۔

۶- تصوف میں تبتل کی تلقین کی جاتی ہے اور یہ تلقین اس آیت سے ماخوذ ہے۔

وتبتل الیہ تبتیلا ۔ یعنی پورے طور سے تمام علائق مادی (دنیوی) سے قطع تعلق کر۔ یہاں بھی امر 'تبتل' کے بعد مصدر (تبتیل) لایا گیا ہے، جس سے تاکید مراد ہے، یعنی کامل طور سے قطع تعلق کر۔ تبتل کا مادہ بتل ہے اور بتل کہتے ہیں، قینچی سے کاٹ دینے کو۔ اس لفظ کی مزید تشریح یہ ہے:

التبتل وھو عندالعرب التفرد ھوالقطع ومعنی الایۃ انفرد للہ. والتبتل المامور بہ الانقطاع الی اللہ باخلاص العبادۃ.... والتبتل المنھی عنہ ھو سلوک مسلک النصاریٰ فی ترک النکاح.

تبتل، عربی زبان میں تفرد یا قطع کو کہتے ہیں اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ اللہ کے لیے تفرد (مادیات سے قطع تعلق) اختیار کر۔ پس جو تبتل شریعت میں مقصود ہے یا جس کا حکم دیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ لذات دنوی سے قطع نظر کی جائے اور اللہ کی عبادت خلوص دل کے ساتھ کی جائے اور جس تبتل سے شریعت نے منع کیا ہے وہ نصاریٰ کا تبتل یعنی نکاح (عائلی زندگی) کا ترک کر دینا۔

خلاصہ کلام اینکہ، اسلامی تصوف میں تبتل سے رہبانیت مراد نہیں ہے، بلکہ اس کا مطلب ہے، لذات دنوی سے قطع تعلق کرنا یا دنیا کو مقصود نہ بنانا، بلکہ دنیا میں رہنا، مگر اس سے دل نہ لگانا۔

۷- سالک کو تلقین کی جاتی ہے کہ اللہ کو اپنا وکیل (کارساز) بناؤ۔ صرف اسی پر بھروسہ کرو۔ اپنی دولت، مال اولاد، جائداد اور مادی تعلقات پر بھروسہ مت کرو۔ یہ تلقین اس آیت سے ماخوذ ہے۔ فاتخذہ وکیلا۔

۸- سالک کو تلقین کی جاتی ہے کہ اغیار کے اعتراضات پر صبر کرو، یعنی اگر کوئی شخص تم پر طعن وطنز کرے، اعتراض کرے تمہیں برا کہے یا تمہاری برائی کرے، تو تم اس کی جفاؤں کو خاموشی سے برداشت کرو، کیونکہ اگر تم اس سے الجھے تو تمہارا مقصد فوت ہو جائے گا۔ جب تم نے اللہ کو اپنا وکیل بنا لیا ہے تو وہ تمہاری طرف

سے مداہنت کے لیے کافی ہے۔ تم اپنا کام کیے جاؤ۔ یہ حکم اس آیت سے ماخوذ ہے۔ واصبر علیٰ ما یقولون۔

۹- سالک کو حکم دیا جاتا ہے کہ مخالفین سے کنارہ کشی اختیار کرو، مگر لڑ جھگڑ کر نہیں، بدکلامی کے بعد نہیں، بلکہ خوب صورتی کے ساتھ۔ یہ حکم اس آیت سے ماخوذ ہے:

واھجرھم ھجراً جمیلا۔ ان سے عمدگی کے ساتھ کنارہ کش ہو جا

۱۰- سالک کو تاکید کی جاتی ہے کہ جو لوگ تمہاری تکذیب یا تردید کردیں، تم خود ان سے بحث مباحثہ مت کرو، کیونکہ تمہاری توجہ مقصود سے ہٹ جائے گی۔ لوگوں سے الجھنا، مناظرہ کرنا، مقابلہ کرنا، یہ سب باتیں تمہارے حق میں مضر ہیں۔ یہ حکم اس آیت سے ماخوذ ہے۔ وذرنی والمکذبین۔ (تلک عشرۃ کاملۃ)

واضح ہو کہ یہ سورت ترتیب نزول کے اعتبار سے دوسری یا تیسری ہے اور اس بات پر تمام مفسرین کا اتفاق ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے سرکار ابد قرار کو یہ حکم دیا کہ سب سے پہلے مسلمانوں کے نفوس کا تزکیہ کرو۔ کیونکہ تزکیہ نفس کے بغیر نفس مغلوب نہیں ہو سکتا ہے، نہ انفاق فی سبیل اللہ کر سکتا ہے۔ اور اسلام انہی دو چیزوں کا نام ہے:

(الف) اللہ کہتا ہے کہ اپنا مال میری راہ میں خرچ کرو۔ لیکن نفس انسان سے کہتا ہے کہ اگر تم نے اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا، تو تم مفلس ہو جاؤ گے اور تمہارے متعلقین (بیوی بچے) فاقے کریں گے۔ لہٰذا جب تک نفس مغلوب نہ ہو، اس وقت تک کوئی مسلمان اپنا مال اللہ کی راہ میں صرف نہیں کر سکتا۔

(ب) اللہ کہتا ہے کہ میری راہ میں جہاد (قتال) کرو۔ نفس انسانوں کو ورغلاتا ہے کہ اگر تو میدان جنگ میں گیا تو گمان غالب یہی ہے کہ مارا جائے گا، اس صورت میں تیری بیوی اور تیرے بچے برباد ہو جائیں گے۔ پس جب تک نفس

وتبتل الیہ تبتیلا ۔ یعنی پورے طور سے تمام علائق مادی (دنیوی) سے قطع تعلق کر۔ یہاں بھی امر 'تبتل' کے بعد مصدر (تبتیل) لایا گیا ہے، جس سے تاکید مراد ہے، یعنی کامل طور سے قطع تعلق کر۔ تبتل کا مادہ بتل ہے اور بتل کہتے ہیں، قینچی سے کاٹ دینے کو۔ اس لفظ کی مزید تشریح یہ ہے:

التبتل وهو عند العرب التفرد هو القطع ومعنى الاية انفرد لله. فالتبتل المامور به الانقطاع الى الله باخلاص العبادة.... والتبتل المنهى عنه هو سلوك مسلك النصارى فى ترك النكاح.

تبتل، عربی زبان میں تفرد یا قطع کو کہتے ہیں اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ اللہ کے لیے تفرد (مادیات سے قطع تعلق) اختیار کر۔ پس جو تبتل شریعت میں مقصود ہے یا جس کا حکم دیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ لذات دنوی سے قطع نظر کی جائے اور اللہ کی عبادت خلوص دل کے ساتھ کی جائے اور جس تبتل سے شریعت نے منع کیا ہے وہ نصاریٰ کا تبتل یعنی نکاح (عائلی زندگی) کا ترک کر دینا۔

خلاصہ کلام اینکہ، اسلامی تصوف میں تبتل سے رہبانیت مراد نہیں ہے، بلکہ اس کا مطلب ہے، لذات دنوی سے قطع تعلق کرنا یا دنیا کو مقصود نہ بنانا، بلکہ دنیا میں رہنا، مگر اس سے دل نہ لگانا۔

۷- سالک کو تلقین کی جاتی ہے کہ اللہ کو اپنا وکیل (کارساز) بناؤ۔ صرف اسی پر بھروسہ کرو۔ اپنی دولت، مال اولاد، جائداد اور مادی تعلقات پر بھروسہ مت کرو۔ یہ تلقین اس آیت سے ماخوذ ہے۔ فاتخذه وكيلا۔

۸- سالک کو تلقین کی جاتی ہے کہ اغیار کے اعتراضات پر صبر کرو، یعنی اگر کوئی شخص تم پر طعن وطنز کرے، اعتراض کرے، تمہیں برا کہے یا تمہاری برائی کرے، تو تم اس کی جفاؤں کو خاموشی سے برداشت کرو، کیونکہ اگر تم اس سے الجھے تو تمہارا مقصد فوت ہوجائے گا۔ جب تم نے اللہ کو اپنا وکیل بنا لیا ہے تو وہ تمہاری طرف

سے مدافعت کے لیے کافی ہے۔ تم اپنا کام کیے جاؤ۔ یہ حکم اس آیت سے ماخوذ ہے۔ واصبر علیٰ ما يقولون

۹- سالک کو حکم دیا جاتا ہے کہ مخالفین سے کنارہ کشی اختیار کرو، مگر لڑ جھگڑ کر نہیں، بدکلامی کے بعد نہیں، بلکہ خوب صورتی کے ساتھ۔ یہ حکم اس آیت سے ماخوذ ہے:

واهجرهم هجراً جميلا۔ ان سے عمدگی کے ساتھ کنارہ کش ہوجا

۱۰- سالک کو تاکید کی جاتی ہے کہ جو لوگ تمہاری تکذیب یا تردید کردیں، تم خود ان سے بحث مباحثہ مت کرو، کیونکہ تمہاری توجہ مقصود سے ہٹ جائے گی۔ لوگوں سے الجھنا، مناظرہ کرنا، مقابلہ کرنا، یہ سب باتیں تمہارے حق میں مضر ہیں۔ یہ حکم اس آیت سے ماخوذ ہے۔ وذرنی والمکذبین. (تلک عشرة کاملة)

واضح ہو کہ یہ سورت ترتیب نزول کے اعتبار سے دوسری یا تیسری ہے اور اس بات پر تمام مفسرین کا اتفاق ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے سرکار ابد قرار ﷺ کو یہ حکم دیا کہ سب سے پہلے مسلمانوں کے نفوس کا تزکیہ کرو۔ کیونکہ تزکیہ نفس کے بغیر نفس مغلوب نہیں ہوسکتا ہے، نہ انفاق فی سبیل اللہ کرسکتا ہے۔ اور اسلام انہی دو چیزوں کا نام ہے:

(الف) اللہ کہتا ہے کہ اپنا مال میری راہ میں خرچ کرو۔ لیکن نفس انسان سے کہتا ہے کہ اگر تم نے اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کردیا، تو تم مفلس ہوجاؤ گے اور تمہارے متعلقین (بیوی بچے) فاقے کریں گے۔ لہٰذا جب تک نفس مغلوب نہ ہو، اس وقت تک کوئی مسلمان اپنا مال اللہ کی راہ میں صرف نہیں کرسکتا۔

(ب) اللہ کہتا ہے کہ میری راہ میں جہاد (قتال) کرو۔ نفس انسانوں کو ورغلاتا ہے کہ اگر تو میدان جنگ میں گیا تو گمان غالب یہی ہے کہ مارا جائے گا، اس صورت میں تیری بیوی اور تیرے بچے برباد ہوجائیں گے۔ پس جب تک نفس

مغلوب نہ ہو، کوئی مسلمان سربکف ہوکر میدان میں نہیں آسکتا۔

تصوف کیا ہے؟ تزکیہ نفس کا دوسرا نام ہے اور سرکار دو عالم ﷺ کی بعثت کے مقاصد چہارگانہ میں سے دوسرا مقصد ہے۔

ھو الذی بعث فی الامیین رسولاً منھم یتلوا علیھم آیتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتٰب والحکمت وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین. (۶۲:۲)

وہ اللہ ہی تو ہے، جس نے امیوں میں ایک عظیم الشان رسول مبعوث کیا جو:

(۱) انہیں اللہ کی آیات پڑھ کر سناتا ہے (۲) اور ان کے نفوس کا تزکیہ کرتا ہے (۳) اور انہیں کتاب (۴) اور حکمت سکھاتا ہے اور اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں مبتلا تھے۔

ضابطۂ تصوف:

تزکیۂ نفس کے علاوہ اسلامی تصوف میں، جن جن باتوں کی تلقین کی جاتی ہے یا تعلیم دی جاتی ہے، وہ بھی سب کی سب قرآن سے ماخوذ ہیں یا حضور انور ﷺ کی حیات طیبہ سے اخذ کی گئی ہیں مثلاً:

(۱) بیعت کا سلسلہ: یہ طریق قرآن اور سنت دونوں سے ثابت ہے:

ان الذین یبایعونک انما یبایعون اللہ. (۴۸:۱۰)

بلاشبہ جو لوگ آپ ﷺ کے دست مبارک پر بیعت کرتے ہیں، وہ دراصل اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔ (پیمانِ وفا باندھتے ہیں)

'لقد رضی اللہ عن المومنین اذ یبایعونک تحت الشجرۃ' (۴۸:۱۸)

بیشک اللہ راضی ہوگیا، ان مومنوں سے جس وقت وہ بیعت کرتے تھے آپ ﷺ سے اس درخت کے نیچے۔

(۲) صحبت مرشد: اگر تزکیہ نفس محض کتابوں سے ہوسکتا، تو اللہ تعالیٰ بعث

انبیاء کا سلسلہ جاری نہ فرماتا۔ اپنی کتاب کسی شخص کی معرفت دنیا والوں کے پاس بھیج دیا کرتا۔ پس جس طرح صحابہ کرامؓ نے رسول خدا سرکار دو عالم ﷺ کی صحبت میں رہ کر، اپنے نفوس کا تزکیہ کیا، اسی طرح آئندہ نسلوں کے لیے ضروری ہے کہ ہر زمانے میں ایسے خاصان خدا پیدا ہوتے رہیں، جو فنا فی الرسول ہوکر، تزکیہ نفوس کا مقدس فریضہ انجام دے سکیں۔

وجہ یہ ہے کہ تزکیۂ نفس کا علم نہ کتابوں میں مذکور ہے اور نہ کتابوں کو پڑھ کر کوئی شخص تزکیہ کرسکتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ اگرچہ فن طبابت اور فن جراحت کا علم کتابوں میں مذکور ہے، مگر آج تک (جالینوس کے زمانے سے لیکر اب تک) کوئی حکیم یا طبیب یا ڈاکٹر یا سرجن ایسا نہیں گذرا، جس نے میڈیکل کالج میں باقاعدہ تعلیم نہ پائی ہو اور اطباء اور جراحوں کی صحبت میں بیٹھ کر، اس فن کی عملی تربیت حاصل نہ کی ہو۔

پس اگر امراض جسمانی کے ازالے کے لیے کتابی علم کے علاوہ میڈیکل کالج میں پڑھنا اور سرجنوں کی نگرانی میں آپریشن کرنا، مہارت وحذاقت کے لیے شرط لازمی ہے تو امراض روحانی کے ازالے کے لیے روحانی کالج (خانقاہ) میں تربیت حاصل کرنا اور شیخ کامل کی نگرانی (نگاہ) میں رہ کر سلوک کی منزلیں طے کرنا، (مہارت حاصل کرنا) کیوں لازمی نہ ہو۔

ہر شخص کا روز کا مشاہدہ ہے کہ دنیا کا کوئی فن (غواصی جراحی، نجاری، طباخی، خیاطی، حلابی، خطاطی) صاحب فن کی صحبت اٹھائے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا۔ تزکیہ نفس بھی ایک فن ہے اور بہت مشکل فن ہے، تو یہ فن کسی ماہر فن کی صحبت کے بغیر کس طرح حاصل ہوسکتا ہے؟ چراغ تو چراغ ہی سے جل سکتا ہے۔

جبھی تو علامہ اقبال مرحوم نے اس زمانے کے مغرب زدہ اور فلسفہ زدہ مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا ہے:

کیمیا پیدا کن ار مشت گلے
بوسہ زن بر آستان کاملے

یعنی اے مسلمانو! تو کیا ہے؟ ایک مشت گل ہی تو ہے۔ اگر تو مٹی ہی رہا، تو ایک دن مٹی میں مل کر فنا ہوجائے گا، اس لیے میں تجھے مشورہ دیتا ہوں کہ تو اس مشت گل (جسم یا شخصیت) کو کیمیا میں تبدیل کرلے اور اس کی واحد صورت یہ ہے کہ کسی کامل کے آستانے کو چوم، یعنی شیخ کامل کی صحبت اختیار کر۔

حجت الاسلام امام غزالیؒ بھی یہی فرماتے ہیں کہ دلوں کو چمکانے اور صیقل کرنے کا یہ علم کتابوں میں مدون نہیں ہے۔

(۳) خلوت: شیخ طریقت سالک کو کچھ عرصے کے لیے خلوت اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے اور صوفیائے کرامؒ کے سوانح حیات کے مطالعے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہر صوفی نے کچھ عرصے کے لیے خلوت اختیار کی ہے۔ اس کی ضرورت اور اس کی اہمیت کا ثبوت خود سرکار ابد قرار ﷺ کی حیات مبارکہ سے مل سکتا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ قبل نبوت حضور کریم ﷺ نے تین سال تک غار حرا میں خلوت اختیار فرمائی تھی۔ خلوت کی اہمیت پر میرے مرشد اولین، اکبر الہ آبادی مرحوم کا یہ ایک شعر کافی ہے:

خدا کے کام دیکھو! بعد کیا ہے اور کیا پہلے
نظر آتا ہے مجھ کو بدر سے غار حرا پہلے

اس سلسلے میں ان کے ایک عقیدت مند کا شعر بھی قابل غور ہے:

صاحب تحقیق را جلوت عزیز
صاحب تخلیق را خلوت عزیز

(۴) اعتکاف: شیخ طریقت بعض اوقات مرید کو اعتکاف کا حکم دیتا ہے اور یہ حکم بھی سنت نبوی سے ماخوذ ہے۔ ہر شخص جس نے سیرۃ النبی کا مطالعہ کیا ہے، اس

بات سے واقف ہے کہ حضور انور ﷺ ہر سال، ماہ رمضان کے آخری عشرے میں مسجد نبوی میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ رابطۂ قلبی پیدا کرنے کے لیے اعتکاف فی المسجد، اکسیر کا خاصہ رکھتا ہے، جسے شک ہو تجربہ کرکے دیکھ لے۔ سلوک تو سراسر عملی پروگرام ہے۔

(۵) محبت یا عشق: تصوف کی بنیاد ہی عشق الٰہی پر رکھی گئی ہے۔ جس طرح دریائے نیل کے بغیر ملک مصر کا تصور نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح عشق کے بغیر اقلیم کا تصور نہیں ہوسکتا۔ تصوف کا تار بھی عشق ہے اور پود بھی عشق ہے۔ یہ بنیاد بھی قرآن وحدیث سے ماخوذ ہے۔ صرف ایک آیت لکھتا ہوں:

"والذین آمنوا اشد حبا للہ" (۲:۱۶۵)

جو لوگ مومن ہیں، وہ اللہ کی محبت میں اشد ہیں۔

(۶) مراقبہ اور محاسبہ: شیخ طریقت مرید کو مراقبہ اور محاسبہ کا حکم دیتا ہے اور یہ حکم اس آیت سے ماخوذ ہے۔

"ولتنظر نفس ما قدمت لغد" (۵۹:۱۸)

اس لازم ہے کہ ہر شخص یہ دیکھا (غور کرتا) رہے کہ اس نے آئندہ کل (قیامت) کے لیے کیا توشہ آگے بھیجا ہے، (یعنی کون کون سے اعمال صالحہ اس کے نامۂ اعمال میں مندرج ہیں)۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو محاسبہ کرنے کا حکم دیا ہے اور ہر شخص جانتا ہے کہ محاسبہ، مراقبے پر موقوف ہے، جب تک مراقبہ نہ کیا جائے، محاسبہ ناممکن ہے۔

(۷) مجاہدہ: تصوف میں مجاہدہ شرط لازمی ہے۔ کوئی سالک مجاہدے کے بغیر سلوک طے نہیں کرسکتا اور یہ شرط اس آیت سے ثابت ہے:

"والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا" (۲۹:۶۹)

اور جو لوگ ہم سے ملنے یا ہم تک پہنچنے کے لیے کوشش (مجاہدہ) کرتے ہیں، ہم یقیناً انہیں اپنی طرف آنے والی راہیں دکھا دیتے ہیں۔

سچ کہا ہے عارف شیرازی رحہ نے.

ناز پرورد تنعم نبرد راہ بدوست
عاشقی شیوہ رندان بلا کش باشد

(۸) ذکر و فکر: شیخ طریقت، مرید کو ذکر و فکر کا حکم دیتا ہے اور یہ تلقین ذکر و فکر جس کی اہمیت محتاج بیان نہیں ہے۔ قرآن حکیم کی اس آیت سے ماخوذ ہے:

"ان فی خلق السموٰات والارض واختلاف الیل والنھار لایٰت لاولی الالباب. الذین یذکرون اللہ قیماً وقعودا وعلیٰ جنوبھم ویتفکرون فی خلق السموٰات والارض ربنا ما خلقت ھذا باطلا." (۳:۱۹۰-۱۹۱)

بیشک آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے اختلاف میں نشانیاں ہیں، عقل والوں کے لیے (یہ وہ ہیں) جو یاد کرتے ہیں، اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے اور فکر کرتے ہیں، آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں (اور غور و فکر کے بعد پکار اٹھتے ہیں کہ) اے ہمارے رب! تو نے یہ کائنات بے فائدہ پیدا نہیں کی ہے۔

سالک کو یہ تلقین کی جاتی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے، ذکر کرتے رہو۔ یہ تلقین اس آیت سے ماخوذ ہے:

"واذکروا اللہ کثیراً لعلکم تفلحون." (۸:۴۵)

اور یاد کرو اللہ کو بہت، تاکہ تم فلاح پاؤ.

نکتہ:

مقصد حیات، فلاح دارین ہے اور حصول فلاح کی صورت ذکر کثیر ہے، اس لیے صوفی ہر وقت ذکر میں مشغول رہتا ہے۔

ذکر کی اہمیت آئندہ واضح کی جائے گی، اس جگہ صرف اتنا بیان کرنا کافی ہے، کہ اللہ تعالیٰ سرکار دو عالم ﷺ کو حکم دیتا ہے کہ.

"ولا تطع من اغفلنا قلبہ عن ذکرنا." (۱۸:۲۸)

اے رسول! مت کہا مان اس شخص کا، جسے ہم نے اپنے ذکر سے غافل کر دیا ہے۔

جب اللہ نے حضرت موسیٰ ع اور حضرت ہارون ع کو فرعون کے پاس بھیجا تو بوقت رخصت انہیں تاکید کی۔

"اذھب انت واخوک بایتی ولا تنیا فی ذکری." (۲۰:۴۲)

جا، تو اور تیرا بھائی (فرعون کے پاس) میرے نشانیاں لیکر اور (دیکھنا) میری یاد میں سستی مت کرنا۔

یہی وجہ ہے کہ مرشد رومیؒ نے متعدد مقامات میں ذکر و فکر کی اہمیت اور فضیلت کو واضح کیا ہے:

این قدر گفتیم باقی فکر کن
فکر گر جامد بود رو ذکر کن
ذکر آرد فکر را در اہتزاز
ذکر را خورشید این افسردہ ساز

اقبالؒ نے بھی ذکر کی فضیلت واضح کی ہے:

فقر قرآن اختلاط ذکر و فکر
فکر را کامل ندیدم جز بہ ذکر

اغیار کی شہادت:

گزشتہ صفحات میں، میں نے اپنا دعویٰ ثابت کر دیا ہے، کہ اسلامی تصوف قرآن سے ماخوذ ہے۔ اب میں اس دعوے پر اغیار کی شہادت پیش کرتا ہوں۔

(۱) ڈاکٹر ڈونالڈسن اپنی کتاب ''مسلمانوں کا فلسفہ'' میں صفحہ ۱۹۴ پر لکھتا ہے:
''بقول ابن خلدون، صوفیوں نے جو طریقہ اختیار کیا، وہ آغاز اسلام سے مسلمانوں میں متداول تھا اور اکابر صحابہ اسے سچائی اور ہدایت کا طریقہ یقین کرتے تھے۔ یہ طریقہ عبادت، اور تبتل پر مبنی تھا اور جب دوسری صدی ہجری میں مسلمانوں کے دلوں میں دنیا کی محبت جڑ پکڑنے لگی، تو جن لوگوں نے زہد و تقویٰ کو اپنا شعار بنایا، وہ صوفیوں کے لقب سے یاد کیے جانے لگے۔''

(۲) پروفیسر گیوم اپنی کتاب ''اسلام'' میں صفحہ ۱۴۳، ۱۴۴ پر لکھتا ہے: ''قرآنی تعلیمات میں دنیا سے بے تعلقی اور تصوف کا رنگ بھی پایا جاتا ہے۔ مسلمان صوفیوں نے ان دو آیتوں سے بہت تقویت حاصل کی ہے:

(الف) ''نحن اقرب الیہ من حبل الورید.'' (۵۰:۱۶)
ہم انسان سے اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں
(ب) ''فاینما تولوا فثم وجہ اللہ'' (۲:۱۱۵)
پس تم جس طرف بھی منہ کرو گے، وہیں اللہ کا منہ ہے۔
یعنی تم جدھر دیکھو گے، اللہ کو وہیں موجود پاؤ گے۔ جو بات یقینی ہے، وہ یہ ہے کہ اسلام نے بذات خود صوفیوں کی طرز حیات کے لیے سامان مہیا کیا ہے۔

(۳) پروفیسر گب اپنی کتاب ''محمڈن ازم'' میں ص ۱۲۸ پر لکھتا ہے: ''پروفیسر میسی نیون نے اسلامی تصوف کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد، یہ رائے ظاہر کی ہے کہ مسلمانوں میں تصوف کی تحریک اس زہد و اتقاء کا نتیجہ ہے، جو قرآن سے ماخوذ ہے اور پیغمبر اسلام کی سنت سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

(۴) ڈاکٹر تارا چند اپنی تصنیف ''ہندی ثقافت پر اسلام کا اثر'' میں ص ۶۳ پر لکھتے ہیں: ''تصوف کا اصلی ماخذ قرآن اور محمد ﷺ کی زندگی ہے۔''

(۵) ڈاکٹر نکلسن نے اپنی تصنیف ''عربوں کی ادبی تاریخ'' ص ۲۲۹ پر ابن خلدون کی رائے سے اتفاق کیا ہے، جسے ہم ڈونالڈسن کی شہادت کے سلسلے میں اوپر درج کر آئے ہیں۔

(۶) پروفیسر ہٹی اپنی تالیف، تاریخ اقوام عرب ص ۴۳۳ پر لکھتا ہے: ''تصوف کا ماخذ قرآن اور حدیث ہے۔ قرآن میں ایسے مضامین کی جو مثلاً ۲:۹۶ یا ۹:۱۱۳ یا ۳۳:۴۷ میں وارد ہیں، کوئی کمی نہیں ہے۔ علاوہ بریں خدا کے ساتھ خود پیغمبر اسلام (ﷺ) کے ذاتی تعلق میں صوفیانہ رنگ پایا جاتا ہے، یعنی آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی ہر جگہ اور ہر وقت موجودگی کا براہ راست ذاتی شعور حاصل تھا۔ آپ ﷺ ہر وقت یہ محسوس کرتے تھے کہ میں اللہ کی حضوری میں ہوں۔ صوفیوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ہم آنحضرت ﷺ کی اس روحانی تعلیم کے سچے ترجمان ہیں، جو احادیث میں محفوظ ہے۔''

(۷) پروفیسر براؤن اپنی تالیف ''ایران کی ادبی تاریخ'' جلد اول میں ص ۴۱۸ پر لکھتا ہے: ''احادیث سے قطع نظر کر کے خود قرآن میں چند آیات ایسی موجود ہیں جن کی تفسیر صوفیانہ انداز میں ممکن ہے۔ مثلاً:

''وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمی'' (۸:۱۷)
اور اے رسول (ﷺ) جب آپ (ﷺ) نے (مٹھی بھر کنکریاں) پھینکی تھیں، تو آپ (ﷺ) نے نہیں پھینکی تھیں، بلکہ اللہ نے پھینکی تھیں۔

بظاہر تو اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے دشمنوں کے مقابلے میں مسلمانوں کی ہمت بندھائی، لیکن اس سے یہ مفہوم بھی مستنبط ہوسکتا ہے کہ دراصل، اللہ ہی فاعل مطلق ہے اور انسان کی حالت ایسی ہے، جیسے کاتب کی انگلیوں میں قلم ہوتا ہے، جس طرف چاہے موڑے۔''

(۸) ڈاکٹر ہنٹ اپنی تالیف (Pantheism) مطبوعہ لندن سنہ ۱۸۹۳ع ص ۲۰۸ پر لکھتا ہے: ''پروفیسر پارم'' نے لکھا ہے کہ تصوف در اصل اسلام کی باطنی تعلیم کا نام ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے مبادی قرآن سے اخذ کیے جاسکتے ہیں، لیکن

قرآن عقیدہ حلول کی مطلق تائید نہیں کرتا۔

(۹) پروفیسر میکڈانلڈ اپنی تصنیف "شئون اسلام" میں ص ۱۸۴ پر لکھتا ہے:
"اسلام کی دوسری تعلیمات کی طرح تصوف کے مبادی بھی پیغمبر اسلام کے ذہن میں موجود تھے۔"

(۱۰) پروفیسر آربری اپنی تصنیف "صوفزم (تصوف)" میں ص ۱۲، ۱۳ پر لکھتے ہیں: "قرآن مجید صوفیوں کے لیے وہ سند اعلیٰ ہے، جس کی طرف وہ ہدایت حاصل کرنے کے لیے رجوع کرتے ہیں۔"

"ایک صوفی اتباع رسول پر مجبور ہے، اس کے لیے حدیث کا مطالعہ لازمی ہے، اس لیے حدیث قرآن کے بعد دوسرا ستون ہے، جس پر ایک صوفی کے عمل و ایمان کا قصر تعمیر ہوا ہے۔" (تلک عشرۃ کاملۃ)

الحمدللہ کہ میں نے قرآن کے علاوہ اغیار کی شہادت سے بھی یہ بات ثابت کردی کہ اسلامی تصوف، قرآن وحدیث سے ماخوذ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تصوف اسلام کی روح ہے اور ایمان کا جوہر ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ اسلام کا مقصد اصلی محض اخلاقی تعلیم دینا یا سیاسی نظام قائم کرنا نہیں ہے، بلکہ زندہ خدا سے زندہ رابطہ پیدا کرنے کا طریقہ سکھانا ہے۔ قرآن کی غرض و غایت قیام حکومت نہیں ہے، بلکہ بنی آدم میں تعلق باللہ کی اہمیت کا شعور پیدا کرنا اور اس حقیقت کو جاگزیں کرنا کہ اگر اللہ کے ساتھ تعلق نہ ہو، تو انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ حضور کریم ﷺ نے قریش مکہ سے کبھی یہ نہیں کہا کہ اگر تم میری پیروی کرو گے تو میں تمہیں حکمران بنادوں گا۔ اس کے بجائے صرف یہ کہا کہ میری پیروی کرو میں تمہیں اللہ سے ملادوں گا، بلکہ میری پیروی میں یہ تاثیر ہے کہ تم خود اللہ کے محبوب بن جاؤ گے۔

"قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ" (۳:۳۱)

اے رسول اللہ ﷺ! آپ مسلمانوں سے فرمادیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرنا

چاہتے ہو، تو اس کی صورت صرف یہ ہے کہ میری اتباع (پیروی) کرو۔ اس اتباع کا ثمرہ یہ ملے گا کہ اللہ تم سے اس قدر راضی ہوجائے گا کہ وہ خود تم سے محبت کرنے لگے گا۔

اب ناظرین خود فیصلہ کرلیں کہ اسلام کا مقصد ارفع اور قرآن کی غایت قصویٰ حصول حکومت ارضی ہے، یا استرضاء باری تعالیٰ ہے؟ اس آیت کی روشنی میں ہر شخص یہی جواب دے گا کہ مسلمان کا مقصد حیات اللہ کو راضی کرنا ہے، حکومت ملے یا نہ ملے اور میں علی وجہ البصیرت یہ بات کہتا ہوں، کہ اسلامی تصوف اللہ کو راضی کرنے کے طریق کار (پروگرام) کا دوسرا نام ہے اور یہ مقصد رفیع صرف سلوک طے کرنے ہی سے حاصل ہوسکتا ہے۔ صحابہ کرامؓ کی زندگیاں میرے دعوے پر شاہد عدل ہیں۔

شریعت میں اللہ تعالیٰ معبود ہے، طریقت میں اللہ تعالیٰ مقصود ہے، بظاہر تو یہ فرق بہت معمولی نظر آتا ہے، مگر جب ایک مسلمان اللہ کو اپنا مقصود بنالیتا ہے (اور انداز نگاہ میں یہ تبدیلی صرف تصوف کی بدولت پیدا ہوسکتی ہے) تو اس کی دنیا ہی بدل جاتی ہے۔ یعنی وہی دنیا جس کے حصول میں وہ رات دن سرگرداں رہتا تھا، اس کے قدموں میں سجدہ ریز ہوجاتی ہے۔

جب تک اللہ صرف معبود ہے، مسلمان بادشاہوں کی غلامی میں کوئی دقت یا قباحت محسوس نہیں کرتا، لیکن جب اللہ اس کا مقصود بن جاتا ہے تو سلاطین عالم خود اس کی قدم بوسی کو اپنے لیے باعث سعادت یقین کرتے ہیں۔ جسے شک ہو وہ حضرت سلطان الہند غریب نواز خواجہ خواجگان خواجہ معین الدین اجمیریؒ، قطب الاقطاب خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، شیخ شیوخ عالم خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ اور محبوب الٰہی سلطان المشائخ حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ کی زندگیوں کا مطالعہ کرے۔

تصوف کا اخلاقی اور روحانی پہلو

علامہ یوسف القرضاوی عالم اسلام کے ممتاز مفکر ہیں، اسلامیت کے مختلف موضوعات پر ان کی کتابیں فکر انگیز ہیں۔ موصوف اخوان المسلمون کے فکر کے ترجمان وشارح ہیں، جس کے تحت اسلامی قوانین کا نفاذ دین کے مقاصد میں شامل ہیں، تاہم ان کی فکر میں اصلاح نفس اور معاشرتی اصلاح کے مسائل کو بھی اہمیت حاصل ہے، ان کا زیر نظر مضمون ان کی کتاب "عصری تربیت کے اہم تقاضے" سے ماخوذ ہے۔ (مرتب)

دوسری بات یہ کہ تصوف کا ایک پہلو ایسا ہے، جو ہمارے لئے بڑی قدر وقیمت کا حامل ہے اور اس کی طرف پوری توجہ دینے کی ضرورت ہے اور وہ ہے، اس کا اخلاقی اور تربیتی پہلو اور دراصل یہی چیز ہے، جسے تصوف کا خلاصہ اور اس کا جوہر کہنا چاہئے۔ چنانچہ علمائے اہل سنت میں سے بہت سے جلیل القدر ائمہ اس کے اس کردار کے قائل ہیں۔ علامہ ابن قیم 'مدارج السالکین' میں فرماتے ہیں: "اس فن کے تمام بڑے لوگوں کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ تصوف اخلاق ہی کا دوسرا نام ہے۔" کتانی نے یہی بات ان لفظوں میں کہی ہے: "تصوف اخلاق کا دوسرا نام ہے، پس جو شخص تمہارے لئے اخلاق کے کسی خوشگوار باب کا اضافہ کرتا ہے، تو سمجھو کہ اس نے تم کو تصوف کی ایک نئی راہ دکھادی۔"

تیسری بات یہ کہ ہمیں تصوف کے اس حصے کو چھانٹ کر الگ کرلینا چاہئے، جس سے ایک مسلمان کے عقیدے میں گہرائی پیدا ہوتی اور اس کے اخلاق کو سنوارنے میں مدد ملتی ہے۔ البتہ جہاں کہیں ہمیں تردد ہو یا کوئی بات کھٹکتی نظر آئے تو اس سے فوراً ہاتھ اٹھالینے کی ضرورت ہے۔ صوفیاء پر تنقید کے سلسلے میں، جو کتابیں

لکھی گئی ہیں، ان سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ جس کی ایک نمایاں مثال علامہ ابن جوزی کی 'تلبیس ابلیس' ہے۔

بڑی بے انصافی ہوگی، اگر ہم اس مقام پر اسی طرح کی تصوف کی اور بھی بہت سی خوبیوں کی نشاندہی نہ کرتے چلیں۔ اپنی ہزار خامیوں کے باوجود، تصوف کا ہمارا موجودہ سرمایہ اپنے اندر ایسے انمول موتیوں کو سمیٹے ہوئے ہے، کہ کوئی بھی مسلمان اس سے اپنے کو بے نیاز نہیں رکھ سکتا ہے:

۱۔ علمائے امت کے بیش قیمت اقوال، اسی طرح امت میں وہ ہستیاں جو زہد ورع کا پیکر تھیں اور جن کے شب وروز خدا کی عبادت وریاضت میں بسر ہوتے تھے، جن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ خوف خدا کے سائے میں گذرتا اور جو دین میں فہم وبصیرت کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے، ان کے حکم اور مواعظ کا بڑا ذخیرہ، ہمیں تصوف کے اسی سرمایہ میں مل سکتا ہے۔

۲۔ قرآنی آیات اور نبی ﷺ کی احادیث کے سمجھنے سمجھانے کے سلسلے میں تصوف کے اس سرمایہ میں، ہمیں ایسے لطیف اور اثر انگیز اشارے ملتے ہیں، جس سے آدمی کے اندر ایک طرح کا جذبہ اور تڑپ پیدا ہوتی ہے اور وہ اپنے کو شرح صدر کی کیفیت سے سرشار پاتا ہے۔ صوفیاء کرام کے علاوہ کہیں اور ہمیں ان لطیف اشارات کا سراغ نہیں ملتا۔

۳۔ ایک دوسرے پہلو سے بھی حضرات صوفیاء کرام کو ایک امتیاز حاصل ہے۔ اگر فقہائے عظام نے دین کے ظاہری احکام کو اپنی توجہات کا محور بنایا اور امت کے متکلمین نے عقلی انداز میں، اسلامی عقائد کے دفاع میں اپنے کو سینہ سپر کیا تو ان حضرات صوفیاء کرام نے دین کے باطنی پہلو کی طرف توجہ کی، انہوں نے انسانی نفوس پر طاری ہونے والی آفات کا انتہائی گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا اور ایک ایک کرکے، ان چور دروازوں کا پتہ لگایا، جہاں سے شیطان کو در آنے کا موقعہ ملتا ہے۔ پھر اس سے بچاؤ کی انہوں نے تدبیریں نکالیں اور انسانوں کو لاحق ہونے والے ان

باطنی امراض کا تریاق فراہم کیا۔ کوئی شک نہیں کہ اس خاص میدان میں ان کی جو مشقیں ہیں اور جو خاص تجربات اور معلومات ان کو حاصل ہیں، امت کے کسی دوسرے طبقہ کے یہاں یہ چیز ہمیں نہیں مل سکتی۔

۴۔ اس کے علاوہ ایک اور خاص بات یہ ہے کہ ان کے اقوال کو پڑھنے سے آدمی کے دل میں، ایک طرح کی گرمی پیدا ہوتی اور روح کو بالیدگی نصیب ہوتی ہے۔ اور پڑھنے والا براہ راست اپنے کو، ان کیفیات سے سرشار محسوس کرتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ان حضرات نے تزکیۂ نفس اور اصلاح باطن کے لئے جو ریاضتیں کی ہیں اور جن مجاہدات کی مشقیں جھیلی ہیں، ان کے اقوال کی یہ اثر انگیزی اس کا نتیجہ اور کرشمہ ہے۔ یقیناً جو شخص خون جگر جلا کر اپنے اندر کوئی کیفیت پیدا کرتا ہے، اس کی بات ہی اور ہے، وقتی طور پر ان کیفیات کو اپنے اوپر طاری کر کے، آدمی اپنے اندر وہ بات پیدا نہیں کرسکتا ہے۔

۵۔ دور اول کے صوفیائے کرام جنہوں نے تصوف کی بنیاد رکھی اور اس کے لائحۂ عمل کو متعین کیا، ان کی بھرپور کوشش تھی کہ اس کے اندر کوئی بات خلاف شرع شامل نہ ہونے پائے۔ وہ اس سے کم کسی چیز پر تیار نہ تھے کہ تصوف کو بہرحال قرآن وسنت کا پابند ہونا چاہئے۔ چناچہ سید الطائفہ جنید بغدادی کا مشہور قول ہے۔

من لم يقراء القرآن ويكتب الحديث لا يقتدىٰ به فى هذالامر لان علمنا مقيد بالكتاب والسنة.

جو قرآن نہ پڑھے اور حدیث نہ لکھے، وہ ہمارے (تصوف کے) اس معاملے میں پیروی کے لائق نہ ہوگا۔ اس لئے کہ ہمارا یہ علم کتاب وسنت کا پابند ہے۔

نیز انہی کا قول ہے:

مذهبنا مقيد بالكتاب والسنة.

ہمارا مسلک (تصوف) کتاب وسنت کا پابند ہے۔

اسی طرح ابو حفص دارانی، ابن ابی الحواری اور سری سقطی وغیرہ، جیسے اساطین

تصوف سے بھی اسی طرح کے اقوال مروی ہیں۔ جیسا کہ امام قشیری اور دوسرے لوگوں نے ان سے نقل کیا ہے۔

۶۔ آخری بات یہ کہ بات صرف حلقہ صوفیاء تک محدود نہیں، سلف صالح میں بہت سے وہ لوگ بھی، اس کے قدردان نظر آتے ہیں، جن کی زندگیاں قرآن وسنت کی وکالت میں گذریں اور جنہوں نے اپنی پوری زندگی میں ایک لمحہ کے لئے بھی، ان کے دکھائے ہوئے راستے سے سر موانحراف گوارہ نہیں کیا۔ چنانچہ انہوں نے بھی تصوف کو اپنا موضوع بنایا اور اس سے متعلق کتابیں تصنیف کیں۔ جن میں اگر انہوں نے اس کے ایک حصے پر تنقید کی اور اسے قابل رد قرار دیا۔ تو دوسرے حصے کی قدروقیمت کا انہوں نے کھلے دل سے اعتراف کیا اور اسے اپنے سینے سے لگایا ہے۔ علامہ ابن تیمیہؒ کے رسائل 'العبودیہ' 'التحفہ العراقیہ فی الاعمال القلبیہ'، اور 'رسالتہ الفقراء' وغیرہ کو دیکھ کر، اس حقیقت کا اندازہ اچھی طرح لگایا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس موضوع پر موصوف کی اور بھی بہت سی چھوٹی بڑی چیزیں بھی ہیں۔ جو ان کے مجموعۂ فتاویٰ کی نئی ترتیب میں دو ضخیم جلدوں پر پھیلی ہوئی ہیں۔ جن میں ایک کا عنوان 'التصوف' اور دوسرے کا 'السلوک' ہے۔ اسی طرح ان کے شاگرد رشید علامہ ابن قیمؒ نے بھی اس سلسلے کی بہت سی چیزیں یادگار چھوڑی ہیں۔ مثال کے طور پر 'طریق الہجرتین' 'عدۃ الصابرین' 'ذخیرۃ الشاکرین' اور 'الداء والدواء' وغیرہ۔ ان مختصر رسائل کے علاوہ اس موضوع پر ان کی ضخیم کتاب بھی ہے، جو تین جلدوں میں ہے، یعنی 'مدارج السالکین شرح منازل السائرین' جس کے اندر انہوں نے تصوف کو قرآن وسنت کی کسوٹی پر جانچنے اور پرکھنے کی اچھی کامیاب کوشش کی ہے۔

غلبہ دین کے کام کے لئے

تصوف کی ضرورت

تحریک اسلامی کا کارکن جس دعوت کو لے کر اٹھتا ہے، وہ بنیادی طور پر ایک روحانی اور دینی دعوت ہے۔ اس تحریک کی کامیابی اس بات پر منحصر ہے کہ دعوت دینے والوں اور دعوت قبول کرنے والوں کے حالات معاملات اور قلبی کیفیات تبدیل ہوجائیں۔ تحریک اسلامی کا دنیاوی مقصد زیادہ سے زیادہ لوگوں کو بہتر سے بہتر مسلمان بنانا ہے۔ تحریک اسلامی کی دنیاوی کامیابی کو ناپنا ہو تو یہ دیکھیے کہ اس تحریک کے نتیجہ میں کتنے لوگ، کتنے پختہ اور کتنے مخلص مسلمان ہوئے ہیں۔ سرکار دو عالم کے سیدالانبیاء ہونے کی ایک بہت بڑی دلیل یہ ہے کہ حشر میں حضور رسالت مآب ﷺ کی امت کو دیگر تمام انبیاء کی امتوں پر عددی فوقیت حاصل ہوگی اور جنت میں بھی سب سے زیادہ اسی امت کے افراد جائیں گے۔

رسول مقبول ﷺ کو لوگوں کا اسلام قبول کرنا کس قدر مرغوب تھا، مندرجہ ذیل حدیث سے ثابت ہوتا ہے:

”آپ ﷺ نے خیبر کے دن حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ارشاد فرمایا کہ اگر تمہاری وجہ سے ایک آدمی کو ہدایت نصیب ہوجائے تو یہ سو سرخ اونٹوں کے حصول سے بہتر ہے۔“

نیز سیرت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو لوگوں کا اسلام لانا کس قدر مطلوب تھا۔ حج کے موسم میں آپ ﷺ ایک ایک قبیلے کے خیمے میں جاتے اور جو سنتا اسے بھی دعوت دیتے اور جو نہ سنتا، اسے بھی دعوت دیتے اور روایت میں ہے کہ ایک ایک فرد کے پاس آپ دن میں کئی کئی بار دعوت دینے کے لئے جاتے۔ خود

آپ کا ارشاد مبارک ہے کہ مجھے دعوت کی پاداش میں اتنا ستایا گیا کہ کسی نبی کو اس قدر نہیں ستایا گیا، لیکن یہ آزمائش ایک ایک فرد تک پیغام حق پہنچانے کے جذبہ کو سرد نہ کرسکی۔ سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ سارا دن لوگوں کو دعوت حق دیتے رہتے اور جب شام کو گھر میں داخل ہوتے تو خبر ملتی کہ نیا قافلہ آیا ہے تو فوراً اٹھ کھڑے ہوتے اور روکے نہ رکتے۔

واضح ہو کہ اصلاح معاشرہ اور قیام ریاست خود مطلوب نہیں، بلکہ محض تطہیر قلب کا ذریعہ ہے۔ تطہیر قلوب اور حصول رضائے الٰہی لازم و ملزوم ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ نفوس پاکیزہ ہوتے جائیں اور رضائے الٰہی کا حصول نہ ہو۔ معاشرہ اور تعمیر ریاست قلب کے ہم معنی تصور کرتے ہیں۔ ہر تاریخی دور میں اسلام اتنا ہی غالب ہوتا ہے، جتنی عقیدہ اور حال کی درستگی عام ہوتی ہے۔ اسلامی ریاست کا کام یا اس کے اثر اور حدود میں توسیع قلوب کا ہم معنی ہے، قیام واستحکام ریاست کا ہم معنی نہیں۔

تطہیر قلوب کا اسلامی طریقہ تصوف ہے۔ تطہیر قلوب کے اسی طریقے (یعنی تصوف) پر امت کا اجماع ہے۔ تصوف کا تربیتی نظام قلوب کو شہوت اور غضب سے پاک کرکے ان کو عشق الٰہی سے معمور کر دیتا ہے۔ طاہر قلوب ایسے شفاف آئینہ کی مانند ہوجاتے ہیں جن سے انوار الٰہی منعکس ہوتے ہیں۔ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا ”مؤمن اللہ کے نور سے دیکھتا ہے“ (مسند احمد)

وہ قلب جو غضب اور شہوت کے جذبات سے پاک اور انوار الٰہی سے معمور ہو، اس قابل ہوجاتا ہے کہ حقیقت کا ادراک کرسکے، اسی کو Objectivity (چیزوں کو جیسی کہ وہ ہیں اس طرح دیکھنا) کہتے ہیں۔ اسی لیے اسلام نے عقلیت قلبی کی فوقیت کو تسلیم کیا ہے۔ Objectivity (چیزوں کو اس طرح دیکھنا جس طرح کہ وہ ہیں) عقلیت قلبی کے فروغ سے حاصل ہوتی ہے، عقلیت دماغی کے

فروغ سے حاصل نہیں ہوتی۔ جس کا قلب طاہر نہیں، وہ حقیقت کا شناسا نہیں ہوسکتا اور اس کا غضب اور اس کی شہوت (یعنی اس کی خود پرستی) اس کے احساس پر غالب ہوتی ہے۔ چونکہ ایسے شخص کا حال درست نہیں، لہٰذا وہ کائنات میں اپنے مقام (یعنی عبدیت) سے نہ آگاہ ہوسکتا ہے، نہ مطمئن ہوسکتا ہے، ایسا شخص حقیقت کو تسلیم نہیں کرتا، بلکہ وہ اپنی کائنات خود تخلیق کرنا چاہتا ہے۔ ایک ایسی کائنات جو اس کی خودی (شہوت اور غضب) کا مکمل اظہار ممکن بنا سکے۔ خود اظہاری (Self-expression) کی اسی جستجو کو (Subjectivity) (چیزوں کو اپنی ذات کی عینک سے دیکھنا) کہتے ہیں۔ خود اظہاری یا نفس پرستی کی یہ جستجو قلب اور حقیقت کے درمیان ایسے تاریک پردے ڈال دیتی ہے کہ انسان کو کائنات کی ہر شے میں اپنی ذات اور اپنی خواہشات کا پرتو نظر آتا ہے۔

حقیقت الٰہی کا ادراک صرف ان قلوب کے لیے ممکن ہے، جو عشق سے سرشار اور شہوت اور غضب سے پاک ہوں۔ عشق، عبادت اور خود فراموشی کو ممکن بناتا ہے۔ عشق مؤمن کا دائمی حال اور دعوت اسلامی کا اساسی جذبہ ہے۔ خود سرکار دو عالم ﷺ نے سب سے پہلے دعوت انہی کو دی، جن سے آپ سب سے زیادہ محبت کرتے تھے، (حضرت خدیجہ طاہرہ، حضرت صدیق اکبر، حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہم اجمعین)۔ سرکار دو عالم ﷺ نے امت سے اتنی محبت کی کہ جب آپ معراج پر تشریف لے گئے اور آپ کو وہ بلندیاں نصیب ہوئیں کہ نہ تو اس سے پہلے کسی کو نصیب ہوئی تھیں اور نہ اس کے بعد کسی کو نصیب ہوں گی۔ ایسے عالم میں بھی آپ نے اپنی امت کو یاد رکھا اور قیامت کے روز جب نفسا نفسی کا عالم ہوگا اور انبیاء تک "نفسی نفسی" کہہ رہے ہوں گے، ایسے عالم میں آپ امت کو یاد رکھیں گے اور آپ کے لبوں پر "امتی" "امتی" ہوگا، ﷺ!

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے

قرآن پاک میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق یہ آیت تلاوت فرمائی۔

(میرے پروردگار! ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا ہے، یعنی ان کی وجہ سے بہت سے آدمی گمراہ ہوئے، پس جو لوگ میری پیروی کریں وہی میرے ہیں، پس ان کے لیے تو میں تجھ سے عرض کرتا ہوں کہ تو ان کو بخش دے)۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کا یہ قول بھی نقل فرمایا جو قرآن مجید میں ہے (اے اللہ! اگر آپ میری امت کے ان لوگوں کو عذاب دیں تو یہ آپ کے بندے ہیں)۔ یہ دونوں آیتیں تلاوت فرما کر آپ نے اپنی امت کو یاد فرمایا اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور کہا اے اللہ! میری امت، میری امت اور آپ اس دعا میں بہت روئے۔۔۔ تو اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو فرمایا کہ محمد ﷺ کے پاس جاؤ اور ان کو ہماری طرف سے کہو تمہاری امت کے بارے میں ہم تمہیں راضی اور خوش کر دیں گے اور تمہیں رنجیدہ اور غمگین نہ کریں گے۔

واضح ہو کہ تحریک اسلامی کا کارکن اصلاً فطرتاً ایک عاشق ہوتا ہے۔ اسے اللہ سے محبت ہوتی ہے، اسے عبادت کہتے ہیں، اسے اللہ کے بندوں سے محبت ہوتی ہے اور اسے رفاقت کہتے ہیں، (یہ حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ کا ارشاد ہے) تحریک اسلامی کا کارکن عشق کے جذبہ سے سرشار ہو کر ہی دعوت کے میدان میں اترتا ہے۔ اس کو اپنے رفیقوں کی فلاح اور اخروی کامیابی کی تمنا ہوتی ہے۔ وہ ان کو جہنم کی آگ سے بچانے کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیتا ہے۔ اس کی یہی وارفتگی اور خود فراموشی دعوت کے مخالف کو بالکل بدل دیتی ہے۔ وہ تحریک اسلامی کے کارکن کو اپنا محب، محسن اور اپنا اتنا بڑا بہی خواہ سمجھنے لگتا ہے کہ اپنا سب کچھ اس کے سپرد کر دیتا ہے۔ یاد رکھو، دعوت اسلامی اگر پنپ سکتی ہے تو صرف محبت ہی کی بنیاد پر پنپ سکتی ہے، خود غرضی اور حسد کی بنیاد پر کبھی نہیں پنپ سکتی۔ خود غرضی اور حسد کو بنیاد بنا کر غیر اپنایا نہیں جاتا، بلکہ اسے تباہ و برباد کیا جاتا ہے۔ یاد رکھو، تمام اسلامی تحریکات

غیر کو فنا کرنے کی تحریکیں ہیں، (مثلاً لبرلزم، قوم پرستی، اشتراکیت وغیرہ۔ ان کی دعوت خود غرضی اور نفس پرستی کی دعوت ہے، وہ شہوت اور غضب کو فروغ دیتی ہیں)۔

لبرلزم فرد کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ وہ اپنی انفرادی آزادی کے حصول اور توسیع کو ہر چیز پر مقدم رکھے۔ آزادی سے مراد یہ ہے کہ فرد وسیع سے وسیع تر احاطہ میں اپنی ربوبیت کو قائم کرنے کا مکلف ہو۔ وہ جو چاہے حاصل کر سکے۔ کسی غیر کو اس کی خواہش کی تحدید کا حق نہیں ہے۔ آزادی کا پرستار خود غرضی کے حصار سے کبھی نہیں نکل سکتا۔ اس کی زندگی کا مقصد لذات کی تسکین کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہ فطرتاً شہوت سے مغلوب ہوتا ہے۔ قوم پرستی اور اشتراکیت انسانی گروہ کی خدائی کے قیام و استحکام کے دلدادہ ہیں۔ ایک قوم پرست اپنی ذاتی شخصیت اپنے قومی تشخص میں سمو دیتا ہے۔ ایک مہاجر، مہاجر قوم کی پرستش کرتا ہے۔ مہاجر قوم کو دیگر قوموں پر فوقیت دیتا ہے اور یہی اس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد بن جاتا ہے۔ وہ دیگر قوموں کو مہاجر قوم کا حریف سمجھتا ہے۔ اور ان سے سب کچھ چھین لینا چاہتا ہے۔

ایک قوم پرست کے قلب پر غضب کا پردہ پڑا رہتا ہے۔ یہی اس کی SubJustificaty ہے۔ وہ غضب کو فروغ دے کر اپنی قوم کی پرستش کرتا ہے۔

شہوت اور غضب ظلمات ہیں۔ محبت نور ہے۔ تحریکات اسلامی کے کارکن کا قلب ظلمات سے پاک اور نور سے معمور ہوتا ہے۔ یہی بے غرضی، یہی عبدیت، یہی نور اس کو عوام میں ممیز اور ممتاز بناتا ہے۔ تحریک اسلامی کے کارکن کی چار امتیازی خصوصیات ہیں، جن کی بنا پر وہ عوام کے لیے سرچشمہ ہدایت ہوتا ہے۔

پہلی خصوصیت یہ ہے کہ تحریک اسلامی کا کارکن فقیر ہوتا ہے۔ فقیر کی تعریف حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ یوں فرماتے ہیں "حتی الامکان دنیا و مافیہا سے دل نہ لگاوے اور کسی وقت فکر آخرت سے غافل نہ ہو۔ ہمیشہ اس حال میں ہو کہ اگر اس وقت پیغام اجل آجائے تو اس کے لیے تیار ہو اور ہر وقت یہ

سمجھے کہ یہ سانس شاید آخری سانس ہے۔ دن کے گناہوں سے قبل رات کے اور رات کے گناہوں سے قبل دن کے گناہوں پر استغفار کرتا رہے اور حتی الوسع حقوق العباد سے سبکدوش رہے۔"

غور کرو حضرت کے ارشاد کے مطابق فقیر وہ ہے، جو دنیا سے بے نیاز ہے، کوئی کام اپنی غرض کے مطیع ہو کر نہیں کرتا۔ حضور کریم ﷺ نے فرمایا "ہر وہ شخص جو مخلوق پر انحصار کرنا چھوڑ دے اور خالق کو اپنا آپ سپرد کر دے، اللہ اس کو غیب سے رزق اور اعانت بخشتا ہے۔" سرکار نے تصدیق میں یہ حدیث قدسی ارشاد فرمائی:

"بہترین عبادات فرض عبادات ہیں اور بندہ میرا قرب نوافل کے ذریعے حاصل کرتا ہے، یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگ جاتا ہوں تو اس کا کان بن جاتا ہوں، جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ بن جاتا ہوں، جس سے وہ دیکھتا ہے۔ جب وہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہے تو اس کی دعا کو قبول کرتا ہوں اور جب وہ پناہ مانگتا ہے تو میں پناہ دیتا ہوں۔" (مفہوم)

اس کو اللہ کے نور سے دیکھنا کہتے ہیں۔ یہی Objectivity ہے۔ اس Objectivity کو امام ابن قیم رحمۃ اللہ اپنی کتاب الروح میں یوں بیان فرماتے ہیں: "ولی کا دل ایسا شفاف آئینہ بن جاتا ہے کہ اشیاء حقیقت کو منعکس کر سکے۔ چونکہ وہ خدا کے نور سے دیکھتا اور سنتا ہے، لہٰذا وہ چیزوں کو ویسے ہی پاتا ہے۔ جیسے کہ ان کو خالق حقیقی نے تخلیق کیا ہے۔"

یاد رکھو فقر Objectivity ہے۔ Objectivity قلب کو غضب اور شہوت سے پاک کر کے، اسے نور الٰہی کا مسکن بنانے سے حاصل ہوتی ہے۔ عقلیت دماغی کے فروغ اور استعمال سے حاصل نہیں ہوتی۔

چونکہ تحریک اسلامی کا کارکن فقیر ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کو معرفت حاصل ہوتی ہے۔ یہ اس کی دوسری صفت ہے۔ فقر معرفت کے حصول کا ذریعہ ہے۔ تحریک

اسلامی کا کارکن عارف ہوتا ہے، محض عالم نہیں ہوتا ہے۔ اس کے لیے زمان و مکان کی طنابیں کھینچ دی جاتی ہیں اور وہ ان رموز کا محرم بنا دیا جاتا ہے، جو عقل دماغی کی دسترس سے باہر ہوتے ہیں۔ وہ راہ سلوک کے تمام مدارج طے کرنے کا مکلف ہوتا ہے۔ اس کی توجہ اور اس کا تصرف مخاطب کی دنیا بدل دیتا ہے۔ مخاطب تحریک اسلامی کے کارکن کی روحانی عظمت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہی روحانی برتری، معاشرتی برتری کی بنیاد فراہم کرتی ہے۔ تحریک اسلامی کا کارکن باطن کی تعلیم و تربیت کا طریقہ جانتا ہے۔ ابنائے زمانہ کی نبضوں کو پہچانتا ہے۔

حضرت امام حسن بناء رحمتہ اللہ کی مجلس کا حال سنو!

"جب واردات و کیفیات باطنہ کا اظہار فرماتے تو کبھی سالکین کو قبض و بسط کی نظافتوں سے بھر دیتے، کبھی فانی کر دیتے۔ رہرواں راہِ وفا کو ناز و یاس سے بچا کر رکھتے۔ کوئی مجلس میں ناز لے کر جاتا اور فنا ہو کر آتا، کوئی یاس لے کر جاتا اور بشارت سن کر آتا۔ جب سالکین کو رذائل سے خالی کرنے پر آتے تو ندامت اور شکستگی کا عالم طاری ہو جاتا۔ مرید ندامت سے روتے اور مرشد خود سب سے زیادہ گریہ کرتا اور نادم دکھائی دیتا۔ جب حسنات اور محبت الٰہی سے بھرے ہوئے آتے تو بشارتیں دیتے۔ دلجوئی کرتے، دلنوازی فرماتے۔ لوگوں کو تشویشات سے بچاتے اور اصل کام میں سرگرم رکھتے۔ ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے اللہ عز وجل لوگوں کے قلوب کی حالت امام پر منکشف فرما رہا ہے۔ امام وہی فرماتے ہیں، جس کی اہل مجلس کا حال تقاضا کرتا ہے۔ حاضرین کے قلبی تاثرات کا احساس فرماتے ہوئے لب و لہجہ ایسا اختیار فرماتے کہ لوگوں کی چیخیں نکل جاتیں۔"

دیکھو اس کو معرفت کہتے ہیں۔ اگر تم لوگوں کی قلبی کیفیات سے آگاہ نہ ہوئے تو دعوت کیسے دو گے، ان کے دل کی دنیا کیسے بدلو گے۔ تحریک اسلامی کے کارکن کے لیے لازم ہے کہ وہ روحانی فیوض کے حصول کے لیے جدوجہد کرے، محض دماغی

عقلیت اور شرعی فرائض کی ادائیگی کافی نہیں۔ تم اللہ والے بن جاؤ، اتنا ذکر کرو کہ ملائکہ کے فرائض بارگاہ ایزدی سے تم کو تفویض کیے جانے لگیں، پھر دیکھو دعوت جنگل کی آگ کی طرح پھیلے گی۔

فقر (دل کو خواہشات سے پاک کرنا) اور معرفت (حقیقت تک رسائی) ارشاد کے لیے لازم ہے، تم جانتے ہو کہ امام بنا مرشد عام تھے۔ تم بھی مرشد ہو (یہ تحریک اسلامی کے کارکن کی تیسری صفت ہے) محض داعی نہیں ہو تم لوگوں کو صرف حقیقی منزل تک بلانے والے نہیں، ان کو منزل کی طرف گامزن کرنے والے، ان کی حفاظت کرنے والے، ہر کام پر ان کی مدد اور رہنمائی کرنے والے ہو۔ تم لوگوں کو کبھی ان کے حال پر نہیں چھوڑ سکتے، تمہیں ان کو اپنانا ہے۔

امام ربانی نے مرشد کے فرائض یوں بیان فرمائے ہیں۔ "قطب ارشاد کی ذمہ داری ہے کہ وہ عام انسانوں کی ہدایت، استغفار اور اصلاح کا انتظام کرے۔ قطب ارشاد تقویت ایمان اور ہدایت، امر بالمعروف اور تسلسل استغفار کا ذمہ دار ہے۔

ابدال کے بارے میں حدیث میں آتا ہے "ان کے دل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مانند ہوں گے اور ان کی برکت سے عام لوگوں کی مشکلات اور تکالیف رفع کی جائیں گی۔ یہی ابدال ہیں۔

مرشد وہ ہے جو لوگوں کی مستقل اور مسلسل نگہداشت کی ذمہ داری قبول کرے۔ ہر قدم پر ان کی رہنمائی کرے، ان کی تکالیف دور کرے، ہر قدم پر ہدایت اور امر بالمعروف کا انتظام کرے اور لوگوں سے ایسا مسلسل اور مستقل تعلق قائم کرے، جو رجوع الی اللہ کا داعی وسیلہ ہے۔ یہ ارشاد کی حقیقت ہے اور یہ ایک ایسا ہمہ گیر اور ہمہ جہت تعلق ہے، جو زندگی کے ہر شعبہ پر محیط ہے۔

ارشاد کی یہی ہمہ گیریت جہاد کی بنیاد فراہم کرتی ہے۔ تحریک اسلامی کے کارکنان کی چوتھی صفت یہ ہے کہ وہ مجاہد ہے، وہ کفر اور فسق سے کسی درجہ اور کسی

مقام پر سمجھوتا نہیں کرتا۔ وہ محض لوگوں کی انفرادی اصلاح نہیں کرنا چاہتا۔ وہ محض معاشرہ کی اصلاح نہیں چاہتا۔ وہ محض ایک نئی حکومت کے قیام کا خواہشمند نہیں۔ وہ ہر صالح نفس کو ارشاد کی لڑی میں اس طرح پرونے کی فکر کرتا ہے کہ ایک عظیم الشان جیش اسلامی رزم گاہ حیات کے ہر مورچے پر منظم ہو کر، کفر و الحاد و فسق کی طاغوتی طاقتوں پر ایک نہ ختم ہونے والی جنگ کو جاری رکھے۔ اسی کو جہاد کہتے ہیں اور یہی پیہم اور مسلسل جدوجہد تحریک اسلامی ہے۔ تم اسی لشکر کے سپاہی، اسی جہاد کے شریک ہو۔ تم کفر و الحاد سے کسی سمجھوتے کے قائل نہیں۔ تم طاغوت کو مکمل طور پر نیست و نابود کرنے کا عزم رکھتے ہو تاکہ روئے زمین پر کوئی ایک شخص بھی ہدایت سے محروم نہ رہ جائے۔

تم جو گرجو تھرائیں سات آسماں
تم بڑھو تو قدم چومیں سیل رواں
تم جو ٹھرو تو ثابت ہو کوہِ گراں
ہم قدم ساتھیو! ہم عناں دوستو!
میری آواز پر تم بھی آواز دو

منزل جہاد منصب ارشاد کا لازمی نتیجہ ہے اور یہ دونوں تحریک اسلامی کے لازمی جزو ہیں، لیکن غلبہ اسلام (یعنی زیادہ سے زیادہ لوگوں کا مکمل دخول اسلام) کے لیے جتنی تحریک ضروری ہے، اتنی ہی تنظیم بھی ناگزیر ہے۔ تنظیم اسلامی کا مقصد تحریک اسلامی کو اس طرح جاری رکھنا ہے کہ کارکنان فقر، معرفت، ارشاد، جہاد کے اوصاف کو اپنائیں اور روحانی فیوض و برکات سے مستفید ہونے کے لیے زیادہ سے زیادہ اہل ہوں۔ صوفیائے کرام کی تعلیمات سے ظاہر ہوتا ہے کہ روحانی کسب فیض کے لیے جس تنظیم کی ضرورت ہے، اس کی چند ناگزیر خصوصیات ہیں:

۱- یہ تنظیم معروف سلسلہ ہائے تصوف (چشتیہ، نقشبندیہ، قادریہ، سہروردیہ

وغیرہ) سے متعلق ہے۔ یہ اتنا ضروری اور مفید ہے، جتنا ائمہ اربعہ (امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ) سے مطابقت اور تعلق ضروری ہے۔ معروف سلسلہ ہائے تصوف سے تعلق خود سرور کائنات سے روحانی وسیلہ قائم کرنے کا ذریعہ ہے، چونکہ ان طرائق کا سرچشمہ سرکار دو عالم ﷺ کے دو مرید حضرت صدیق اکبر اور سیدنا علی مرتضیٰ ہیں۔

۲- یہ تنظیم ایک ایسا سلسلہ رشد و ہدایت قائم کرتی ہے، جو بیعت کے سہارے قائم رہتا ہے، بیعت اس بات کا اظہار ہے کہ مرشد و سالک کا تعلق ایک ہمہ جہت تعلق ہے۔ مرشد، سالک کی ذات میں تصرف اور اس کے حال پر توجہ کے ذریعے اس کی مکمل رہنمائی کا ذمہ لیتا ہے۔ پورے نظامِ تربیت کو ایسے پاکیزہ نفوس کے ارد گرد اور سہارے سے مربوط کیا جاتا ہے، جو ہر قدم پر سالک کی رہنمائی کا فرض ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تنظیم کی ہر سطح پر مرشد عام کے خلفاء ہوتے ہیں یا ان خلفاء کے خلفاء ہوتے ہیں اور کوئی کارکن بھی ایمان اور عمل کے کسی مرحلہ پر اکیلا نہیں چھوڑا جاتا۔

۳- مرشد اور سالک کا تعلق قلبی ہوتا ہے، دستوری نہیں ہوتا۔ شیخ اور مرید اپنا سب کچھ ایک دوسرے پر نچھاور کرنے کی جستجو میں رہتے ہیں، وہ ایک دوسرے کے عاشق بھی ہوتے ہیں اور معشوق بھی ہوتے ہیں۔ شیخ کی خواہش ہوتی ہے کہ سالک کے حال پر ایسی توجہ کرے کہ اس کے نتیجہ میں وہ سرعت کے ساتھ راہ سلوک کے تمام مقامات طے کر کے ایک اعلیٰ مقام پر فائز ہو۔ سالک کے حال سے باخبر رہنا اور اس سے گہری ذاتی وابستگی پیدا کرنا مرشد کی ذمہ داری ہے۔ یہ ذمہ داری پوری نہ ہو گی تو سلسلہ کی کڑیاں بکھر جائیں گی۔ مرشد اپنے اعلیٰ مقام سے گر جائے گا اور سالک کا قلب مصفانہ ہو سکے گا۔ شیخ شہاب الدین سہروردی فرماتے ہیں "شیخ کا مقام بہت بلند ہے۔ وہ انبیاء کا نائب ہے اور ان معنوں میں کہ وہ لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتا

ہے۔ شیخ کا فرض ہے کہ وہ تمام بندگان خدا تک اپنی آواز کو پہچانے کی جستجو کرے۔"

۴۔ تنظیم کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک ایسے حلقے کی شکل اختیار کرتی ہے، جس میں ہر شخص شامل ہوسکتا ہے۔ حضرت مولانا اللہ یار نقشبندی فرماتے ہیں: شیخ کا یہ وصف ہونا چاہیے کہ وہ ہر حلقہ بگوش کو لطائف سے روشناس کرائے، لیکن راہ سلوک کے بلند مقامات تک پہنچانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ یہ انفرادی استعداد اور سعی پر منحصر ہے۔ حضور کریم علیہ ختمی مرتبت کا ارشاد گرامی ہے: "لوگوں سے ان کی عقل کے مطابق گفتگو کرو" اس کا یہی مطلب ہے۔

لطائف میں قلب، روح، نفس اور ضمیر شامل ہیں۔ قلب کا اصل اور فطری فعل ذکر، روح کی توجہ اور ضمیر کا کشف ہے۔ شیخ ہر حلقہ بگوش کو ان حقائق سے آگاہ کر دیتا ہے۔ ہر حلقہ بگوش کے لیے ذکر، توجہ اور کسی نہ کسی درجہ میں کشف کو ممکن اور آسان بنا دیتا ہے۔ ان حقائق کے ادراک کے بغیر کوئی شخص بھی نفس پرستی یا طاغوت پرستی سے آزاد نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا اللہ عزوجل نے ہر انسان میں ان حقائق سے آگاہی کی صلاحیت رکھی ہے۔

۵۔ نفس پرستی اور طاغوت پرستی کو ترک کیے بغیر، کوئی شخص بھی تحریک اسلامی کا کارکن نہیں بن سکتا۔ چونکہ ہر فرد میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ نفس پرستی اور طاغوت پرستی کو دور کرے، لہٰذا دنیا کا ہر آدمی مؤمن ہو یا کافر، تحریک اسلامی کا مخاطب ہے اور تنظیم اسلامی میں سمویا جاسکتا ہے۔ تحریک اسلامی ایک آفاقی (Universal) تحریک ہے اور تنظیم اسلامی ایک عوامی تنظیم انہی معنوں میں ہے کہ ہر وہ شخص جو اس میں شمولیت کا خواہشمند ہے، اس تحریک و تنظیم میں اپنی جگہ بنا سکتا ہے۔ یہی صوفی سلسلوں کی بھی ایک اہم خصوصیت ہے اور سلسلہ ہائے تصوف کے احیاء اور تنظیم کی ایک بہترین شکل بن سکتی ہے۔ تحریک اسلامی ایک ہمہ گیر اور جامع تحریک ہے، وہ بیک وقت قلب کی تطہیر، معاشرہ کی اصلاح اور خلافت راشدہ کے

قیام کی جستجو ہے، اس کا مخاطب دنیا کا ہر فرد ہے اور وہ کسی محدود علاقہ میں محض کسی زمانی اور مکانی نظام کے قیام کی جستجو نہیں کرتی بلکہ تہذیب اسلامی کے آفاقی (Universal) غلبہ کے لیے پیہم جدوجہد اور جہاد کو منظم کرتی ہے، تاکہ دنیا کا ہر باشندہ اسلام سے روشناس ہوجائے اور اتمام محبت ممکن ہو۔ یہی صوفیاء کی جدوجہد ہے اور ویسے تو دورِ حاضر میں اس کی کئی مثالیں دی جاسکتی ہیں، لیکن ہمارے لیے سب سے اہم مثال حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ کی ہے، کیونکہ برصغیر میں غلبہ اسلام کا کام آپ ہی کی کوششوں کا تسلسل ہے۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ کی شخصیت ہمہ جہت تھی اور برصغیر کے دو بڑے مسلکی دھارے بریلوی اور دیوبندی حضرت کی ذات پر جمع ہوتے ہیں۔ آپ کا فیصلہ "ہفت مسئلہ" ہمیں وہ بنیادیں فراہم کرتا ہے جن کی بنیاد پر اتحاد امت کا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا جاسکتا ہے۔

علاوہ ازیں جماعت اسلامی، جمعیت علماء اسلام، جمعیت علماء پاکستان، تحریک اخوان، تنظیم اسلامی اور مذہبی دھارے میں کام کرنے والی جماعتیں، اپنے اپنے نظم میں تصوف کے اس کام کا بھی احیاء کرسکتی ہیں، جس کے سرخیل حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی، حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمہم اللہ تھے۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی فکر اور تنظیم دونوں کو صوفیاء کی تعلیمات کے قالب میں ڈھالنے کی پیہم جستجو کریں اور تحریکی کارکنان میں نظریاتی سطح پر پختگی پیدا کرنے کے ساتھ ان کے قلوب میں ایمان اور معرفت الٰہی کی شمع روشن کردیں۔

(ماخوذ: ماہنامہ بیداری مئی ۲۰۰۹)

بعض ممتاز عارفوں کے

فکر و عمل کا مطالعہ

''اس کے بعد سابقین متاخرین کو اجداد در ثار کی ابتدائی تحریروں سے متوجہ کرتے رہے۔ انہیں خطاب کی ضرورت نہ تھی۔ پھر خواہشات ماند پڑ گئیں، مقاصد کمزور ہو گئے۔ اس کے بعد سوال و جواب، کتابوں اور تصنیفات کا ایک سیلاب آیا۔ جن کے پوشیدہ مفہوم سے اگر مصنفین آگاہ تھے تو قاریوں کے سینے بھی ان کو سمجھنے کے لئے وا تھے۔''

معرفت کی تحریک کی نشوونما میں عرب، شام، عراق اور خراسان نے یکساں طور پر حصہ لیا ہے۔ ہم نے یہ مطالعہ کیا ہے کہ زہد وہ وصف ہے جس کی تعریف روایت پسند اسلامی علماء نے بھی کی ہے۔ امام احمد بن حنبل (وفات 241ھ/855ء) سنی فقہ کے کٹر ترین بانیوں میں سے تھے۔ انہوں نے اس موضوع پر ایک کتاب ''کتاب الذہد'' کے نام سے تصنیف کی ہے۔ لیکن اس وصف کی نوعیت میں آہستہ آہستہ تبدیلی آتی چلی گئی۔ ابتدا میں اس کا مفہوم دنیاوی مال و متاع اور خواہشات سے مکمل کنارہ کشی تھا لیکن بعد میں یہ خوف الٰہی، ریاضت اور عشق الٰہی میں تبدیل ہو گیا۔ زہد بذات خود دنیا سے معلق ایک بے کیف اور منفی قسم کا رویہ ہے۔ جب یہ رویہ روحانی جذبے کے تحت جاگتا ہے تو ایک ایسے شدید جذبے میں بدل جاتا ہے جو سختیوں میں لطف حاصل کرتا ہے اور وجد میں مسرت۔ جب یہ جذبہ اپنے بھرپور انداز میں قیاسی توجیہ پسندی کی متجسس روشنی کے تحت آ جاتا ہے تو پھر یہ سخت نظم و ضبط میں بدل جاتا ہے جو ثابت شدہ علم معرفت کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ یہ عمل ایک متعین شدہ عقیدے کی تشکیل کی ایک ناگزیر ابتدا ہوتا ہے۔ ارتقاء کا یہ آخری عمل بغداد میں ظہور پذیر ہوا۔ اس طرح بغداد صوفیت کا سب سے اہم مرکز بن گیا جس طرح کہ وہ ادب، مذہب، فقہ اور فلسفے کا سب سے اہم مرکز تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عباسی دربار میں تھوڑے عرصے تک رواداری پر مبنی عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان ہونے والے مناظروں اور افلاطون، ارسطو اور دوسرے یونانی فلسفیوں کے عربی تراجم نے بھی فی تحریک کی تبدیلی میں ایک اہم کردار انجام دیا۔ جیسے جیسے عقیدے اور فرقہ بازی کی جنگ شدید ہوتی گئی تعلیم یافتہ اور

مذہبی ذہنوں پر توحید کے عقیدے کے اثرات بڑھتے گئے لہٰذا یہ کوئی حیران کن بات نہیں کہ صوفیوں نے بھی مذہب اسلام میں اس نکتے کے اپنے مفہوم نکالے۔ لیکن یہ وہ نکات ہیں جو ہماری کتاب کے دائرہ کار سے باہر ہیں۔

صف اول کے صوفیوں میں سب سے پہلا صوفی حارث بن اسد محاسبی ہے اس کی محفوظ شدہ تحریریں اس نوعیت کی ہیں کہ انہوں نے آئندہ کے افکار کو ایک خاص شکل دینے کے لئے بڑی حد تک ایک سانچے کا کردار انجام دیا ہے۔ محاسبی (165ھ/781ء) میں بصرہ میں پیدا ہوا۔ اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں وہ بغداد آ گیا۔ عباسی سلطنت کے اس دارالحکومت میں وہ (243ھ 837ء) میں فوت ہوا۔ وہ احادیث کا ایک بے حد شوقین طالب علم تھا۔ اس نے اپنی تعلیمات کو رسالت کی سند عطا کرنے کے لئے بے حد احتیاط سے کام لیا ہے لیکن کمزور روائتیں استعمال کرنے کی وجہ سے امام احمد بن حنبل نے اس کی مذمت کی۔ چنانچہ وہ کچھ عرصے کے لئے بصرہ سے فرار ہو گیا۔ اس کے شاگردوں میں سے ایک مشہور شاگرد حضرت جنید بغدادی ہیں۔ انہوں نے اپنے اور استاد کے درمیان پائے جانے والے تعلقات کے بارے میں چشم کشا تفصیل دی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''حارث بن اسد محاسبی ان کے گھر آیا کرتا تھا اور انہیں اپنے ساتھ چلنے کو کہتا تھا۔ وہ کہتے کیا تم مجھے تنہائی اور روحانی گوشہ عافیت سے نکال کر شاہراہوں اور پرکشش اشیاء کی طرف لے جاؤ گے حالانکہ میں ہوس پیدا کرنے والی اشیاء کو دیکھوں۔ وہ کہتا تھا میرے ساتھ آؤ۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ پھر ہم کسی جگہ چلے جاتے تھے۔ وہ وہاں بیٹھ جاتا اور کہتا مجھ سے سوال کرو۔ میں کہتا میرے پاس کوئی سوال نہیں۔ وہ کہتا تمہارے ذہن میں جو بھی آ رہا ہے وہ پوچھو۔ پھر میرے ذہن میں سوالات ابلنے لگتے۔ میں سوال کرتا اور وہ فوراً ہی جواب دیتا۔ پھر وہ اپنی رہائش گاہ پر جاتا اور ان کو قلم بند کرتا۔''

یہاں پر ایک ایسے صوفی استاد کا خاکہ ہمارے سامنے ہے جو اپنے دور کے دوسرے عالموں کی طرح مصروف کار ہے اور اپنے شاگرد کے سوالوں کے جوابات ترتیب دے کر اپنے کام کو پایہ تکمیل پہنچا رہا ہے۔ محاسبی کی کتابوں کا انداز خاص طور پر اس کی شاہکار کتاب ''الرعایۃ لحقوق اللہ'' کا اس نوعیت کا ہے۔ محاسبی کی زیادہ تر کتابوں کا موضوع ذاتی نظم و ضبط سے متعلق ہے۔ اس لئے اس کا نام لفظ ''محاسبہ'' سے خاص طور پر منسلک کیا جاتا ہے۔ امام غزالی (وفات 505ھ/1111ء)

کی تصنیف احیاء العلوم پر اس کی تصانیف خاص طور پر اس کی تصنیف "الریا" کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ اس کی کتاب "الوصایا" یا "الفصائع" ایسے وعظوں کا مجموعہ ہے جو عارفانہ موضوعات پر دیئے گئے تھے۔ اس کتاب کا تعارف سوانح حیات کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ امام غزالی جب اپنی مشہور تصنیف "المنقد من الدلال" لکھ رہے تھے تو اس وقت غالباً یہ کتاب ان کے ذہن میں تھی۔ الوصایا کے غیر طبع شدہ مسودے کے کچھ اقتباسات سے آپ کو اس کی نوعیت کا اندازہ ہو جائے گا:

"ہمارے دور میں یہ ہو رہا ہے کہ ہمارا معاشرہ ستر سے زیادہ فرقوں میں بٹ چکا ہے۔ ان میں سے صرف ایک فرقے کی بخشش ہو گی جبکہ بقیہ کے بارے میں اللہ بہتر جانتا ہے۔ میں نے اس بات پر غور کرنا ایک لمحے کے لئے بھی موقوف نہیں کیا کہ ہمارا معاشرہ اس قدر اختلاف کا شکار کیوں ہے اور یہ بھی تلاش کیا ہے کہ سیدھا اور سچا راستہ کون سا ہے۔ میں نے نظریاتی اور عملی دونوں قسم کی جستجو کی ہے اور آنے والی دنیا کے لئے رہنمائی حاصل کرنے کے لئے مذہبی علماء کی طرف دیکھا ہے۔ اس کے علاوہ میں نے اللہ سے متعلق عقیدے کا بھی بہت مطالعہ کیا ہے اور اس سلسلے میں فقہاء کی تشریحات بھی پڑھی ہیں۔ مختلف قسم کے معاشروں میں حالت زار پر اور ان کے مختلف قسم کے عقیدوں پر بھی غور کیا ہے۔ اس میں سے میں نے اس قدر سمجھا ہے جس قدر میری قسمت میں لکھا تھا۔ میں نے یہ دیکھا ہے کہ ان کے درمیان پایا جانے والا اختلاف سمندر کی طرح گہرا ہے جس میں بہت سے ڈوب چکے ہیں۔ صرف ایک چھوٹا سا گروہ بچا ہے۔ ہر گروہ کا یہ دعویٰ ہے کہ نجات کا راستہ صرف ان کے پاس ہے اور جس نے ان سے اختلاف کیا وہ تباہ ہو جائے گا۔ میں نے انسانوں کے مختلف سلسلوں کا مطالعہ کیا کچھ ایسے ہیں جو آنے والی دنیا کی نوعیت سے واقف ہیں اور اسے ترجیح دیتے ہیں۔ ایسے انسان بہت مشکل سے ملتے ہیں اور بہت ہی قیمتی ہوتے ہیں۔ کچھ یہ سب کچھ نہیں جانتے۔ ان سے دور رہنا اچھا ہے۔ کچھ لوگ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ یہ سب کچھ جانتے ہیں لیکن انہیں اس دنیا سے محبت ہوتی ہے اور وہ اسے ترجیح دیتے ہیں۔ کچھ لوگوں کے پاس دوسری دنیا کا مبہم قسم کا علم ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے وہ دنیا میں عزت اور سرفرازی چاہتے ہیں یعنی وہ دین کے ذریعے دنیا چاہتے ہیں۔ کچھ لوگوں کے پاس علم ہوتا ہے لیکن وہ اسے سمجھ نہیں پاتے۔ کچھ اچھے ہونے کا تاثر دیتے ہیں یا اچھے لوگوں جیسے بننا چاہتے ہیں لیکن ان میں اس کی طاقت نہیں ہوتی۔ ان کے علم میں سرایت کرنے کی قوت نہیں ہوتی۔ انہوں نے جو سمجھا ہے اس پر

اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ کچھ لوگ ذہن و شعور کے مالک ہوتے ہیں لیکن ان کے اندر تقویٰ نہیں ہوتا۔ کچھ لوگ پوشیدہ طور پر اپنی خواہشات سے مصالحت کر لیتے ہیں کیونکہ انہیں دنیا کی طلب ہوتی ہے۔ وہ لوگوں کے حاکم بننا چاہتے ہیں۔ کچھ لوگ انسانی شکل میں شیطان ہوتے ہیں وہ آخرت سے منہ موڑ لیتے ہیں اور دنیا کی جانب عالم دیوانگی میں لپکتے ہیں۔ اس کو سمیٹ لینے کی ہوس ہوتی ہے اس میں زیادتی کی خواہش ہوتی ہے۔ یہ زندہ ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں مر چکے ہوتے ہیں۔ ان کے لئے نیکی برائی اور برائی نیکی ہوتی ہے۔ ان مختلف اقسام کے لوگوں میں مجھے اپنے ہدف کی تلاش تھی لیکن میں اسے نہ پا سکا۔ پھر میں نے ان لوگوں سے رہنمائی چاہی جن کو صحیح رہنمائی مل چکی تھی تاکہ مجھے سچائی، راستبازی اور رہنمائی مل سکے۔ میں نے رہنمائی کے لئے علم حاصل کیا۔ طویل اور گہرا غور و خوض کیا۔ پھر مجھے اللہ کی کتاب، نبی کی سنت اور ایمان والوں کے اجماع سے معلوم ہوا کہ خواہشات کی موجودگی میں صحیح راستہ نظر نہیں آتا۔ آدمی سچائی سے دور ہو جاتا ہے اور تاریکی میں پڑا رہتا ہے۔ لہٰذا میں نے اپنے دل سے خواہشات کو بے دخل کرنا شروع کیا۔ جہاں معاشرے میں اختلاف تھا میں وہاں رک گیا اور اس گروہ کی تلاش ایک جذبے کے ساتھ شروع کر دی جو راہ نجات پر تھا اور ان فرقوں سے بچنے لگا تباہی جن کا مقدر تھی کیونکہ مجھے خوف تھا کہ میں روشنی پانے سے پہلے ہی نہ مر جاؤں۔ میں نے صدق دل سے راہ نجات کی تلاش جاری رکھی اور اللہ کی کتاب پر ایمان والوں کے اجماع سے مجھے معلوم ہوا کہ نجات کا راستہ خوف الٰہی میں، اللہ کے احکامات کو ماننے، جس کی اجازت دی گئی ہے اس سے اور جس کی اجازت نہیں دی گئی ہے اس سے بچنے، اللہ کی سچی اطاعت اور حضور کے نمونے کی پیروی کرنے میں ہے۔ لہٰذا میں نے یہ کوشش کی کہ اللہ کے احکامات، حضور کی سنت اور ولیوں کے طرز عمل کے بارے میں معلومات حاصل کروں۔ اس سلسلے میں، میں نے یہ پایا کہ یہاں اختلاف بھی ہے اور اتفاق بھی۔ لیکن اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ جو اللہ سے واقف ہیں ان کے یہاں اللہ کے احکامات کو ماننے اور سنت رسول پر چلنے کا مقصد اللہ کی رضا کو حاصل کرنا ہے۔ لہٰذا میں نے معاشرے میں ایسے لوگوں کو تلاش کیا تاکہ میں ان کے نقش قدم پر چل سکوں اور ان سے علم حاصل کر سکوں۔ میں نے یہ پایا کہ ایسے لوگ بہت ہی کم ہیں اور ان کا علم ایک جانب ڈال دیا گیا ہے جیسا کہ حضور نے فرمایا ہے کہ اسلام ابتدا میں ایک اجنبی کی طرح آیا اور بعد میں اجنبی ہو جائے گا۔ جب میں خوف الٰہی رکھنے والے افراد کو نہ پا سکا تو میرا مسئلہ بہت ہی سنگین ہو گیا کیونکہ مجھے یہ خوف تھا کہ میرا مسئلہ ابھی حل

نہیں ہوا اور کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے موت آجائے۔ مجھے جو دریافت کرنا تھا میں نے اس کے لئے تلاش جاری رکھی۔ اس سلسلے میں میں نے احتیاط بھی کی اور نصیحتیں بھی حاصل کیں۔ پھر اللہ رحیم و کریم نے مجھے ان سے روشناس کرایا خدا والوں تک پہنچا دیا جو خوف الٰہی اور تقویٰ کے مالک تھے آخرت کو دنیا پر ترجیح دیتے تھے۔ وہ ہمیشہ یہ نصیحت کرتے تھے کہ مشکلات اور ناساعد حالات میں صبر سے کام لوں، قسمت پر شاکر رہوں، رحمت خداوندی پر شکریہ ادا کروں۔ وہ لوگوں میں عشق الٰہی بیدار کرنا چاہتے تھے۔ وہ لوگوں کو اللہ کی رحمتوں اور مہربانیوں کی طرف متوجہ کرتے تھے۔ توبہ و راستبازی کی طرف راغب کرتے تھے۔ ان لوگوں نے اطوار کی اس انداز سے وضاحت کی ہے اور تقویٰ کے ایسے قواعد وضوابط بیان کئے ہیں کہ ان پر میرا چلنا ممکن ہے۔ مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ مذہبی طرز عمل اور سچا تقویٰ ایک سمندر ہے۔ جس میں میرے جیسے لوگ ڈوب تو جائیں گے، سفر نہیں کر سکیں گے۔ پھر اللہ نے مجھ پر علم کا دروازہ کھول دیا۔ اس میں ثبوت واضح اور فیصلے عیاں تھے۔ مجھے امید تھی کہ جو بھی اس علم تک پہنچے گا اور اسے اختیار کرے گا اسے نجات حاصل ہو جائے گی۔ چنانچہ میں نے یہ دیکھا کہ اس علم کو اپنانا اور اس کے احکامات پر عمل کرنا میرے لئے لازم ہے۔ میرا اس پر دل سے یقین تھا۔ میں نے اسے دماغ میں بٹھالیا اور اپنے عقیدے کی بنیاد بنالیا۔ میں نے اس پر اپنے تمام اعمال ترتیب دیئے اور اس کے دائرے میں متحرک ہوا۔ میں اللہ سے التجا کرتا ہوں کہ اس کی مجھ پر جو عنایات ہیں اس کا شکریہ ادا کرنے کی توفیق دے اور مجھے یہ طاقت دے کہ اس کے عطا کردہ احکامات پر چلوں۔ مجھے اپنی خامیوں کا بھی علم ہے۔ میں یہ جانتا ہوں کہ اللہ نے مجھے جو کچھ عطا کیا ہے میں اس کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔‘‘

محاسبی کی کتاب ’’التوا ہم‘‘ ایسی کتاب ہے جس میں نہایت اعلیٰ تصوراتی اور فنکارانہ انداز میں موت کی اور روز قیامت کی ہولناکیوں کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس کا اختتام ایک خوبصورت منظر کی تصویر کشی سے ہوتا ہے۔ محاسبی کے خالصتاً نئے افکار اسی کتاب میں ہیں جو عشق کے موضوع پر ہیں۔ اس کتاب کے صرف حوالے ملتے ہیں۔ اس کے مندرجہ ذیل اقتباسات سے آپ کو اس کی لطافت اور جدت کا اندازہ ہو جائے گا:

’’سوال: اور حقیقی عشق کیا ہے؟

جواب: یہ عقیدے سے عشق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کے عشق کی قسم کھائی ہے۔ وہ کہتا ہے ’’اور جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں وہ اللہ سے بے حد عشق کرتے ہیں۔ شوق کا نور عشق کا نور

ہے اس کی کثرت چاہت کے نور سے ہے۔ دل میں شوق چاہت کے نور سے پیدا ہوتا ہے۔ اللہ جب اپنے بندے کے دل میں یہ چراغ روشن کر دیتا ہے تو یہ اس کے دل کے کونوں میں شدت سے جلتا رہتا ہے حتیٰ کہ سارا دل جگمگا اٹھتا ہے پھر یہ چراغ کبھی نہیں بجھتا۔ یہ صرف اس وقت بجھتا ہے جب بندہ اپنے اعمال سے مطمئن ہونے لگتا ہے۔ جب وہ اپنے آپ کو شیطان سے محفوظ سمجھنے لگتا ہے تو شیطان اعمال کو اس کے سامنے یوں پیش کرتا ہے جیسے وہ اللہ کی رحمت سے محروم نہیں ہوا ہے یوں دل میں غرور جگہ کرتا ہے روح تکبر میں مست ہو جاتی ہے اور بندہ اللہ کی ناراضگی کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ بالکل درست ہے کہ جب اللہ کسی کو عشق الٰہی سے نوازتا ہے اور وہ اپنی روح مستی کی نذر کر دیتا ہے تو وہ اللہ کی رحمت سے محروم ہو جاتا ہے، تباہی کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایک نیک عورت نے ایک دفعہ کہا جو لوگ اللہ سے ملاقات کے خواہش مند ہیں اگر اللہ ان پر کیفیت طاری کر دے پھر یہ ان سے چھن جائے تو ان سے ان کا ابدی کیف جاتا رہتا ہے۔ اس سے پوچھا گیا وہ کیفیت کیا ہے تو اس نے جواب دیا کہ زیادہ نیکی کو کم سمجھنا اور اس بات پر حیران ہونا کہ عنایات الٰہی کا سبب کیا ہے۔ ایک نیک شخص سے یہ پوچھا گیا کہ شوق الٰہی سے کیا مراد ہے؟ اس کا قلب پر کیا اثر ہوتا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ کیا یہ بات اس جیسے شخص سے پوچھی گئی ہے۔ اس نے مزید یہ کہا کہ میرے قلب میں کوئی ایسی شے نہیں جو اس پر اثر انداز ہو۔ ایسا صرف روح کی موجودگی میں ہوتا ہے اگر روح حاضر ہو اور دل قرب الٰہی سے معمور ہو تو لذت تردد میں بدل جاتی ہے۔ کسی نے دریافت کیا عاشق کے لئے کیا بہتر ہے خوف یا شوق؟ اس نے جواب دیا کہ یہ ایسا سوال ہے جس کا جواب نہیں دیا جا سکتا، روح کسی بھی چیز کو خراب کئے بغیر نہیں چھوڑتی‘‘۔ اس موضوع پر عبدالعزیز بن عبداللہ نے جو اشعار پیش کئے ہیں ان کا ترجمہ یہ ہے:

’’سب سے اچھا یہ ہے کہ انسان کا نور سنجیدہ اور
خوفزدہ رہنے دیا جائے۔
پھر وہ دعا میں اللہ کی طرف رجوع کرے گا
اطاعت گزار اور پاک باز دل
صرف عشق میں ہی پر سکون رہ سکتا ہے۔
لیکن جو لوگ نیک اور عاقل ہیں
وہ اللہ کی طرف نگاہ شوق سے دیکھتے ہیں۔‘‘

یہی سبب ہے کہ یہ کہا جاتا ہے کہ عشق شوق ہے کیونکہ معشوق کے علاوہ کسی اور کے لئے شوق کا اظہار نہیں کیا جا سکتا۔ جب شوق حقیقی عشق کی ایک شاخ ہو تو عشق اور شوق میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ اس طرح یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عاشق کی گفتگو اور جسمانی حالت سے عشق کا پتہ چل جاتا ہے اسی طرح جس طرح معشوق کے ساتھ مسلسل ملاقاتوں میں معشوق کی طرف سے ہونے والی عنایات سے یہ پتہ چلتا ہے۔ اللہ جب دوست بنا لیتا ہے تو وہ ان پر اعلیٰ قسم کی عنایات کرتا ہے جب ان عنایات کا انکشاف ہونے لگتا ہے تو وہ لوگ اللہ (عشق الٰہی) کے لئے مشہور ہو جاتے ہیں۔ عشق کی نظر آنے والی کوئی صورت یا شکل نہیں ہوتی۔ عاشق کا پتہ اس کی حالت سے چلتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے جو کچھ اللہ اس کی زبان سے جاری کراتا ہے جو کچھ اس کے دل پر منکشف کرتا ہے۔ جب دل پر اللہ کی عنایات مستقل نوعیت کی ہو جاتی ہیں تو پھر زبان اس کا اظہار کرتی ہے۔ اللہ کی عنایات ان دلوں پر ہوتی ہیں جو اللہ سے عشق کرتے ہیں۔ عشق الٰہی کی سب سے واضح علامت زرد رنگت اور مستقل استغراق ہے۔ طویل انتظار اور خود سپردگی ہے، کم اطاعت اور عمل پسندی ہے اس لئے کہ کہیں موت نہ آ جائے۔ عاشق اپنے عشق کا اسی قدر اظہار کرتا ہے۔ جس قدر اس کا قلب منور ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ کہا جاتا ہے کہ عشق الٰہی کی علامت قلب پر عنایات الٰہی کا نزول ہے۔ یہ ان پر ہوتا ہے جنہیں اللہ اپنے عشق کے لئے منتخب کر لیتا ہے۔ ایک عالم نے مندرجہ ذیل اشعار کے ذریعے اس موضوع کی جانب متوجہ کیا ہے:

"اس کے منتخب کردہ افراد چند ہی ہوتے ہیں
وہ اس سے سچا عشق کرتے ہیں
اسی طرح کے منتخب افراد دور گزشتہ میں
پائے جاتے تھے۔
یہ منتخب کردہ یا ڈھالا ہوا
ایسا ظرف ہوتا ہے
جو اس کے عشق کو وصول کرتا ہے
اور اس کی عنایات کا ثبوت دیتا ہے۔"

حضرت ذوالنون مصری (وفات 246ھ/881ء) محاسبی کے ہم عصر تھے۔ غزہ میں ان کا مزار اب بھی موجود ہے۔ ان کے سر یہ سہرا باندھا جاتا ہے کہ صوفیت میں معرفت کو انہوں نے ہی متعارف کرایا۔ لیکن یہ درست نہیں کیونکہ اس قسم کے نظریات پہلے دور کے عارفوں میں بھی ملتے ہیں۔ صوفیوں کی سوانح حیات میں جب ذوالنون مصری کا ذکر ہوتا ہے تو انہیں ایک افسانوی شخصیت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ وہ نصف عارف اور نصف کیمیا دان تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ قدیم مصری تحریروں کو پڑھ سکتے تھے اور راہبوں کی فکر اور شعور سے واقف تھے۔ بہت سی مشکوک سند رکھنے والی تحریریں ان سے منسوب کی جاتی ہیں۔ ان کی جو محفوظ شدہ نظمیں اور مناجات ہیں وہ نہ صرف ان کی سوچ کی عکاسی کرتی ہیں بلکہ ان میں وحدت الوجود کا تصور بھی ملتا ہے:

"اے اللہ میں نے جانوروں کی آوازوں، درختوں کی سرسراہٹوں، پانی کے ارتعاش، پرندوں کے نغمات، ہواؤں کی سیٹیوں، بادلوں کی گڑگڑاہٹ کو ہمیشہ اس کے علاوہ اور کسی مقصد سے کبھی نہیں سنا کہ تیری وحدانیت کی صداقت اور تیرے غیر مماثل ہونے کا ثبوت پاؤں یہ کہ تو سب پر حاوی، سب کچھ جاننے والا، سب سے زیادہ عاقل، سب سے زیادہ انصاف پسند اور سب سے زیادہ سچا ہے اور یہ کہ تجھے نہ کوئی بے دخل کرتا ہے، نہ ہی تجھ میں لاعلمی، حماقت، ناانصافی یا دروغ گوئی ہے۔ میں نے تجھ کو تیری تخلیق میں پہچانا، تیرا ثبوت تیرے کاموں میں پایا۔ اے اللہ میرا اطمینان تیرے اطمینان میں ہو۔ جس طرح باپ کو اپنے بچے سے مسرت حاصل ہوتی ہے ویسی ہی مسرت عطا کر۔ میں تجھے مضبوط ارادے اور طمانیت کے ساتھ اپنے عشق میں یاد رکھوں۔"

ذوالنون مصری اپنی شاعری میں ایک سچے عاشق کی زبان استعمال کرتے ہیں۔ یہ ویسی ہی زبان ہے جیسی رابعہ بصری نے ان سے پہلے استعمال کی تھی۔ یوں ایک ایسی روایت کی بنیاد پڑی جو بعد کے صوفی ادب کا ایک خاصہ بن گئی۔

"میں مرتا ہوں لیکن نہیں مرتی مجھ میں
تجھ سے عشق کی خوشبو
نہ ہی میرا عشق جو میرا مقصد ہے
اس سے میری روح کی تمازت کم ہوئی ہے

میری روح صرف تجھ کو پکارتی ہے
تو ہی میرا مقصد ہے
تیری عطا کردہ دولت
میرے حقیر عشق سے بہت زیادہ ہے

میں تجھ سے ہی التجا کرتا ہوں
اور تجھ میں ہی حتمی سکون تلاش کرتا ہوں
میں تیرے لئے ہی نالہ وفغان کرتا ہوں
میری فکر کے نہاں خانوں میں تو چھپا ہے

میرا مرض جتنا بھی طویل ہو اور
یہ تھکا دینے والی نقاہت
میں کسی پر اس کا اظہار نہیں کروں گا
کہ تو نے مجھ پر کیا بوجھ ڈالا ہے

صرف تجھ پر آشکار ہے
میری قلبی مشقت کا بوجھ
میرے عزیز جانتے ہیں نہ میرے ہمسائے
جام سے چھلکتا ہوا غم

میرے قلب میں ایک آگ جل رہی ہے
جو میرے جسم کے ہر حصے کو جلا رہی ہے
اس نے میری قوت، میرے قرار کو تباہ کر دیا ہے
میری تمام روح راکھ ہو گئی ہے

تو راستے کی جانب رہنمائی نہیں کرتا
مسافر اپنے بوجھ تلے تھک چکا ہے
موت کی کھائی سے بچالے
مسافر بھٹک رہا ہے

کیا تو نے روشنی کا مینار قائم نہیں کیا
ان کے لئے جنہیں سچی رہنمائی ملی
جبکہ ان کے ہاتھوں میں
اس قسم کی معمولی سی روشنی بھی نہیں تھی

آہ! مجھ پر تیری عنایت ہوتی ہے
تا کہ اس طرح تیرے حضور رہوں
اور تیری طرف سے ملنے والی راحت میں ڈوب کر
اپنی فقیری کی سختی برداشت کرسکوں۔"

وحدت الوجود کے نظریئے میں بایزید بسطامی (وفات 261ھ/875ء) نے زیادہ بے باکی کا مظاہرہ کیا۔ ان کا تعلق ایران سے تھا۔ یہ وہ پہلے مجذوب صوفی تھے جنہوں نے جوش معرفت کے پروں پر سوار اللہ کو خود اپنی روح میں تلاش کیا اور یہ نعرہ لگایا کہ "بڑائی میرے لئے ہے، میرا جلال زبردست ہے۔" ان کے یہ کلمات قدامت پرست حلقے اور ان کے اپنے صوفی بھائیوں کے لئے بدنامی اور شرمندگی کا سبب بنے۔ [illegible] کے عالم جذب میں ادا کئے گئے یہ کلمات ان کے صوفی بھائیوں کے لئے اس وقت تک شرمندگی کا سبب بنتے رہے جب تک کہ انہوں نے ان کلمات کی تشریح کا ایسا طریقہ کار دریافت نہیں کر لیا جس کی مدد سے کفریہ نظر آنے والے کلمات کفریہ نہ رہے۔ جنید بغدادی ایک بہت ہی عام فہم قسم کے ادراک اور لطافت کے حامل مفکر تھے۔ وہ مجذوب نہ تھے۔ انہوں نے بایزید کے کلمات کی تشریح نہایت ہی ذہانت سے کی۔ بایزید بسطامی وہ پہلے عارف تھے جنہوں نے معراج کے واقعے کو اپنے عارفانہ تجربات کے اظہار کے لئے استعمال کیا۔

اس انداز کو بعد میں دوسروں نے بھی اپنایا۔ وہ بیان کرتے ہیں:

"میں نے یہ دیکھا کہ میری روح آسمان کی طرف بلند ہو رہی ہے۔ اس نے کسی بھی چیز پر نہ نگاہ ڈالی نہ کسی جانب توجہ دی۔ گرچہ کہ جنت و دوزخ سامنے تھی۔ اس کے سامنے سے تمام حجاب اور اسباب ہٹا دیئے گئے تھے۔ پھر میں ایک پرندے میں تبدیل ہو گیا جس کا جسم وحدانیت پر مبنی تھا اور بازو ابدیت پر۔ میں سدرۃ المنتہیٰ کی حدود میں محو پرواز تھا حتیٰ کہ میں طہارت کی حدود میں داخل ہو گیا اور ابدیت کے میدان پر نظر ڈالی۔ میں نے وہاں وحدانیت کا شجر دیکھا۔ جب میں نے خود پر نگاہ ڈالی تو میں یہ سب کچھ خود تھا۔ میں پکار اٹھا کہ اے اللہ میں اپنی انانیت کے ساتھ تجھ تک نہیں پہنچ سکتا اور اپنی ذات سے نجات حاصل نہیں کر سکتا۔ میں کیا کروں؟ اللہ نے کہا اے بایزید تم اپنے وجود سے رہائی حاصل کرو۔ اس کے لئے میرے محبوب محمدؐ کی پیروی کرو۔ اس کے قدموں کی خاک اپنی آنکھوں میں لگاؤ اور اس کے نقش قدم پر مسلسل چلو۔"

اسی طرح کا ایک اور بیان بایزید بسطامی سے منسوب کیا جاتا ہے:

"ایک دفعہ اس نے مجھے بلند کیا، اپنے روبرو لا کھڑا کیا اور مجھ سے کہا۔ اے بایزید، یہ تیری میری مخلوق تجھے دیکھنا چاہتی ہے۔ میں نے کہا مجھے اپنی وحدت میں ضم کر کے مجھے سنوار دے۔ مجھے اپنے وجود کے لباس میں ملبوس کر دے اور مجھے اپنی وحدت تک اس قدر بلند کر کہ جب مجھے تیری مخلوق دیکھے تو یہ کہہ اٹھے کہ ہم نے تجھے دیکھ لیا اور وہ صرف تو ہو، میں نہ ہوں۔"

ہم یہاں فنا فی اللہ کی مکمل طور پر ترقی یافتہ شکل دیکھ رہے ہیں۔ بایزید بسطامی کے بعد سے یہ نظریہ صوفیت کا ایک مرکزی حصہ بن گیا "اللہ ہی سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں" وہ تبدیلی تھی جسے ظہور پذیر ہونے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ جب عارف دنیا کی اور اپنے وجود کی نفی کر دیتا ہے تو پھر وہ اللہ میں جذب ہو کر فنا فی اللہ ہو جاتا ہے۔ علم معرفت میں اس نظریئے کا ترقی پانا ایک منطقی امر تھا۔ اس نظریئے کو توحید کے قدامت پرست نظریئے کے ساتھ ضم کرنے کا سہرا بعض اوقات احمد بن عیسیٰ خراز (وفات 286ھ/899ء) کے سر باندھا جاتا ہے۔ اس کی تصانیف میں سے "کتاب الصدق" وہ واحد تصنیف ہے جو زمانے کی دست برد سے بچی ہے لیکن اس نظریئے کے حوالے سے اس تصنیف کو کوئی بلند مقام حاصل نہیں۔ پھر بھی یہ چھوٹی سی کتاب عارفوں کے لئے بہت دلچسپ اور اہم ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ تمام انبیاء نے وہ زندگی اپنائی ہے جسے صوفی اپنانا چاہتے ہیں۔ اس کتاب کی انتہا وہ حصہ ہے جہاں نہایت

فصاحت اور یقین کے ساتھ قرب الٰہی کی تفصیل بیان کی گئی ہے:

"یہ معلوم ہونا چاہیے کہ سالک جو خشیت الٰہی کی وجہ سے اپنے تمام اعمال میں حق کا متلاشی ہوتا ہے کی نگاہ اپنے قلب پر، اپنے مقصد پر اور اپنے اعضاء پر ہوتی ہے اور ان کو جانچتا رہتا ہے۔ وہ اپنے مقصد پر ساری توجہ مرکوز کرتا ہے کہ کہیں کوئی غیر متعلق چیز اس پر اثر انداز نہ ہو جائے۔ وہ لاپرواہی سے گھبراتا ہے کہ کہیں اس کے بیرونی اعضاء سے سرزد ہونے والے اعمال میں کمی نہ رہ جائے اور اس کے قلب میں داخل ہونے والے دوسرے مقاصد اس کے واحد مقصد پر حاوی نہ آجائیں۔ وہ اپنے آپ کو تمام تحریکات سے آزاد کرا لیتا ہے گرچہ کہ وہ درست اور صحیح ہوتی ہیں۔ کیونکہ قلب پر یہ شدید جذبہ حاوی ہوتا ہے کہ ذکر مسلسل جاری رہے اور مقصد بھی سامنے رہے۔ جب وہ اس طرح مصروف رہتا ہے تو اس کا قلب جلد ہی آگاہ ہو جاتا ہے، اس کے خیالات واضح ہو جاتے ہیں، قلب میں روشنی آجاتی ہے، وہ اللہ کے قریب ہو جاتا ہے اور اللہ اس کے قلب اور مقصد دونوں پر تسلط حاصل کر لیتا ہے۔ پھر وہ گویا ہوتا ہے اور اس کا قلب اللہ کی یاد پر لپکتا ہے۔ عشق الٰہی اس کے دل کی گہرائی میں چھپ جاتا ہے، ذہن کو دولخت کر دیتا ہے اور اسے کبھی چھوڑتا نہیں۔ پھر اس کی روح سرشاری کی حالت میں اللہ سے پوشیدہ طور پر محو کلام ہوتی ہے، پرجوش مشاہدے اور گفتگو میں مصروف رہتی ہے۔ وہ اس کیفیت میں سوتا، جاگتا، کھاتا، پیتا، چلتا پھرتا ہے۔ دل جب اللہ کا قرب حاصل کر لیتا ہے تو پھر ہر شے پر حاوی آجاتا ہے خواہ وہ اندرونی معاملات ہوں یا بیرونی اعضاء کی تحریکات۔ اس کے بعد آنے جانے، لینے دینے، ہر معاملے میں اس کے ذہن میں ایک ہی مقصد کارفرما ہوتا ہے اور وہ مقصد ہوتا ہے اللہ کا قرب اور عشق الٰہی۔"

جہاں تک تحریری سند موجود ہے اس کے مطابق فنا کے عقیدے کی ترقی و ترویج کا سہرا جنید بغدادی (وفات 498ھ/910ء) کے سر بندھتا ہے جو محاسبی کے شاگرد تھے۔ انہیں طریقت کے سلسلے کا امام مانا جاتا ہے۔ انہیں ابتدائی زمانے کے صوفیوں میں سب سے زیادہ منفرد اور گہرا شعور رکھنے والا صوفی تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کے متقدمین اور ہم عصروں کے سلسلے میں ہم یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ وہ اپنی ذکاوت حس کی خیرہ کن چمک کی مدد سے کبھی کبھی روحانیت کی چوٹی پر نظر آتے ہیں جبکہ جنید بغدادی تجزیاتی فکر کی چوٹی پر مستقل براجمان نظر آتے ہیں۔ عارفانہ فکر کا پورا میدان ان کی حدود نگاہ میں سمٹا ہوا ہوتا ہے اور ایک ماہر فنکار کی طرح وہ تمام منظر کو اپنے واحد کینوس میں سموئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے خطوط کا اور مختصر مضامین کا جو سلسلہ سامنے آیا ہے پیش کیا ہے، جس میں مزید اضافہ نہیں کیا جا سکا۔ ہاں اس کی تشریحات ہوتی رہتی ہیں۔

جنید نے توحید کی جو تعریف کی ہے وہ کلاسکی نوعیت کی ہے۔ بعد میں آنے والے مصنفین اس کا حوالہ دیتے رہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ توحید سے مراد دائمی وجود کا اس وجود سے جدا ہونا ہے جو زمانے میں وجود میں آیا۔ ان کا نقطہ آغاز وہ دائمی عہد ہے جو انسان نے اللہ سے کیا تھا اور جس کا حوالہ صوفیوں کے مطابق قرآن خود دیتا ہے۔ ان کی نظر میں تمام تاریخ اس جدوجہد کا نام ہے جو انسان اپنے دائمی عہد کو پورا کرنے کے لئے اور اپنی موجودہ حالت سے اپنی پہلی حالت میں لوٹنے کے لئے کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں عہد الست میں انسان اور اللہ کے درمیان جو مکالمہ ہوا تھا اس کے بارے میں جنید لکھتے ہیں کہ اللہ اپنے کلام میں فرماتا ہے کہ اس نے انسانوں سے گفتگو کی جبکہ وہ ابھی وجود میں نہیں آئے تھے اور اللہ کے پاس تھے۔ یہ پہلا وجود وہ وجود نہیں جس کا اللہ کی تخلیقات کے حوالے سے ذکر کیا جاتا ہے۔ یہ وہ وجود ہے جس کا علم صرف اللہ کو ہے۔ یہ وہ وجود ہے جسے عدم وجود کی حالت کہہ سکتے ہیں۔ اس وقت انہیں اس دنیا میں اپنے آئندہ کے وجود کا علم نہیں تھا۔ یہ وہ وجود ہے جو وقت کی حدود سے ماوراء ہوتا ہے۔ ایک دوسری جگہ وہ لکھتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ نے بیان کیا ہے کہ وہ ان سے اس وقت مخاطب ہوا جب ان کا باقاعدہ وجود عمل میں نہیں آیا تھا۔ ایسا اس لئے ممکن ہے کہ اللہ انہیں ان کے روحانی وجود میں بھی دیکھ سکتا ہے۔ اپنے روحانی وجود میں انسان اللہ سے روحانی طور پر واقف ہوتا ہے گرچہ کہ اسے اپنے وجود کا علم نہیں ہوتا۔

جنید کے مطابق انسان کا کائنات میں علیحدہ اور انفرادی وجود اللہ کی اپنی مرضی کی وجہ سے ہے اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اس انسانی وجود پر اپنے وجود کے نزول کے ذریعے حاوی آجائے۔ آنحضرت کی مشہور حدیث کہ جب اللہ انسان سے محبت کرنے لگتا ہے تو وہ اس کے کان بن جاتا ہے جس سے وہ سنتا ہے وغیرہ وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ ہے جو انسان کو قوت دیتا ہے اور اسے اس قابل بناتا ہے کہ وہ اس کو حاصل کر سکے۔ وہ اس کی رہنمائی کرتا ہے اور اسے وہ سمجھ دیتا ہے کہ پھر وہ وہی کچھ چاہتا ہے جو اللہ چاہتا ہے صرف اس لئے کہ وہ تقویٰ حاصل کر سکے اور حق پر ہو۔ یوں اللہ کی طرف سے ایک تمغہ ہوتا ہے اور یہ صرف اسی کے لئے ہوتا ہے۔ اس تمام سلسلے کا ریاضت کرنے والے کی اپنی سعی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ سب کچھ اس میں انہوں نے بہت ہی لطیف، گہری اور پر مغز زبان میں اسلامی مذہبی عقائد کا ایسا مکمل نظام وداس کے اندر سے جنم نہیں لیتا۔

وہ صوفیت کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تمہارے وجود کو

تمہارے اندر فنا کر دے اور اپنے اندر حیات دے دے۔ وجود کا اس طرح مٹنا جنید کے نزدیک فنا ہے اور اللہ میں جذب ہو جانا بقا ہے۔ اپنے وجود سے گزر جانے کے بعد عارف درحقیقت انفرادی طور پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ وہ انفرادیت جو کہ اللہ کا انعام ہے تکمیل کو پہنچتی ہے، ہجرت کرتی ہے اور اللہ کے ذریعے اللہ کے اندر جذب ہو جاتی ہے۔ حیات انسان کے لئے آزمائش اور مصیبت ہے کیونکہ انسان اللہ سے جدا ہوتا ہے اور درمیان میں پردہ ہوتا ہے۔ جنید ایک عاشق کی مثال دیتے ہیں جو اپنے محبوب سے ملنے کا مشتاق ہوتا ہے لیکن جدائی کا یہ عذاب اس کے لئے بے انتہا مسرت کا ذریعہ بھی ہوتا ہے بطور عارف اللہ میں فنا ہو کر وہ بے حد کیف حاصل کرتا ہے۔ اپنے اندر جذب کرنے کے بعد اللہ اسے اپنے سے جدا کر دیتا ہے اور اس کی انفرادیت لوٹا دیتا ہے جب انسان اللہ میں جذب ہو جاتا ہے تو وہ اس دنیا میں نہیں ہوتا۔ جب وہ اللہ سے جدا ہوتا ہے تو پھر اس دنیا میں ہوتا ہے۔ وہ روحیں جو اللہ سے آشنا ہو چکی ہوتی ہیں وہ اللہ کے وجود کی جگہ سرسبز سبزہ زاروں، خوبصورت محلوں ہر وتازہ باغس اور اس مادی دنیا کی ہر خوبصورت شے سے تسکین حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہیں کیونکہ یہ سب بھی اللہ کی تخلیقات ہوتی ہیں۔ حضرت جنید نے انسان کی اس یکجائی اور جدائی کو ایک نظم میں یوں بیان کیا ہے:

"اے رب مجھے اب معلوم ہوا ہے کہ\
میرے دل میں کیا ہے\
پوشیدہ طور پر اور دنیا سے چھپ کر\
میری زبان نے محبوب سے باتیں کی ہیں\
ایک طرح سے ہم\
یکجا اور ایک ہیں\
جبکہ دوسری طرح سے\
جدائی ہماری دائمی حالت ہے

میری گہری نگاہ سے گرچہ کہ\
تیری ہیبت نے تیرے چہرے کو چھپا رکھا ہے\
جبکہ حالت وجد اور کیف میں\
انتہائی گہرائی میں میں تیرا لمس محسوس کرتا ہوں"

(۱)

موجودہ دور میں تصوف

کمزوریوں کی نشاندہی اور بہتر حکمت عملی کی ضرورت

زیرِ نظر مضمون میں موجودہ دور کے اہل تصوف کی بعض اہم کمزوریوں کی نشاندہی کی گئی ہے، جس کی وجہ سے جدید انسان کے لئے تصوف کی حقیقت تک رسائی دشوار ہوگئی ہے اور تصوف سے وابستہ افراد کی ذہنی سطح بھی عمومی طور پر جدید دور کے انسان کی ذہنی سطح سے بالکل مختلف ہوگئی ہے۔

ساتھ ساتھ مضمون میں عہد جدید کے چیلنج سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اہل تصوف کو ان کی ذمہ داریاں بھی یاد دلائی گئی ہیں۔ (محمد موسیٰ بھٹو)

بدقسمتی سے آج تصوف یا تو کشف وکرامات اور دوسری دنیا کے مشاہدات کا نام بن کر رہ گیا ہے کہ یہ چیزیں جزوی نہیں، مقصود کے درجہ میں شامل ہوگئی ہیں۔ اللہ کی یاد اور ذکر سے زیادہ اہمیت کشف وکرامات کی ہوگئی ہے یا پھر تصوف کا مطلب بزرگوں کے نام پر ان کی اولاد اور خاندان کے افراد کا دنیاوی مستقبل تابناک بنانا ہے۔

عام لوگوں کا تصوف یہ ہے کہ اللہ کی صفات میں بزرگوں کو شامل کرکے، انہی سے مانگنے اور انہی کو حاجات کی تکمیل کا ذریعہ سمجھنے، بزرگوں کے نام کا وظیفہ پڑھنے، عقائد واخلاق کو درست کرنے کی بجائے اپنی ساری بے عملی کے باوجود آخرت میں بزرگوں کی طرف سے نجات کی ضمانت کا یقین رکھنا وغیرہ ہے۔

آج بعض صحیح تصوف کے دعویداروں کے ہاں بھی اللہ سے زیادہ بزرگوں کی

شانِ عظمت اور ان کی تعریف پر زیادہ زور ہے اور فنا فی الشیخ کے نام پر شخصیت پرستی کا سلسلہ جاری ہے، جس سے مخلوق خدا کے عقائد میں بگاڑ پیدا ہوگیا ہے۔

صحیح تصوف تو نام ہے ان تعبداللہ کانک تراہ کا، یعنی اللہ کی عبادت اس طرح کرو، گویا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو۔ یہ تصوف بھی اسلام کا صرف ایک شعبہ ہے۔ اس کا سب سے بڑا شعبہ تو عقائد سے تعلق رکھتا ہے، جس میں اللہ کی وحدانیت پر یقین، رسالت پر یقین اور آخرت پر یقین شامل ہے، اس کا دوسرا بڑا شعبہ زندگی کے ہر معاملہ میں اسلامی شریعت اور اسلامی احکام وتعلیمات پر عمل پیرا ہونا ہے۔

بزرگان دین اور اولیاء کرام کی تعلیمات دراصل دستور العمل ہے، اس بات کا کہ زندگی، اللہ کی مرضی کے مطابق کس طرح گزاری جائے اور اللہ کی محبت کے دعویداروں کے لئے دنیا سے بے نیازی، نفس پرستی سے بچاؤ اور اخلاص وبے نفسی پیدا کرنے اور صبغۃ اللہ کو غالب کرنے کے لئے لائحہ عمل کیا ہونا چاہئے۔

اولیاء کرام کی صحیح تعلیمات اسلام کے ان تینوں شعبوں پر حاوی ہے، جو حدیث جبرل میں بیان کی گئی ہے، جس کا اوپر ذکر کیا گیا کہ عقائد کی تصحیح، اسلامی احکامات پر عمل پیرا ہونا اور عبادت کے وقت اللہ کے استحضار کا غلبہ ہونا۔ اسلام کے ان تینوں شعبوں میں سے اگر ایک شعبہ اور حصہ بھی پامال ہوگا تو فرد وافراد کی اسلامیت خطرہ میں ہوگی اور نجات کی امید رکھنا عبث ہے۔ بزرگانِ دین نے ہمیشہ اسلام کے ان تینوں شعبوں میں توازن قائم رکھنے اور تصوف واحسان کے ساتھ عقائد کی صحت اور اسلامی احکامات پر عمل پیرا ہونے کا خصوصی اہتمام کیا ہے۔

اہل اللہ کا زیادہ زور صحبت اور ذکر وفکر پر اس لئے رہا ہے کہ صحبت اور ذکر وفکر سے دنیا، مادیت اور نفسی قوتوں کے پیدا کردہ حجابات دور ہوتے ہیں اور اللہ کے ساتھ والہانہ محبت پیدا ہوتی ہے، اس محبت کے زیر اثر زندگی کا ہر پہلو بدلنے لگتا ہے۔

جیسا عرض کیا گیا کہ اہل اللہ سے محبت پر زور دینے کا بنیادی سبب یہی ہے کہ ان کی صحبت اور محبت کی وجہ سے زندگی میں فیصلہ کن انقلاب برپا ہونے لگتا ہے، ساری کوششوں کے باوجود جن بُری عادتوں سے نجات کی صورت پیدا نہیں ہو پاتی، اہل اللہ سے محبت اور ان کی صحبت کے نتیجہ میں ان عادتوں سے گلو خلاصی اور بہتر اور پاکیزہ اخلاق وعادتوں کی استعداد آہستہ آہستہ از خود پیدا ہونا شروع ہوجاتی ہے، ان کی صحبت کا یہ ایسا فیض ہے، جس کا انکار ممکن نہیں، لیکن ان کے اس فیض کا بنیادی سبب بھی یہی ہے کہ ذکر وفکر کے شدید مجاہدوں کے ذریعے نفسی قوتوں کو پامال کرکے، وہ رضا بالقضا کے مقام پر فائز ہوگئے تھے، ان کی صحبت کی یہ برکت محض اللہ کے لئے ان کی فنائیت کا نتیجہ ہے، جو ان پر اللہ کا فیضان ہے، لیکن اسی کی وجہ سے بزرگوں کو خدائی صفات میں شامل کرنا، انہیں حاضر ناظر سمجھنا، ان کے نام کا وظیفہ پڑھنا وغیرہ یہ چیزیں فرد کو شرک کے قریب کردیتی ہیں۔

سارے مذاہب میں شرک کی ملاوٹ اسی طرح ہوئی ہے، بدھ مت، ہندومت، یہودیت اور عیسائیت وغیرہ میں شرک کا آغاز شخصیت پرستی کے انہی آداب سے ہی ہوا ہے، سورۃ نوح میں حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کی طرف سے ود، سواع، یغوث، یعوق و نسر کو معبود بنانے کا جو ذکر ہے، ان کے یہ معبود دراصل بزرگ اور اہل اللہ تھے، جو حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیانی عرصہ میں پیدا ہوئے تھے، ان کی وفات کے بعد شیطان کے اغوا سے قوم نے ان کی تصویریں بطور یادگار بنا کر کھڑی کرلی تھیں، آہستہ آہستہ ان کے مجسمے بنا کر ان کی عبادت کرنے تک نوبت پہنچی، اس طرح بزرگوں کی شخصیت پرستی کا تصور ان کے لئے گمراہی اور عذاب شدید کا ذریعہ بنا اور اللہ کے پیغمبر کی نو ساڑھے نو سو سالہ کوششوں کے باوجود شخصیتوں کے مجسموں کی پرستش سے وہ دستبردار ہونے کے لئے تیار نہ ہوئے۔

ہمارے ہاں بعض خانقاہوں میں فنا فی الشیخ کے تصور کو بنیادی اصول کے طور پر اختیار کیا گیا ہے اور اس پر سب سے زیادہ زور دیا جارہا ہے، ایسے بزرگوں کو دیکھنا چاہئے کہ اس کے نتائج کہیں بزرگوں کی شخصیت پرستی کی صورت میں تو ظاہر نہیں ہورہے ہیں۔

اہل اللہ کی خانقاہیں ہمیشہ سادگی، درویشی، دنیا سے بے نیازی، شان استغنیٰ اور فقر کا نمونہ رہی ہیں۔ لیکن اب اکثر ان خانقاہوں کی جو صورتحال ہے، وہ دل دکھانے والی ہے۔ جاہ اور مال کے معاملہ میں اہل دنیا اور ان خانقاہوں کے مسند نشینوں کے درمیاں کوئی خاص فرق نہ رہا ہے۔ سرمائیدار اور زمیندار بھی بنگلوں میں رہتے ہیں اور بڑی بڑی گاڑیاں رکھتے ہیں اور خادموں کی فوج ظفر موج رکھتے ہیں، دنیا کے مزید ڈھیر جمع کرنے کے ارمان میں رہتے ہیں اور شان وماں کے سارے انتظامات کرتے ہیں، یہی کچھ ہماری خانقاہوں کے موجودہ بہت سارے علمبردار بھی کرتے ہیں۔ آخر ان میں اور اُن میں فرق ہی کیا رہا ہے؟ ظاہری اعتبار سے وہ بھی دنیا پر فریفتہ ہیں تو یہ بھی دنیاوی شان وشوکت کا انتظام رکھتے ہیں۔ دل کی حالت تو اللہ کو معلوم ہے، لیکن بظاہر تو دونوں کے درمیاں کوئی خاص فرق باقی نہ رہا ہے۔

خانقاہوں کو دنیاوی خوبصورتی، دنیاوی سجاوٹ، ظاہری ٹھاٹھ باٹھ، بنگلوں، جائداد اور بڑی بڑی گاڑیوں کا ذریعہ بنانا اور مسند نشینوں کی معاشرت ومعیشت کا بلند ہونا، یہ خانقاہی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ اس لئے کہ ہماری خانقاہوں کی امتیازی شان ہی یہی رہی ہے کہ وہ زہد ودرویشی، فقر اور دنیا سے استغنیٰ کا زندہ نمونہ رہی ہیں اور مریدوں میں ان صفات کو فروغ پذیر دینے کا ذریعہ بھی۔

شاعر اسلام اقبال نے اپنے دور میں خانقاہوں کی اس حالت زار کا رونا رویا ہے۔ اُس وقت تو پھر بھی حالت بہتر تھی۔ اِس دور کا اللہ کی محبت کا راہی خانقاہوں

کی اس صورتحال کو دیکھ کر اس ادارہ کی زوال پذیری پر خون کے آنسو بہائے بغیر رہ نہیں سکتا۔

اس دور کے ایک ممتاز عارف اور مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ؒ نے پاکستان بھر کا دورہ کرتے ہوئے ایک جگہ فرمایا تھا کہ مجھے بڑے دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ پاکستان میں کوئی ایسا معروف مرکز اور کوئی ایسی معروف خانقاہ موجود نہیں، جہاں بہتر، پاکیزہ اور مثالی زندگی کا عملی نمونہ ملتا ہو اور جہاں افراد جا کر اپنی زندگی میں پاکیزہ تبدیلی کا تجربہ کر سکیں، جہاں دنیا سے بے ثباتی کا یقین پختہ ہوتا ہو اور اخلاقی وروحانی زندگی مضبوط سے مضبوط تر ہوتی ہو۔ جہاں زندگی میں شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ نہ ہو اور زندگی قول وعمل کے تضاد سے پاک ہو، اور جہاں ملت بیضا کا تصور پختہ ہوتا ہو، جب کہ ہندستان میں اب بھی ایسی متعدد معروف خانقاہیں موجود ہیں۔

تصوف کے نقشبندی ومجددی سلسلہ میں بھی خرافات وبدعات آتی جارہی ہیں اور حضرت مجدد الف ثانی ؒ نے تصوف کی جن خرافات کے خلاف جہاد کیا تھا، وہی خرافات اس سلسلہ میں اب بڑھتی ہوئی نظر آرہی ہیں۔ آپ نے اپنے مرشد حضرت باقی باللہ کے فرزندانِ گرامی کی طرف سے مجلس مولود کے انعقاد کی سخت مخالفت کی تھی، لکھا تھا کہ اگر مجلس مولود کے سلسلہ کو موقوف نہ کیا گیا تو وہ فیض (مجددی) سے محروم رہیں گے، دوسری خرافات کے سلسلہ میں تو آپ کا موقف شدید ترین تھا۔

زوال پذیر دور میں ایسا ہی ہوتا ہے کہ امت کا ہر ادارہ زوال کے اثرات کا شکار ہوتا ہے۔

برصغیر ہند میں چودھویں صدی کے ابتدائی نصف صدی میں مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا اشرف علی تھانوی ؒ کی طرف سے تصوف میں پیدا شدہ بگاڑ اور خرافات کی اصلاح اور حقیقی تصوف کی توضیح وتشریح کے لئے جو علمی کام ہوا ہے، وہ ایسا عظیم الشان کام ہے، کہ اب جعلی وحقیقی تصوف اور تصوف میں پیدا شدہ خرافات

سے واقف ہونا کوئی دشوار کام نہیں رہا ہے۔ اگرچہ تصوف میں اس تجدیدی کام کی بدولت مولانا رشید احمد گنگوہی ؒ اور مولانا اشرف علی تھانوی ؒ کو کفر کی فتوؤں کا سامنا کرنا پڑا، لیکن الحمدللہ بالخصوص مولانا اشرف علی تھانوی ؒ کی طرف سے تصوف کے لئے ہونے والے تجدیدی کام نے صدیوں تک تصوف کے صحیح اصول واضح کردیئے اور صحیح تصوف کی تعلیمات کو ایسا صاف وشفاف طور پر اجاگر کردیا ہے کہ معمولی ذہن کا فرد بھی ان کی کتابوں کے مطالعہ سے جعلی وحقیقی تصوف کے درمیاں امتیاز پیدا کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہو سکتا ہے۔

تصوف کے موجودہ اداروں کی اس عمومی زبوں حالی کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ معاشرہ میں اب بھی ایسے درویش، عارف اور عاشق صادق موجود ہیں، جو دنیا کے اپنے حصہ سے دستبردار ہوکر، اللہ کے درد عشق کی دوا دیتے ہیں، اور طالبوں کو محبوب حقیقی کا شراب عشق پلاتے ہیں، جس سے سالکان راہ حق، محض اللہ کے لئے زندہ رہنے اور اللہ کے لئے مرنے کے عزم راسخ کے مالک بن جاتے ہیں۔ لیکن یہ درویش، روایتی درگاہوں اور خانقاہوں سے ہٹ کر، پیری مریدی کے روایتی طور طریقوں سے بے نیاز ہوکر، شہرت اور اشتہارات کی دنیا سے الگ تھلگ ہوکر، اپنی الگ دنیا بسائے ہوئے ہیں۔ انہیں محبوب کی حقیقی محبت کے درد کے علاوہ کوئی درد نہیں، وہ لوگوں کی "عطا" سے ناخوش ہوتے ہیں "ناعطا" سے خوش ہوتے ہیں۔ وہ ایسی چیزوں کے قریب بھی پھٹکنے کے لئے تیار نہیں، جس سے شہرت اور مال وجاہ سے داغدار ہونے کا اندیشہ ہو یا اس کا تاثر ملتا ہو، اس طرح کے درویش قیامت تک موجود رہیں گے، ان کے خاتمہ سے دنیا کا خاتمہ واقع ہوجائے گا۔

یہاں اس حقیقت کا ذکر بھی بے جا نہ ہوگا کہ ذکر وفکر کے جان توڑ مجاہدوں سے نفسی قوتوں کو پامال کرنے اور اللہ کو راضی کرنے کی بدولت اہل اللہ کو اللہ کی

طرف سے پاکیزہ زندگی کی دولت عظمیٰ حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ کشف وکرامات کی نعمت بھی عطا ہوتی ہے۔ ان کی دعاؤں کو بھی شرف قبولیت بخشا جاتا ہے، لیکن ایک تو کشف وکرامات ہر وقت نہیں ہوتی، کبھی ہوتی ہیں، کبھی نہیں ہوتی، بعض اوقات بزرگوں کی ساری کوششوں کے باوجود ان پر واردات الہام نہیں ہوتی، اس سے واضح ہوا کہ یہ اللہ کی طرف سے فیضان خاص ہے جو ان پر ہوتا ہے، یہ فیضان خاص بھی لامحدود نہیں ہے۔ اس کا دائرہ محدود ہے۔ دوم یہ کہ کشف وکرامات کی حیثیت محبوب حقیقی کی طرف سے راز کی سی ہے۔ اہل اللہ نے ہمیشہ ان رازوں کو راز رکھنے کی کوشش کی ہے۔ سوائے شدید غلبۂ حال کے، حضرت نظام الدین اولیاء فرماتے ہیں کہ محبوب کے راز افشاں کرنے کے بعد محبوب کے دوسرے رازوں سے محرومی کی نوبت آجاتی ہے۔

حب جاہ وحب مال کے حاملوں کے بارے میں ان درویشوں کا عمل حضرت نظام الدین اولیاء کے اس عمل سے مطابقت رکھتا ہے، جس کے تحت بادشاہ وقت نے ان سے ملاقات کے لئے پیغام بھیجا، آپ نے جواب میں فرمایا کہ میں بادشاہ وقت کے لئے دعائے خیر کرتا رہتا ہوں، ان سے ملاقات ممکن نہیں۔ بادشاہ نے اصرار کے ساتھ پیغام بھیجا تو آپ نے فرمایا کہ اگر وہ تشریف لائیں گے تو میں خانقاہ کے دوسرے دروازہ سے نکل جاؤں گا۔

اصل میں حب جاہ وحب مال کے حامل افراد، اصلاح کی حقیقی طلب کے فقدان کی وجہ سے اپنے اندر شر کی اتنی بڑی قوت رکھتے ہیں کہ عارف بھی ان کے اس شر کے چھینٹے محسوس کئے بغیر نہیں رہتے۔ مولانا رومی فرماتے ہیں کہ سورج کتنا بڑا ہے اور اس کی روشنی سے کون ہے، جو حرارت حاصل نہ کرتا ہو، لیکن جب بادل جیسی معمولی چیز سورج کے درمیاں آجاتی ہے تو اس کی روشنی مدھم ہوجاتی ہے، اسی طرح روحانیت کا بڑے سے بڑے صاحب بھی اگر مالداروں اور دنیا داروں کی صحبت

اختیار کرے گا تو اس کی معرفت کی روشنی مدھم ہوجائے گی۔ موجودہ دور کی اکثر درگاہوں اور خانقاہوں میں دنیا کے زیب وزینت کے زور کا بنیادی سبب یہی ہے کہ حب جاہ وحب مال کے صاحبوں سے روابط رکھے گئے اور ان سے جذبات طمع وابستہ کئے گئے۔

اگرچہ مال بذات خود برا نہیں ہے، لیکن محسن انسانیت رسول اللہ ﷺ، شیخین رضی اللہ عنہما، صحابہ کرام کی اکثریت اور عارفوں اور عاشقوں کا ہمیشہ دنیا وسامان دنیا کے بارے میں رویہ استغنیٰ کا رہا ہے اور انہوں نے ہمیشہ فقر ہی کو اختیار کیا ہے اور فقر کی تلقین کی ہے۔

(۲)

معیشت، معاشرت اور تمدنی سہولتوں سے استفادہ کے سلسلہ میں دنیا داروں اور مالداروں سے مشابہت پیدا کرنا، فقر محمدی ﷺ کے منافی ہے۔ تصوف کا جوہر فقر محمدی ﷺ ہے۔ فقر سے جداگانہ راستہ خانقاہیت کے مزاج کو تبدیل کئے بغیر نہیں رہ سکتا، چاہے یہ راہ بہتر حکمت عملی اور اخلاص کے ساتھ ہی کیوں نہ اختیار کی جائے۔ اہل اللہ نے ہمیشہ فقر کو ترجیح دی ہے اور اس سلسلہ میں کسی مصالحت اور رورعایت کا مظاہرہ نہیں کیا ہے۔ اس لئے کہ فقر میں وہ ساری صفات موجود ہیں، جو محبوب کی محبت کا رازداں بنانے کی حامل ہیں اور جو جوہر انسانیت ہیں۔

فقر کا مطلب دل سے دنیا کی محبت کا نکل جانا، دنیا وسامان دنیا کے لئے متفکر وبے چین نہ ہونا، زاہدانہ زندگی گزارنے کے ملکہ کا حاصل ہونا، عملی زندگی کے نقش ونگار سے فقر وفقیرانہ شان کا مظاہرہ ہونا، قدرت کی طرف سے اگر دنیا حاصل بھی ہو تو اس دنیا کو اللہ کی مخلوق کی بھلائی کے لئے استعمال کرنا، دنیا میں اس طرح رہنے کے مزاج کا راسخ ہونا، جس طرح مسافر دوران سفر راستہ میں قیام کرتا ہے۔

اگرچہ دولت و دنیا سے جائز حدود کے اندر رہتے ہوئے بھرپور استفادہ کی اجازت ہے، اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کا عملی زندگی میں مظاہرہ ہونا چاہئے، لیکن اس اجازت کے باوجود عزیمت کی زندگی وہی ہے، جو فقر سے وابستہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو فقر محبوب تھا، آپ کے بہت سارے اصحاب نے اسی طرز زندگی کو اختیار کیا، صوفیائے کرام کا امتیازی شان بھی اختیاری فقر اور زاہدانہ زندگی ہی ہے۔

فقر کے سلسلہ میں کتابوں میں اہل اللہ کے واقعات پڑھتے ہیں تو ان کی، دنیا سے بے نیازی اور دولت کو ٹھکرانے کے حوصلوں سے دل ان کی عزیمت کے احساس سے لبریز ہوجاتا ہے۔

حضرت نظام الدین اولیاء کے بارے میں ان کی ملفوظات کی کتاب ''فوائد الفوائد'' میں ہے کہ ان کی خانقاہ میں فتوحات کا سلسلہ جاری تھا۔ اناج، جنس، پھل فروٹ اور نقد رقم وغیرہ، خانقاہ کی ضروریات پوری کرنے کے بعد یہ ساری چیزیں دہلی کے غربا اور مسکینوں اور ضرورتمندوں میں تقسیم کی جاتی تھی۔ ان فتوحات سے استفادہ کے سلسلہ میں حضرت نظام الدین اولیاء کی اپنی جو حالت تھی، اس کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

''وہ اکثر روزہ رکھا کرتے تھے، لیکن سحری شاذ و نادر ہی کھایا کرتے تھے، خواجہ عبدالکریم جن کے ذمہ سحری پیش کرنا تھی، عرض کرتے تھے، مخدوم! آپ نے افطار کے وقت بہت ہی کم کھانا تناول فرمایا ہے، اگر سحری کے وقت تھوڑا سا کھانا تناول نہ کریں گے تو ضعف بڑھ جائے گا۔ خواجہ عبدالکریم کی یہ بات سن کر حضرت محبوب الٰہی کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوجاتے اور نہایت ہی پُر درد لہجہ میں فرماتے ''بہت سے مساکین اور درویش مسجدوں کے کونوں اور دکانوں (کے چبوتروں) میں بھوکے پڑے ہوئے ہیں۔ بھلا یہ کھانا کس طرح میرے حلق سے اتر سکتا ہے۔ (سیر الاولیاء بحوالہ حضرت نظام الدین، صفحہ ۲۳ تصنیف، خلیق احمد نظامی)۔

آپ کے فقر کا ایک اور جگہ نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے۔

''حضرت ان دنوں کو چھوڑ کر جن میں روزہ رکھنا مکروہ ہے، بارہ مہینے روزے رکھتے تھے۔ آپ کے لیے سحری خواجہ عبدالرحیم لیکر آتے تھے۔ حضرت کبھی ایک آدھ لقمہ چکھ لیتے اور کبھی جوں کی توں واپس ہوجاتی تھی، افطار کے وقت بھی غذا قلیل ہوتی تھی اور اس میں سے بھی حاضر الوقت لوگوں کو عطا فرماتے رہتے تھے، ایک بار کوئی مسافر حضرت کی خدمت میں آیا، آپ اس وقت دسترخوان پر بیٹھے تھے۔ اسے بھی بٹھالیا، دوران گفتگو میں اس سے پوچھا: اس سفر میں آپ کن درویشوں سے ملے؟ اس نے نام بنام ذکر کرنا شروع کیا اور کہنے لگا، ایک درویش تو ایسے ملے، جو نہ کبھی پیٹ بھر کر کھانا کھاتے ہیں، نہ پوری نیند سوتے ہیں، جب وہ مسافر یہ بات کہہ رہا تھا، ہمارے حضرت لقمہ بنا کر اٹھا چکے تھے اور دہن مبارک تک لے جارہے تھے کہ اچانک اسے واپس رکھ لیا اور کھانے سے ہاتھ روک لیا۔

''آپ کو گنے بہت مرغوب تھے، جن عقیدتمندوں کو یہ بات معلوم تھی، وہ جب گنے کی فصل نہ ہوتی، اس وقت بھی دور دور سے کھوج کرلے آتے تھے، اور حجرے کے کونے میں دو چار گنے ہر وقت رکھے رہتے تھے، ایک دن بے موسم کے گنے حجرے میں رکھے دیکھے، تو خواجہ کریم الدینؒ نے دل میں سوچا آج کل گنے کہاں سے آگئے؟ حضرت نے وہی بات شروع کردی، اور فرمایا کہ مجھے گنے بہت ہی زیادہ مرغوب ہیں، جب دوستوں اور عزیزوں کو یہ معلوم ہے کہ مجھے پسند ہیں تو جانے کہاں کہاں سے کھوج کر لے آتے ہیں، مگر اس سال گنوں کی پوری فصل گذر گئی، میں نے صرف ایک پور بطور ''حق نعمت'' کھائی ہے۔ خواجہ کریم الدین نے کہا کہ غور کرو، اس سے بڑی ریاضت اور کیا ہوگی کہ جو چیز حضرت کو اتنی مرغوب ہو وہ بھی کبھی پیٹ بھر کر نہ کھائیں''۔

دنیا کے اپنے حصہ سے دستبرداری اور فقر کے سلسلہ میں یہ کردار صاحبان

صوف کی روح ہے۔ تاریخ، اولیائے کرام کے زہد اور دنیا سے استغنیٰ کے واقعات ے بھری ہوئی ہے، تفصیل کا یہ موقعہ نہیں، اس دور میں ہم نے اپنے سامنے تین ولیائے کرام کو اس نقش قدم پر چلتے ہوئے دیکھا اور دنیا انہیں ذرہ برابر بھی دھوکہ نہ ے سکی۔ ایک حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰؒ دوسرے حضرت محمد حسینؒ تیسرے مولانا بدالکریم قریشیؒ بیر والے۔

حضرت محمد حسینؒ گگڑے والے کا ایک واقعہ واقفان حال بتاتے ہیں کہ خانقاہ کے مریدوں کے لئے ایک بار مکھن آیا، آپ نے انگلی سے تھوڑا سا مکھن لے کر کھا، اس سے آپ کو سخت انتباہ ہوا، چونکہ صاحب کشف تھے، اس لئے بہت آہ زاری کی اور زارو قطار روتے رہے اور یہ بھی کہتے جاتے تھے، یا اللہ میں نے یانت نہیں کی، میں نے مکھن کا ذائقہ دیکھنے کے لئے چکھا تھا۔ بس مجھے معاف کر ے۔

دراصل یہ فقر، فقر محمدی کی شان ہے۔ جس کی تفصیلات سے احادیث اور برت کی کتابیں بھری ہوئی ہیں، کچھ احادیث ملاحظہ ہوں۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ اول تو تمام لوگوں سے یادہ سخی تھے کوئی بھی آپ کی سخاوت کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا کہ خود فقیرانہ زندگی بسر رتے تھے اور عطاؤں میں بادشاہوں کو شرمندہ کرتے تھے۔ ایک دفعہ نہایت سخت حتیاج کی حالت میں ایک عورت نے چادر پیش کی اور سخت ضرورت کی حالت میں پ نے پہنی، اسی وقت ایک شخص نے مانگ لی، آپ ﷺ نے مرحمت فرمادی۔ پ قرض لے کر ضرورت مندوں کی ضرورت پوری فرماتے تھے، اور قرض خواہ کے ت تقاضے کے وقت کہیں سے اگر کچھ آگیا اور ادائے قرض کے بعد بچ گیا تو جب ک وہ تقسیم نہ ہوجائے، گھر میں تشریف نہ لے جاتے تھے۔ بالخصوص رمضان بارک کے مہینہ میں اخیر تک بہت ہی فیاض رہتے۔ (کہ حضور ﷺ کی گیارہ ماہ کی

فیاضی بھی اس مہینہ کی فیاضی کے برابر نہ ہوتی تھی) اور اس مہینہ میں جب بھی حضرت جبریل علیہ السلام تشریف لاتے اور آپ کو کلام اللہ سناتے، اس وقت آپ بھلائی اور نفع رسانی میں تیز بارش لانے والی ہوا سے بھی زیادہ سخاوت فرماتے۔ (خصائل نبویؐ)

ترمذی کی حدیث سے نقل کیا گیا کہ حضور انور ﷺ کے پاس ایک مرتبہ نوے ہزار درہم کہیں سے آئے۔ حضور اقدس ﷺ نے ایک بورے پر ڈلوا دیئے اور وہیں پڑے پڑے سب تقسیم کرا دیئے، ختم ہوجانے کے بعد ایک سائل آیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میرے پاس تو کچھ رہا نہیں تُو کسی سے میرے نام سے قرض لے لے، جب میری پاس ہوگا ادا کروں گا۔ (خصائل نبوی)

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ رسول خدا سے کچھ مانگا گیا ہو اور آپ ﷺ نے فرمایا ہو میں نہیں دیتا۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کل کے لئے کوئی چیز نہ اٹھا رکھتے تھے۔ حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ، سب سے زیادہ سخی تھے۔ خاص کر ماہ رمضان میں تو بہت ہی سخی ہوجاتے تھے۔ (صحیح بخاری باب بدء الوحی)

ایک دفعہ حضور اکرم ﷺ نے حضرت ابوذر غفاریؓ سے فرمایا:

"اے ابوذر، مجھے یہ پسند نہیں کہ میرے پاس کوہ احد کے برابر سونا ہو اور تیسرے دن تک اس میں سے میرے پاس ایک اشرفی بھی بچ رہے۔ سوائے اس کے جو ادائے قرض کے لئے ہو۔ تو اے ابوذر! میں اس مال کو دونوں ہاتھوں سے خدا تعالیٰ کی مخلوق میں تقسیم کرکے اٹھوں گا۔" (صحیح بخاری کتاب الاستقراض ص ۳۲۱)

ایک دن رسول کریم ﷺ کے پاس چھ اشرفیاں تھیں۔ چار تو آپ نے خرچ کر دیں اور دو آپ کے پاس بچی رہیں۔ ان کی وجہ سے آپ کو تمام رات نیند نہ آئی۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا، معمولی بات ہے،

صبح ان کو خیرات کر دیجئے گا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا۔ "اے حمیرا (حضرت عائشہؓ کا لقب ہے) کیا خبر ہے میں صبح تک زندہ رہوں یا نہیں۔" (مشکوٰۃ)

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ دوسرے دن کے واسطے کسی چیز کا ذخیرہ بنا کر نہیں رکھتے تھے۔ (شمائل ترمذی)

حضور ﷺ نے فرمایا کہ مجھ کو یہ بات خوش نہیں آتی کہ میرے لئے کوہ احد سونا بن جائے اور پھر رات کو اس میں سے ایک دینار بھی میرے پاس رہے۔ بجز ایسے دینار کے، جس کو کسی واجب مطالبہ کے لئے تھام لوں۔ اور یہ بات آپ ﷺ کے کمال سخاوت وعطا کی دلیل ہے۔ چنانچہ اسی کمال سخاوت کے سبب آپ مقروض رہتے تھے۔ حتی کہ آپ نے جس وقت وفات پائی ہے تو آپ ﷺ کی زرہ اہل وعیال کے اخراجات میں رہن رکھی ہوئی تھی۔ (نشر الطیب)

(۳)

تصوف میں پیدا ہونے والی خرابیوں کا ایک بڑا سبب بعض بزرگوں کی طرف سے "خلافت" کے عطا فرمانے میں جلد بازی بھی ہے۔ حضرت مرزا مظہر جان جاناں کے خلیفہ حضرت مولانا غلام علی شاہ نقشبندیؒ کی ملفوظات میں ہے کہ بزرگوں کے ہاں سلوک کی تکمیل اور خلافت کے لئے کم سے کم دس سال کا عرصہ ہے، دس سال کے مسلسل مجاہدوں کے بعد ہی بعض باصلاحیت اور خوش نصیب افراد اس اہلیت کے حامل ہوجاتے ہیں۔ ملفوظ میں یہ بھی ہے کہ ایک بزرگ نے اپنے بعض مریدوں کو دس سال کی ریاضتوں سے پہلے ہی سلوک طے کرا کر خلافت عطا فرمائی تھی، نتیجۃً وہ بڑے فتنہ میں مبتلا ہوگئے، اور نفس پرستی کی دلدل میں پھنس گئے۔ دس سال کا یہ عرصہ تو اس دور کے لئے تھا، جب مادیت کا سیلاب اس قوت سے سامنے نہیں آیا تھا، موجودہ دور میں جب کہ دنیا تمام فتنوں کے ساتھ سج سجا کر سامنے آئی ہے، اس دور میں تو سلوک کی تکمیل اور خلافت کے لئے ذکر وفکر کے مجاہدوں کے دورانیہ

میں مزید اضافہ ہونا ضروری ہے۔ تاکہ نفس، انوار ذکر کی کثرت سے حب جاہ وحب مال کے اثرات سے قابل ذکر حد تک محفوظ ہو سکے۔

(۴)

موجودہ دور میں تصوف واہل تصوف کو بعض اہم چیلنج درپیش ہیں، جن سے عہدہ برآ ہونے میں ہی ملت کی اسلامیت کی بقا وتحفظ کا انحصار ہے۔

ایک بڑا چیلنج مادیت کی بڑھتی ہوئی محبت کا چیلنج ہے، جس میں ہر خاص وعام فرد مبتلا ہے۔ دنیا کے پاس ایسا کوئی نظام موجود نہیں ہے، جو انسانیت کو پامال کرنے والی اس وبا کا علاج کر سکے، دنیا اور مادہ کی محبت نے انسان کو سخت دل بنا دیا ہے اور اس کی انسانیت پر حیوانیت کو غالب کر دیا ہے۔ آج انسانیت، دنیا سے بے ثباتی اور زہد کے زندہ نمونوں کے لئے ترس رہی ہے، آج انسانوں کے لئے یہ تصور کرنا بھی دشوار ہوگیا ہے کہ اس دنیا میں ایسے مراکز بھی موجود ہو سکتے ہیں، جو دنیا کے اپنے حصہ سے رضا کارانہ طور پر دستبردار ہوں اور دولت ودنیا کے دروازے کھلنے کے باوجود فقر کی زندگی اختیار کرنے پر راضی ہوں۔

اس طرح کی خانقاہیں جن کے سربراہ دنیا سے استغنیٰ کا زندہ نمونہ ہوں، اس دور کا جدید انسان ایسی خانقاہوں اور ایسے مربیوں کے سامنے ہتھیار ڈال کر خود سپردگی اختیار کرنے کے لئے تیار ہے، بشرطیکہ اس طرح کی زندہ مثالیں بڑی سطح پر قائم ہوں۔ کیا ہم اپنی خانقاہوں اور ان کے سرپرستوں سے دور جدید کے اس سب سے بڑے چیلنج یعنی فقر اور زہد کے زندہ اور مثالی نمونوں کی توقع رکھ سکتے ہیں۔

دور جدید کا دوسرا بڑا چیلنج عقلیت اور عقلی علوم کا ہے۔ عقلی اور نفسیاتی علوم نے اس دور میں وہ ترقی کی ہے کہ اس سلسلہ میں سارے انسانی رکارڈ ٹوٹ گئے ہیں، دور جدید کے بعض ممتاز فلاسفر اور نفسیاتی ماہر اس نتیجہ تک پہنچ چکے ہیں کہ عقل

محض کے ذریعہ حقیقت تک رسائی ممکن نہیں۔ نیز انسان کے اندر عقل کے علاوہ دوسری ایسی قوتیں موجود ہیں، جن کی بیداری کے ذریعہ ہم اصل مطلق ہستی سے رابطہ قائم رکھ سکتے ہیں اور مسرت وشادمانی کی حقیقی زندگی سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ نیز انسان کی ساخت کچھ اس انداز کی ہے کہ ہر مرد وعورت فطرت میں موجود محبت کے بے پناہ جذبات رکھتے ہیں۔ ان کی محبت کے ان کی جذبات کی تسکین، جنسی محبت کے ذریعہ ممکن نہیں، اس لئے کہ جنسی محبت کے ذریعہ اس کی تسکین کا مسلسل انتظام کرنے کے باوجود محبت کی یہ والہانہ کیفیات ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ محبت کی مادی اور جنسی نوعیت کے علاوہ عشق کی ایک دوسری دنیا بھی موجود ہے، جو محبت کی حقیقی دنیا ہے، جس سے انسان کے سارے جذبات واحساسات کی تسکین کا سامان وابستہ ہے۔ اس سلسلہ میں امریکہ کے مشہور فلاسفر اور ماہر نفسیات ولیم جیمز کی کتاب۔ "واردات نفسیات روحانیہ" ایسی کتاب ہے، جو معارف وحقائق کو نفسیاتی وعلمی بنیادیں فراہم کرنے والی ہے، یہ اہم اور ضخیم کتاب الٰہیات کے قائل فلاسفر اور ماہر نفسیات کی طرف سے جدید انسان کے لئے اہم تحفہ ہے۔

عقلی اور نفسانی علوم وتحقیق انسانی شخصیت کے وسیع اور گہرے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ تک کسی حد تک پہنچنے میں کامیاب ہوئی ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ موجودہ دور میں تصوف کے لئے جدید علم کلام تشکیل دیا جائے، جو جدید انسان کو ان کی اصطلاحوں میں ان کے اندر موجود لازوال محبت کے مقتضاؤں سے پوری شرح وبسط کے ساتھ متعارف کرا سکے، اس مقصد کے لئے اہل تصوف کو اپنی ذہنی سطح کو دور جدید کی ذہنی سطح سے ہم آہنگ کرنا پڑے گا اور عقل کو منجمد اور معطل کرنے اور مراسم وروایات کے حجابات کی جو دیوار اب تک اہل تصوف نے عام طور پر قائم کی ہے،

اس حکمت عملی سے صرف نظر کرنا پڑے گا۔

موجودہ دور میں انسانیت تک تصوف یعنی نور نبوت کے فیض کی رسائی کی صورت، ان دونوں چیلنجوں سے عہدہ برآ ہونے سے ہی وابستہ ہے۔ اسلامی دنیا کا ایک بڑا علمی حلقہ ایسا ہے، جس کی، فیض تصوف سے محرومی کا اہم سبب یہ ہے کہ تصوف واہل تصوف نے مراسم وروایات کی ایسی دیوار کھڑی کرلی ہے اور تصوف کے اثبات کے لئے جدید نفسیاتی علوم اور تحقیق سے ایسی بے نیازی اختیار کرلی ہے کہ جدید انسان کے لئے تصوف کا پیام باعث کشش نہ بن سکا ہے۔

اس سلسلہ میں ہمارے ہاں جو کام ہوا ہے، وہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور خلیق احمد نظامی صاحب نے کیا ہے، ان کے علمی کام سے استفادہ کرکے، اس میں مزید اضافہ کیا جا سکتا ہے اور اس علمی کام کی بنیاد پر علمی رجحان رکھنے والے سالکین راہ حق کی ذہن سازی بھی کی جا سکتی ہے، تاکہ وہ جدید انسان سے ان کی زبان میں بات کرسکے اور انہیں اپنی ہی فطری اورداخلی قوتوں کے بارے میں جدید تحقیق کے حوالے سے آشنا کرسکے۔

تصوف میں تکبر کے بڑھتے ہوئے مرض کا علاج

اسلاف کی تاریخ کی روشنی میں

ہمارا موجودہ دور علمی برتری، عقل محض، اور عقلی دوڑ کا دور ہے۔ اس دور میں جو نظریات کارفرما ہیں، جن کا دنیا بھر میں چلن ہے، وہ یہ ہیں کہ انسان، جس طاقتور داعیے سے عبارت ہے، وہ داعیہ دوسروں کو زیر کرکے، کچل کرکے، محکوم بنا کر خود بلند سطح پر گامزن ہونے کا ہے۔ دوسروں پر معاشی، سماجی، نفسیاتی اور سیاسی بالادستی حاصل کرنا، یہی انسان کا سب سے بڑا نصب العین ہے۔ یہی سب سے بڑی جیت ہے۔

زندگی کے بارے میں یہ نقطہ نظر مادہ پرست مغربی قوموں کا ہے، لیکن اقوام دنیا پر ان کی علمی، ذہنی اور نظریاتی برتری کی وجہ سے مسلم ملت بھی تیزی سے اس نظریہ کی حامل ہوتی جارہی ہے۔

اس پس منظر میں ضرورت ہے کہ مسلم نفسیات کے تاریخی تجزیہ کے حوالے سے یہ بتایا جائے کہ مسلمانوں کے ہاں نفس کو مطیع کرنے، کبر، انانیت اور شیخی کے جذبات کو مضمحل کرنے کے کام کو کتنی فیصلہ کن اہمیت دی جاتی رہی ہے۔ اور اس کام کو کس طرح انسانیت کا بنیادی جوہری کام متصور کیا جاتا رہا ہے۔

زیر نظر مضمون میں دعویٰ، انانیت اور شیخی کے سب سے بڑے مرض جو اس وقت عالمگیر مرض کی صورت اختیار کرچکا ہے

تفصیل سے نشاندہی کی گئی ہے اور اس مرض کے علاج کے لئے اہل تصوف کے ہاں کیا طریق کار اختیار کیا جاتا رہا ہے، اس کے واقعات بھی بیان کئے گئے ہیں۔ (محمد موسیٰ بھٹو)

اسلامی تاریخ میں ابھرنے والے فتنوں کا بنیادی سبب

اسلامی تاریخ کا گہرا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کی تاریخ میں داخلی طور پر جتنے بھی فتنے پیدا ہوئے ہیں، جنہوں نے مسلمانوں کو زیروزبر کیا ہے وہ زیادہ تر کبر، شیخیت، اور ممتاز حیثیت خود نمائی اور حسد کے جذبات کی وجہ سے ہی پیدا ہوئے ہیں۔ اس جذبہ نے اہل اقتدار اور اہل ثروت کو مجبور کیا کہ وہ ذاتی خود نمائی کے لیے قومی وسائل کا بے دریغ استعمال کریں تاکہ دوسروں پر ان کی فوقیت و برتری قائم رہے۔ اس جذبے نے اہل علم اور اہل دانش کو مجبور کیا کہ وہ قرآن وسنت کی ایسی تفسیر کریں، جو اسلاف کی متفقہ تعبیر سے مختلف ہو، تاکہ ان کی اپنی علمی وجاہت اور ممتاز حیثیت قائم ہو۔ چنانچہ اس سے اسلام میں مختلف گمراہ فرقے پیدا ہوئے اور طاقتور ہوئے جو ایک دوسرے سے متصادم ہوتے رہے۔ اس جذبے نے مقرروں اور خطیبوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنے علم کی نمائش اور داد وستائش کی خاطر معاشرے میں مناظروں اور مباحثوں کی آگ گرم کریں اور جزوی اختلافات کو بنیادی اختلافات کی حیثیت سے پیش کرکے ایک دوسرے کے خلاف دست وگریباں ہوں۔

اس طرح سے تاریخ کے مختلف ادوار میں مسلم معاشرہ اہل اسلام کی انا اور خود نمائی کے جذبات کے ہاتھوں کمزور ہوتا رہا اور دشمنوں کو اسے مزید کمزور کرنے اور حملہ آور ہونے میں آسانی رہی۔ سوال یہ ہے کہ آخر ایسا کیوں کر رہا؟ یعنی مسلم معاشرہ اپنے ہی باصلاحیت افراد کے ہاتھوں اس طرح کی صورت حال سے کیوں کر دوچار رہا۔ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے ایک ممتاز عالم مولانا مناظر احسن گیلانی اپنی کتاب ''مسلمانوں میں فرقہ بندیوں کا افسانہ'' میں لکھتے ہیں:

قرآن میں رسول اللہ ﷺ کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔ یتلو علیھم آیٰتہ ویزکیھم. یعنی پیغمبر علیہ السلام قرآن کی آیات پڑھ کر سناتے ہیں، جو لوگ آیات سن کر ایمان لاتے ہیں، آپ (ﷺ) ان کا تزکیہ کرتے ہیں اور ان کے دلوں کا میل کچیل صاف کرتے ہیں۔ لیکن بعد میں ہوا یہ کہ جو لوگ قرآن پڑھ کہ عالم بن جاتے تھے، انہوں نے یہ باور کرلیا کہ اب انہیں تزکیہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور انہوں نے اسلام کی ساری تحصیل کرلی ہے، اب انہیں مزید کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ حالانکہ علم الگ بات ہے اور تزکیہ اس سے بالکل جداگانہ بات۔ چوں کہ تزکیہ اور دل کی تطہیر اور صفائی سے بے نیازی پیدا ہوگئی اور قرآن کے علم نے پندار اور خود سری کے جذبات بھی پیدا کردیے اس لئے اب علم علم سے ٹکرانے لگے اور علم کی بنیاد پر گروہ بندیاں پیدا ہونے لگیں۔ علم کے ساتھ ساتھ اگر تزکیہ کا انتظام واہتمام نہ ہو اور قلبی روگ یوں ہی قائم اور موجود رہے تو اس کا یہی نتیجہ سامنے آتا ہے جو تاریخ میں سامنے آتا رہا ہے۔

طاقتور نفسی جذبات

جدید علم نفسیات کی روشنی میں

ہم یہاں ضروری سمجھتے ہیں کہ جدید علم نفسیات کے حوالے سے انسان کے طاقتور نفسی جذبات کے بارے میں تحقیقات کا حاصل پیش کریں۔ تاکہ نفس کی معرفت کے حوالے سے اہم نکات کا علم حاصل ہوسکے۔

مشہور ماہر نفسیات مولانا عبدالماجد دریا آبادی مغربی ماہرین نفسیات کے فکر. خلاصہ بیان کرتے ہوئے اپنی کتاب ”فلسفۂ جذبات“ میں لکھتے ہیں:

”انسان اگر اپنی روزمرہ سرگرمیوں کا جائزہ لے تو اسے معلوم ہوگا کہ اس کے بیشتر اعمال کا سبب جذبۂ خودنمائی اور حب جاہ ہی ہے۔ بڑے بڑے فوجی سربراہ اور

بہادر انسان جو اپنی جانیں خطرات میں مبتلا رکھتے ہیں۔ بڑے بڑے علم کے پیاسے جو علمی مسائل کی تحقیق میں اپنی صحت تک برباد کردیتے ہیں۔ بڑی بڑی پاکباز خواتین جو اپنی عصمت کے تحفظ کے لیے اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھولیتی ہیں، ان سب کی تہ میں اکثر یہ جذبہ کام کرتا ہوتا ہے کہ دوسروں کی نظر میں اپنی فضیلت اور برتری ثابت کرکے کس طرح ناموری حاصل کی جائے۔

ناموری اور خودنمائی کے جذبہ کی تین صورتیں ہیں، ایک یہ کہ دوسروں کے ذہن میں اپنے بارے میں اچھا تاثر خوش اعتقادی اور محبت پیدا کرنے کوشش وخواہش ہو۔ اس طرح کے لوگ اپنے عمل سے ایثار، ہمدردی، پاکبازی، خداترسی اور اخلاق حسنہ کا ثبوت دیتے ہیں یا مظاہرہ کرتے ہیں۔ تاکہ اس سے دوسروں کے دل میں محبت وعقیدت کا جذبہ پیدا ہو۔ جذبۂ خدنمائی وحصول جاہ کی دوسری شکل یہ ہے کہ اس مقصد کے لیے علمی کمال حاصل کیا جاتا ہے یا جسمانی صلاحیتوں کو فروغ دیا جاتا ہے تاکہ ان چیزوں کے ذریعے معاشرے میں عزت ووقار اور توقیر پیدا ہو۔ اس طرح جذبہ عزت وتوقیر فروزاں وتسکین پذیر ہوتا ہے۔ اس کی تیسری صورت یہ ہوتی ہے کہ لوگوں کو محض حصول نام ونمود سے غرض ہوتی ہے۔ اس سے بحث نہیں ہوتی کہ نیک نامی حاصل ہوگی یا بدنامی۔ عام طور پر لوگوں کے اندر بیک وقت یہ تینوں خواہشات پائی جاتی ہیں لیکن بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے اندر صرف ایک ہی خواہش پائی جاتی ہے۔

انسان کے اندر اپنے عیوب کو مخفی رکھنے اور اپنی خوبیوں کو نمایاں کرنے کا جو مادہ موجود ہے، وہ دراصل اسی جذبۂ خودنمائی اور حصول جاہ ہی کا نتیجہ ہے جن خاصیتوں کے بارے میں سمجھا جاتا ہے، ان سے نام ونمود، عزت وشہرت یا محبت وعقیدت حاصل ہوگی۔ ان خاصیتوں کو نمایاں رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے، جن کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس سے معاشرہ میں بے وقعتی اور سبکی حاصل ہوگی۔

انہیں چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کوشش ہوتی ہے کہ اپنی خوبیاں دوسروں کے سامنے اس طرح پیش نہ ہوں کہ نمائش کی جھلک محسوس ہو، ورنہ بات ظاہر ہوجائے گی۔ اس سلسلہ میں یہ احتیاط کی جاتی ہے کہ اپنی تعریف خود نہ کی جائے ورنہ دوسرے لوگ تعریف کرنے میں بخل سے کام لیں گے۔ داد وستائش اور تعریف ایک عطیہ وانعام ہے، جو سوسائٹی افراد کو از خود خوشی سے دیتی ہے، جب کوئی شخص خود ہی اپنے آپ کو داد وستائش کا مستحق قرار دیتا ہے تو سوسائٹی اسے اپنی توہین تصور کرتی ہے اور سمجھتی ہے کہ فرد نے اسے ایک حق سے محروم کردیا ہے۔

انسان نے داد طلبی کے لیے مخفی راستے اختیار کر رکھے ہیں، ان کی ایک دقیق صورت یہ ہے کہ ایک شخص لوگوں کے سامنے اپنی کمزوریاں خود ہی بیان کرنا شروع کردیتا ہے۔ لیکن ایسا کرنے سے اس کا پوشیدہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ اس کی تردید کرنا شروع کردیں۔ یا کم از کم اس سے ہمدردی کا اظہار کریں۔ جب تک لوگوں کے سامنے متکلم کی اندرونی نیت ظاہر نہیں ہوتی، تب تک وہ اس کی مدح وتعریف کرتے ہیں۔ لیکن جوں ہی انہیں اصل صورت حال کا علم ہوجاتا ہے تو وہ فرد ان کی نگاہوں میں بے وقعت ہوجاتا ہے۔

ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ اگرچہ جذبہ شہرت وانانیت وخودنمائی ہر فرد میں موجود ہوتا ہے، لیکن درج ذیل طبقوں میں یہ جذبہ بری طرح موجود رہتا ہے اور بڑی خطرناک اور خوفناک شکل میں سامنے آتا ہے۔

۱۔ دولت مند دولت ایسی چیز ہے جس سے دنیاوی لذت وراحت کا ہر مادی سامان خریدا جاسکتا ہے، اس لیے دولت مند اپنے آپ کو دوسروں سے ممتاز سمجھنے لگتا ہے۔ دولت اس کی نفسیات میں ایک بنیادی روگ پیدا کردیتی ہے اور وہ اپنے آپ کو دوسری دنیا کی مخلوق سمجھنے لگتا ہے۔

اقتدار واختیار: چوں کہ حکومت واختیار سے عام لوگوں پر حکم چلانے کا موقع

ملتا ہے۔ نیز انہیں اپنا محکوم وماتحت سمجھنے کی نفسانیت جنم لیتی ہے۔ اس لیے حکمرانی وافسری سے نخوت وتحکماتی کیفیت پیدا ہوتی اور مستحکم ہے۔

علم وفضل: علم، دانشوری اور خطابت سے اپنی علمی فضیلت اور عظمت کا زعم پیدا ہونے لگتا ہے۔ اس لیے عام طور پر یہ چیز بھی نخوت اور بڑے پن کا ذریعہ بن جاتی ہے اور عجز انکساری حقیقت پسندی اور انسانیت کی عام سطح پر آنے کی راہ میں حجاب اکبر بن جاتی ہے۔

زہد وتقویٰ: چوں کہ زاہد عبادت میں ریاضت کو دائمی کامیابی کا ذریعہ سمجھتا ہے چونکہ اسے اپنی اس کامیابی کا مرکز اپنی ذات میں نظر آنے لگتا ہے اس لئے اس میں اپنی بزرگی کا تصور راسخ ہونے لگتا ہے۔ اور وہ دوسروں کے مقابلے میں اپنی شخصیت کو نمایاں اور ممتاز سمجھنے ہے۔ زہد کا زعم بڑے بڑے عابدوں اور زاہدوں کے اندر تکبر اور بڑائی کی ''نفسیات'' پختہ کردیتا ہے۔

یہ بات تو واضح ہے کہ ہر قوم کی تاریخ اس کے ماضی کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ ماضی سے استفادہ کیے بغیر کوئی بھی قوم حال کے مسائل سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتی۔ آئیے یہ دیکھیں کہ ماضی میں ہمارے اسلاف اور اکابر نے نفس کے مسائل کبر، انانیت اور جذبہ بڑائی اور خودنمائی کو کتنی اہمیت دی ہے اور اس کا علاج کس کس طرح سے کیا ہے اور ان کو ان مسائل کی کتنی زبردست فکر دامن گیر رہتی تھی۔

حضرت عمرؓ کا واقعہ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ایک مرتبہ دیکھا گیا کہ کمر پر مشک لادے مسلمانوں کو پانی پلا رہے ہیں۔ پوچھا گیا اے امیر المومنین یہ کیا ہے، فرمایا کہ کچھ لوگ وفد کی صورت میں آئے تھے، انہوں نے میری مدح کی، اس سے نفس کو خوشی حاصل ہوئی اس کا میں نے یہ علاج کیا ہے۔

حضرت علیؓ کا واقعہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک کرتہ پہنا جو انہیں اچھا معلوم ہوا۔ تو انہوں نے اس کی آستینیں بالشت بھر کاٹ دیں۔ تا کہ عیب پڑ جائے اور بدنام ہوں۔

قبیلہ کے سردار کی اصلاح کا مسئلہ

حضرت جنید بغدادی رحہ کے پاس ایک شخص بیس سال سال حاضر خدمت ہوتا رہا۔ ایک روز اس نے عرض کیا کہ بیس سال سے حاضر خدمت ہو رہا ہوں، لیکن مجھے آپ سے کچھ حاصل نہ ہوا۔ وہ شخص اپنی قوم (قبیلہ) کا سردار تھا۔ آپ سمجھ گئے کہ اس کے دل میں بڑائی ہے۔ اس لیے اصلاح نہیں ہو رہی ہے۔ آپ نے کہا، کیا تم واقعی اپنی اصلاح چاہتے ہو۔ اس نے کہا، ہاں، آپ نے فرمایا ٹھیک ہے تو ایسا کرو کہ اخروٹوں سے بھرا ہوا ٹوکرا لیکر خانقاہ کے دروازے پر بیٹھ جاؤ اور اعلان کرو کہ جو شخص مجھے ایک جوتا مارے گا اس کو ایک اخروٹ دوں گا، جو دو جوتے مارے گا، اسے دو اخروٹ دوں گا۔ اس طرح جب ٹوکرا خالی ہوجائے تو میرے پاس آجاؤ۔ اس نے کہا یہ کام تو مجھ سے نہیں ہوگا۔ آپ نے فرمایا پھر تمہاری اصلاح زندگی بھر نہیں ہوسکتی۔ (شریعت وطریقت کا تلازم صفحہ ۲۴۹)

ایک بزرگ کے پاس ایک شخص مدتوں رہا۔ اس کے قلب کی حالت درست نہ ہوئی۔ اس نے شکایت کی تو شیخ نے فرمایا۔ میرے ہاں آنے سے تمہارا کیا مقصود تھا، اس نے کہا حضرت، میرا ارادہ یہ رہا ہے کہ آپ سے جو فیض حاصل ہو، وہ لیکر دوسروں کو پہنچاؤں، شیخ نے کہا، اس نیت کے وجہ سے اصلاح نہیں ہوسکتی۔ تم نے تو پہلے سے ہی پیر بننے کی ٹھان رکھی ہے۔ خالص اپنی ذات کی اصلاح کی نیت رکھو تو پھر اصلاح ہوگی۔ ورنہ اصلاح ممکن نہیں۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا واقعہ

مولانا مناظر احسن گیلانی اپنی کتاب "برصغیر ہند میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت" میں حضرت نظام الدین اولیا کا واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

نظام الدین اولیاء جو شیخ کبیر کے ہاں سلوک کے مراحل طے کرنے سے پہلے علم وفضل کی ممتاز ہستی شمار ہوتی تھی۔ جن کو بحث ومباحثہ میں مخالفوں کو شکست دیتے رہنے کی وجہ سے نام ہی مولانا بحاث اور "محفل شکن" پڑ گیا تھا، وہ جب اصلاح ذات کے لیے شیخ کبیر کی خدمت میں پہنچے تو شیخ کبیر نے ان سے کہا کہ تمہیں کچھ کتابیں مجھ سے بھی پڑھنی پڑیں گی۔ چنانچہ ان کا "عوارف المعارف" کا سبق شروع ہوا۔ ابھی چند سبق ہی ہوئے تھے کہ ایک واقعہ پیش آیا۔ ہوا یہ کہ شیخ کبیر کے ہاں "عوارف المعارف" کا جو نسخہ تھا اس کی لکھائی اچھی نہیں تھی، چنانچہ شیخ کبیر اٹکنے لگے، اس پر نظام الدین اولیاءؒ نے کہا کہ میں نے عوارف المعارف کا دوسرا نسخہ شیخ الدین کے ہاں دیکھا ہے جو بالکل صحیح نسخہ ہے۔ اس طرح نظام الدین اولیاء اپنے شیخ کے سامنے اپنی وسعتِ نظری اور معلومات کا اظہار کرنے لگے۔ اس بات پر شیخ کی طرف سے سخت عتاب کے ساتھ یہ الفاظ ادا ہوئے۔ درویش کو بوسیدہ نسخہ کی تصحیح کرنے کی طاقت نہیں۔

شیخ کی زبان سے یہ بات کئی بار ادا ہوئی۔ جب نظام الدین اولیاءؒ کو معلوم ہوا کہ شیخ نے یہ بات ان کے جواب میں کہی ہے تو ان کے ہوش وحواس اڑ گئے۔ چنانچہ مجلس ختم ہوگئی۔ شیخ کے عتاب نے نظام الدین اولیاءؒ کی حالت اضطراب کو انتہائی بڑھا دیا تھا۔ اب نظام الدین اولیاء کے لیے شیخ کی مجلس میں رہنا ممکن نہ رہا تھا۔ شیخ کی طرف سے معافی کے دروازے بھی بند ہوگئے تھے۔ چنانچہ نظام الدین اولیاءؒ جنگلوں میں نکل گئے اور ہفتوں تک روتے اور گریہ وزاری کرتے رہے اور اپنی غلطی پر پشیمان ہوئے کہ انہوں نے بلاوجہ شیخ کے سامنے اپنی علمیت کا اظہار کیا۔

اسی اثنا میں شیخ کبیر کے فرزند شہاب الدینؒ کو نظام الدین اولیاء جنگل میں نظر
آئے، شہاب الدینؒ نے شیخ کبیر کے سامنے ان کی حالت زار بیان کر کے ان کو
معافی دینے کی درخواست کی، شیخ کبیر نے حکم دیا کہ نظام الدین کو نہلا دھلا کر اور
نیا لباس پہنا کر میری مجلس میں پیش کیا جائے۔ اس طرح نظام الدین کو معافی ملی۔
شیخ نے اگلے روز نظام الدین کو بلا کر انہیں اس راز سے بھی واقف کیا کہ یہ سب
کچھ تیرے حالات کو کمال تک پہنچانے کے لئے کیا گیا ہے۔ چوں کہ تمھارے اندر
بحث ومباحثہ اور علمیت کا پندار کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اس لیے اس کا علاج ضروری
تھا اور وہ اسی طرح ممکن تھا۔ نظام الدین اولیاءؒ کا ایک دوسرا واقعہ بھی مولانا مناظر
احسن گیلانی نے اپنی مذکورہ کتاب میں نقل کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت نظام
الدینؒ کے مدرسے کے دور کے ایک ساتھی دوران سلوک تشریف لائے تو انہوں نے
جب دیکھا کہ نظام الدین جو بڑے ذہین، مباحثانہ صلاحیتوں کے حامل اور بات
سے بات نکالنے والے تھے، اب ان کی شکل وصورت ہی بدل گئی ہے تو اسے بڑی
حیرت ہوئی۔ حضرت شیخ کبیر کے ہاں مہمان خانہ ایسی جگہ واقع تھا، جس کا راستہ
بازار سے ہو کر گزرتا تھا۔ شیخ کبیر نے نظام الدین اولیاءؒ کو حکم دیا کہ وہ پر تکلف
کھانوں کا ٹوکرا لے آئے، چنانچہ وہ ٹوکرا لے آئے۔ ان کے مرشد نے کہا کہ یہ
ٹوکرا سر پر رکھ کر بازار سے ہو کر، مہمان کو کھانا کھلا کر ٹوکرا اسی طرح سر پر رکھ کر
واپس لے آئے۔ نظام الدین اولیاءؒ نے مرشد کے حکم کے مطابق ایسا ہی کیا۔ اس
طرح نظام الدین اولیاءؒ کی تربیت ہوتی رہی

حضرت مجدد الفِ ثانیؒ کی فروتنی

حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے مکتوبات میں لکھتے ہیں: "میں
اپنے آپ کو ایک فرنگی سے بھی کم تر سمجھتا ہوں، اس لیے کہ اگر میں اپنے آپ کو
زیادہ بہتر سمجھنے لگوں تو عین ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ایمان کی دولت مجھ سے چھین کر

فرنگی کے دل میں ڈال دے۔ اس طرح میں دولتِ ایمان سے محروم رہ جاؤں۔"

شاہ ابوسعید گنگوہیؒ کا واقعہ

شاہ ابوسعید گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ بغرض بیعت شاہ نظام الدین بلخی رحمۃ اللہ
علیہ کی خدمت میں بلخ تشریف لے گئے۔ شاہ نظام الدینؒ کو اطلاع ہوئی کہ
صاحبزادہ تشریف لا رہے ہیں تو ایک منزل پر آ کر استقبال کیا اور بہت اعزاز واکرام
کے ساتھ لے کر بلخ پہنچے۔ وہاں پہنچ کر صاحبزادہ صاحب کی خوب خوب خاطر
مدارات کی، ہر روز نئے نئے اور لذیذ سے لذیذ کھانے پکوا کر کھلاتے، ان کو مسند پر
بٹھاتے خود خادموں کی جگہ بیٹھتے۔ آخر جب شاہ ابوسعید نے اجازت چاہی کہ وطن
واپس ہوں تو شاہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ نے بہت سی اشرفیاں بطور نذر پیش کیں۔
اس وقت شاہ ابوسعیدؒ نے عرض کیا کہ حضرت مجھے اس دنیوی دولت کی ضرورت نہیں
ہے، نہ ہی میں یہاں اس لیے آیا ہوں، مجھے تو وہ دولت چاہیے جو آپ ہمارے
یہاں سے لیکر آئے ہیں۔" یہ بات سننا تھی کہ شاہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کے تیور
بدل گئے اور جھڑک کر فرمایا کہ جاؤ طویلہ میں بیٹھو اور گھوڑوں کے دانہ راتب کی فکر
رکھو۔ چنانچہ وہ حکم کے مطابق طویلہ میں آئے۔ آدمی سے کہہ دیا گیا تھا کہ یہ شخص جو
طویلہ میں بیٹھا ہے اس کو دو روٹیاں جو کی دونوں وقت لا کر دیدیا کرو۔ اب شاہ ابو
سعید صاحب جب حاضر خدمت ہوتے تو شیخ نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھتے۔ چماروں
کی طرح دور بیٹھنے کا حکم فرماتے اور التفات بھی نہ فرماتے تھے کہ کون آیا اور کہاں
بیٹھا۔ تین چار ماہ بعد ایک روز حضرت شیخ نے بھنگن کو حکم دیا کہ آج طویلہ کی لید
اکٹھی کر کے لے جائے تو اس دیوانے کے پاس سے گذریو جو طویلہ میں بیٹھا رہتا
ہے۔ چنانچہ شیخ کے ارشاد کے بموجب بھنگن نے ایسا ہی کیا۔ پاس سے گذری کہ
کچھ نجاست شاہ ابوسعید پر پڑی۔ شاہ ابوسعید کا چہرہ غصہ سے لال ہو گیا۔ تیوری
چڑھا کر بولے۔ "گنگوہ نہیں ہے، ورنہ اچھی طرح مزا چکھاتا۔ غیر ملک ہے، شیخ کے

گھر کی بھنگن سے اس لیے کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' بھنگن نے قصہ حضرت شیخ کے عرض کردیا۔ حضرت نے فرمایا۔ ''ہاں ابھی بو ہے صاحبزادگی کی۔'' پھر دو ماہ تک خبر نہ لی۔

اس کے بعد بھنگن کو حکم ہوا کہ آج پھر ویسا ہی کرے بلکہ قصداً کچھ غلاظت شاہ ابوسعید پر ڈال کر جواب سنے کہ کیا ملتا ہے۔ چنانچہ بھنگن نے ارشاد کی تعمیل کی۔ اس مرتبہ شاہ ابوسعید نے کوئی کلمہ زبان سے نہیں نکالا۔ ہاں تیز اور ترچھی نگاہ سے اس کو دیکھا اور گردن جھکا کر خاموش ہوگئے۔ بھنگن نے آکر حضرت شیخ سے عرض کیا کہ آج تو میاں کچھ بولے نہیں۔ تیز نظروں سے دیکھ کر چپ ہو گئے۔ حضرت شیخ نے فرمایا۔ ''ابھی کچھ بو باقی ہے۔'' پھر دو چار ماہ کے بعد بھنگن کو حکم دیا کہ ''اس مرتبہ لید گوبر کا بھرا ہوا ٹوکرا سر پر پھینک ہی دیجیو کہ پاؤں تک بھر جائیں۔''

چنانچہ بھنگن نے ایسا ہی کیا۔ مگر اب شاہ ابوسعید بن چکے تھے۔ جو کچھ بننا تھا۔ اس لیے گھبرا گئے اور گڑگڑا کر کہنے لگے۔ ''مجھ سے ٹھوکر کھا کر بے چاری گر گئی، کہیں چوٹ تو نہیں لگی۔'' یہ فرما کر گری ہوئی لید جلدی جلدی اٹھا کر ٹوکرے میں ڈالنی شروع کردی کہ ''لا میں بھردوں۔'' بھنگن نے قصہ حضرت شیخ سے آکر کہا کہ آج تو میاں جی غصہ کی جگہ الٹے مجھ پر ترس کھانے لگے اور لید بھر کر میرے ٹوکرے میں ڈال دی۔ شیخ نے فرمایا۔ ''بس اب کام ہوگیا۔''

صبح ہوتے ہی شاہ نظام الدین رحمتہ اللہ علیہ نے شاہ ابوسعید رحمتہ اللہ علیہ کو طویلہ سے بلا کر چھاتی سے لگایا اور فرمایا کہ خاندان چشتیہ کا فیضان میں ہندوستان سے لیکر آیا تھا۔ تم ہی ہو جو میرے پاس سے اس فیضان کو ہندوستان لیے جاتے ہو۔ مبارک ہو وطن جاؤ۔ غرض مجاز حقیقت بنا کر ہندوستان واپس فرمایا۔ (حکایات اولیاء صفحہ ۲۲۹)

ایک ممتاز عالم کا قصہ

ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ ایک ممتاز عالم دین ان کے حلقہ میں شامل ہوئے۔ کچھ دنوں کے بعد بزرگ کا ملک بھر کے دورے کا پروگرام بنا، اس دورے میں حسب سابق علماء اور مریدین کی کافی تعداد شریک تھی۔ بزرگ نے ممتاز عالم کے ذمہ یہ ڈیوٹی لگائی کہ سفر کے دوران جب وہ گھوڑے پر سوار ہوں تو ان کی جوتی سر پر اٹھا کر چلیں۔ چوں کہ ممتاز عالم دین کو اپنی ذاتی اصلاح کی فکر بزرگ کی خدمت میں لے آئی تھی، اس لیے اس نے بزرگ کے اس حکم پر سر تسلیم خم کیا اور دورے کے دوران یہ خدمت سرانجام دیتے رہے۔ دوران سفر ہی علمائے کرام نے مل کر بزرگ کو درخواست کی کہ یہ خدمت ممتاز عالم دین سے لینے کی بجائے اس کے لیے ہم تیار ہیں۔ یہ خدمت ہم میں سے کسی کے سپرد ہو۔ بزرگ نے فرمایا کہ جب تک ممتاز عالم کے اندر بڑائی کا احساس اور جذبہ موجود رہے گا تب تک ان سے اس طرح کی خدمت لی جاتی رہے گی۔ جوں ہی ان کے اندر سے یہ جذبہ ختم ہوا، میں خود ان کے جوتے سر پر اٹھا کر لے چلوں گا۔

حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں کے واقعات

حضرت مرزا مظہر جان جاناں شہیدؒ اپنے دور کے بہت بڑے بزرگ تھے۔ وہ؟ نفیس اور نازک مزاج شخصیت کے حامل تھے۔ حکایت اولیاء میں مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ان کے بارے میں ایک واقعہ لکھا ہے:

ایک عورت کی؟ نہایت تھی۔ حضرت مرزا مظہر جان جاناں کو الہام ہوا کہ اگر اس عورت سے نکاح کرو اور اس کی بدزبانی وایذا دہی پر صبر کرو تو تم کو نواز لیا جائے گا۔ حضرت نے فوراً پیام بھیجدیا اور اس سے نکاح کرلیا۔ وہ عورت اس قدر تند خو، بدخصلت سخت دل اور فحش گو تھی کہ الامان والحفیظ۔ حضرت مرزا صاحب خوشی خوشی دولت خانہ تشریف لے جاتے اور وہ سڑی سڑی سنانا شروع کردیتی۔ وہ چپکے بیٹھے سنتے رہتے زبان سے اف نہ نکالتے۔ اندر گھلتے رہتے۔ آخر واپس تشریف لے آتے

تھے۔ آپ کا معمول تھا کہ روزانہ صبح ہوتے ہی خادم کو حکم فرماتے کہ جاؤ دروازہ پر حاضر ہو کر میرا سلام عرض کرو۔ اور پوچھو کوئی کار خدمت ہو تو انجام دیا جائے۔ بموجب ارشاد خادم آستانے پر حاضر ہوتا اور شیخ کا سلام پہنچا کر مزاج پرسی کرتا۔ وہ نیک بخت بجائے جواب سلام گالیاں سناتی اور وہ وہ مغلظات بکتی تھی کہ سننے والے شرما جاتے تھے۔ مگر مرزا صاحب کی خادم کو تاکید تھی کہ دیکھو اہلیہ کی شان میں گستاخی نہ ہونے پائے، کسی بات کا جواب مت دینا۔ جو کچھ فرمادیں سن لینا۔ ایک روز کوئی ولایتی خادم اس خدمت پر مامور ہوا ہر چند اس کو تاکید کی جواب نہ دیا جائے مگر بے چارہ ضبط نہ کر سکا۔ جب دروازے پر پہنچ کر حضرت کا سلام پہنچایا، مزاج پرسی کی تو عورت نے بکنا شروع کیا۔ پیر بنا بیٹھا ہے اسے یوں کروں اور یوں کروں۔ ہر چندکہ ولایتی نے ضبط کی کوشش کی مگر آخر کہاں تک۔ پیر کو گالیاں نہ سن سکا اور غصہ میں آ کر کہا۔ بس چُپ رہ ورنہ گردن اڑا دوں گا۔ اس جواب پر وہ نیک بخت اور آگ بگولا ہوگئی۔ اب لگی ہونے تُو تُو مَیں مَیں۔ غل کی آواز جو مرزا صاحب کے کان میں پہنچی تو گھبرا اٹھے اور جلدی سے ولایتی کو واپس بلا بھیجا۔ اس کو بٹھایا اور فرمایا تم ناواقف ہو۔ دوسرے خادم کو بھیجا وہ گالیاں سن کر واپس آ گیا۔ حضرت مرزا صاحب اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میں اس عورت کا نہایت ممنون واحسان مند ہوں۔ اس کے باعث مجھے بہت نفع پہنچا ہے۔ اور حقیقت میں اس کے شدائد اور سختیوں کی برداشت کرتے کرتے۔ حضرت مرزا صاحب کے اخلاق غایت درجہ مہذب ہوگئے اور آپ کے مزاج کی نفاست اور نزاکت ختم ہوگئی۔''

حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں ؒ کا اب دوسرا واقعہ ملاحظہ ہو۔

مرزا جانِ جاناں رحمتہ اللہ علیہ کا معمول تھا کہ جامع مسجد میں جب جمعہ کی نماز کے لیے تشریف لاتے تو جنوبی دروازے سے داخل ہوتے اور جب نماز سے فارغ ہو کر تشریف لے جاتے تو مشرقی دروازے سے جاتے۔

جمعہ کے بعد شرقی دروازہ کی شمالی سہ دری میں ایک بزرگ مصلے! بچھا کر بیٹھتے تھے، اور ان کے سامنے ایک مٹی کا لوٹا اور اس کے اوپر ایک گھسی ہوئی اینٹ رکھی ہوتی تھی جب مرزا صاحب نماز سے فارغ ہو کر تشریف لاتے تو ان بزرگ کے لاتیں مارتے اور برا بھلا کہتے اور ان کے نیچے سے مصلہ نکال کر پھینک دیتے، لوٹا اٹھا کر توڑ دیتے اور اینٹ کو بھی اٹھا کر پھینک دیتے اور یہ کر کے روانہ ہو جاتے۔ لوگ اس حرکت کو دیکھ کر مرزا صاحب کی شان کے خلاف سمجھ کر اس پر تعجب کرتے۔ مگر کسی کو دریافت کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ کسی خاص شخص نے جرأت کر کے دریافت کیا کہ حضرت یہ کون بزرگ ہیں اور آپ ان کے ساتھ یہ برتاؤ کیوں کرتے ہیں۔ مرزا صاحب نے فرمایا کہ واقعہ یہ ہے کہ جب ہم لڑکے تھے تو یہ بھی ہمارے چاہنے والوں میں سے تھے۔ اور یہ بھی ہمارے پاس آیا کرتے تھے۔ اس وقت ان کے ساتھ یونہی ہاتھا پائی ہوا کرتی تھی۔ مگر صرف یہی ایک شخص تھا جو برابر آتا رہا۔ اب خدا نے ہمیں ہدایت کی اور ہم سلوک کی طرف متوجہ ہوئے اور خدا کے فضل سے صاحب اجازت ہوئے۔ ایک روز ہمیں خیال ہوا کہ یہ شخص باوفا دوست ہے اس کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ میں نے جو اس کی طرف توجہ کی تو میں اس کے عکس ہی میں ڈوب گیا۔ اور میں نے اس کو اپنے سے بہت اونچا دیکھا، اب میں نہایت پریشان ہوا اور میں نے اس کا نہایت ادب کیا۔ اور اپنی جگہ اس کے لیے چھوڑی اور کہا کہ میں اس جگہ کے قابل نہیں ہوں۔ آپ میری جگہ تشریف رکھیں۔ اور میں آپ کی جگہ۔ مگر وہ نہ مانا۔ میں نے نہایت اصرار کیا مگر اس نے میرے اصرار پر بھی نہ مانا اور کہا کہ تمھیں میرے ساتھ وہی برتاؤ کرنا ہوگا جواب تک کرتے رہو۔ میں نے اس کی بات نہ مانی اس پر انہوں نے میری تمام کیفیت سلب کر لی۔ اب میں بہت پریشان ہوا اور میں نے کہا کہ میری کیفیت دیدو۔ اس پر اس نے کہا کہ اس شرط پر واپس کرتا ہوں کہ وعدہ کرو کہ مجھ سے ہمیشہ وہی برتاؤ کرتے رہوگے

جو بچپن میں کرتے رہے ہو یہاں نہیں، بلکہ جامع مسجد میں سب لوگوں کے سامنے۔
(حکایاتِ اولیاء صفحہ ۲۵)

مولانا اسماعیل شہیدؒ کی خاکساری

مولانا محمد اسماعیل شہید کا معمول تھا کہ سفر میں جب لوگ سوجاتے تو وہ مسافروں کے پاؤں دباتے تھے، اس لیے تاکہ تواضع اور تذلل پیدا ہو، ایک بار مولانا دورانِ سفر لشکر سے نکل کر شہر کی کسی مسجد میں ٹھہرے، مؤذن نے مولانا کو مسجد میں ٹھہرنے کی اجازت نہ دی، مولانا نے اس کی بات نہ مانی، چنانچہ مؤذن نے انہیں دھکے دیکر مسجد سے نکالا، مولانا واپس مسجد میں آئے، اس طرح کئی بار ہوا، آخر مؤذن نے تنگ آ کر کہا، اچھا بھائی بیٹھ جاؤ، تھوڑی دیر بعد لشکر میں سے دو سوار (سپاہیانہ وردی میں) مولانا کو تلاش کرتے ہوئے مسجد آئے۔ مؤذن نے جب یہ صورت حال دیکھی تو وہ ڈر گئے۔ اسے اندازہ ہوا کہ یہ کوئی بڑی شخصیت ہیں، میں نے ان کے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے اب مار پڑیگی، لیکن مولانا نے ان سے کہا ڈرومت، میں نے بات دل سے نکال دی ہے، میں جا کر تمہارے لیے کھانا بھجوادوں گا۔ مؤذن نے مولانا کے پاؤں پر گر کر معافی مانگی اور پوچھا کہ آپ نے میرے رویے کے مقابلہ مین خاکساری کا رویہ کیوں اختیار کیا، مولانا نے فرمایا میں نے اس طرح اپنا علاج کیا ہے لوگ مجھے بڑا سمجھتے ہیں، اور بعض اوقات دل میں بڑائی کا احساس بھی پیدا ہونے لگتا ہے اس طرح میں نے اپنا علاج کیا ہے۔

ایک بار مولانا محمد اسماعیل شہید وعظ فرمارہے تھے۔ دوران وعظ ایک شخص اٹھا، اس نے کہا مولوی صاحب ہم نے سنا ہے کہ تم حرامی ہو۔ آپ نے نہایت متانت سے جواب دیا کہ میاں تم نے غلط سنا ہے میرے ماں باپ کے نکاح کے گواہ بڈھانہ، پھلت اور خود دہلی میں موجود ہیں۔ یہ فرما کر پھر وعظ شروع کر دیا۔

مولانا شاہ اسماعیل شہید ایک بار عشاء کی نماز پڑھ کر لال بازار گئے۔ وہاں وہ

بازار کی ایک معروف عورت موتی کے مکان پر پہنچے۔ وہاں بہت ساری عورتیں اور مرد موجود تھے۔ مولانا نے آواز دی، ایک لڑکی نکل آئی، لڑکی کے سوال پر مولانا نے بتایا کہ وہ فقیر ہیں۔ لڑکی پیسے لیکر آئی، مولانا نے کہا کہ میری ایک صدا ہے۔ بغیر صدا کہے میری لینے کی عادت نہیں۔ چنانچہ مولانا کو اندر بلایا گیا۔ مولانا شاہ اسماعیل صحن میں رومال بچھا کر بیٹھ گئے۔ اور سورۂ والتین تلاوت فرمائی۔ اور درد اور جذبات میں ڈوبی ہوئی تقریر کی۔ اس تقریر کا یہ اثر ہوا کہ وہاں موجود عورتیں اور مرد زار وقطار رونے لگے اور ڈھولک اور ستار یعنی گانے بجانے کا سازوسامان توڑنے لگے۔ اس کے بعد مولانا چلے آئے۔ دوسرے دن شہر میں یہ واقعہ مختلف طریقوں سے پھیلا جس سے مولانا محمد اسماعیل کی عزت متاثر ہونے لگی۔ مولانا محمد یعقوب صاحب نے مولانا شاہ اسماعیل شہید سے کہا کہ تمہارے دادا شاہ ولی اللہ تمہارے چچا شاہ عبدالعزیز تو اتنی مقدس شخصیتیں تھیں لیکن تم نے تو اپنے آپ کو بہت ذلیل کر لیا ہے۔ اتنی پستی بھی ٹھیک نہیں۔ اس پر شاہ اسماعیل شہید نے فرمایا آپ اسے میری ذلت سمجھتے ہیں (یعنی لوگوں میں میرے کردار کے بارے میں چہ میگوئیاں ہونا) یہ تو کچھ بھی نہیں، میری عزت تو اس وقت ہوگی جب دہلی کے بدمعاش میرا منہ کالا کر کے اور گدھے پر سوار کر کے مجھے چاندنی چوک میں (جلوس کی صورت میں) لے آئیں گے اس وقت میں کہوں گا قال اللہ کذا وقال اللہ کذا۔ (حکایات اولیاء صفحہ ۸۴ مرتب مولانا اشرف علی تھانویؒ)

اس واقعہ سے اندازہ لگایئے کہ اپنی ذات کی فنا کس طرح ہوتی ہے۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی کی تواضع

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی جس طالب کے اندر تکبر دیکھتے تھے تو اس سے کبھی کبھار جوتے اٹھواتے تھے اور جس کے اندر تواضع دیکھتے تھے اس کے خود جوتے اٹھالیتے تھے۔ (حکایات اولیاء)

مولانا احمد حسین (جو خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے) ان کا کہنا ہے کہ میں جب مولانا نانوتوی سے تعلیم کے حصول کے لیے آیا تو ایک جولاہا آیا اور اس نے مولانا نانوتوی کو دعوت دی، مولانا نے اس کی دعوت قبول کی مجھے اس سے بہت اذیت ہوئی کہ مولانا جیسی شخصیت نے اتنے معمولی آدمی کی دعوت قبول کرلی، میں نے اس کا اظہار بھی کیا، اس کے بعد یہ ہوا کہ جو کوئی بھی مولانا کی دعوت کرتا تو مولانا اس کے سامنے یہ شرط رکھتے کہ مولوی احمد حسن کی بھی دعوت کرو تو مجھے دعوت منظور ہے۔ اس طرح مولانا نے میرے اندر سے بڑائی کے احساس کو نکال دیا۔ (حکایاتِ اولیاء)

مولانا محمد قاسم نانوتوی کے بچپن کے ایک ساتھی مولوی امیر الدین صاحب تھے، جو مولانا کو ہر مجلس میں اوئے قاسم اور ابے قاسم کے انداز سے مخاطب ہوتے تھے۔ مولانا نے ان کو کہہ رکھا تھا کہ اگر تم مجھے اس طرح خطاب نہ کروگے تو تم سے ہمارے تعلقات ختم ہوجائیں گے۔ (حکایاتِ اولیاء صفحہ ۲۳۶ مصنف مولانا اشرف علی تھانویؒ)

مولانا رشید احمد گنگوہی کا واقعہ

مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ایک بار اپنے مرشد کے ہاں تھانہ بھون تشریف لائے۔ کئی دن قیام رہا۔ ایک بار ان کے مرشد نے ان کا امتحان لینے کے لیے عجیب طریقہ اختیار کیا۔ ہوا یہ کہ کھانے کے لیے دستر خوان بچھ گیا۔

حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور مولانا گنگوہی کھانے کے لیے دستر خوان پر بیٹھ گئے۔ حاجی صاحب نے قیمہ کی پلیٹ مہمان سے بہت دور رکھدی۔ اسی اثناء میں حاجی امداد اللہ کے بھائی صاحب ضامن شہید بھی تشریف لائے، انہوں نے حاجی صاحب سے کہا۔ بھائی جان، قیمہ کی پلیٹ مہمان کے قریب رکھدیں۔ تاکہ انہیں قیمہ نکالنے میں آسانی ہو، حاجی صاحب نے کہا کہ یہ تو چماروں سے بھی گئے

گزرے ہیں، یہ ہم ہیں کہ ہم نے انہیں اپنے ساتھ دستر خوان پر بٹھایا ہے۔ یہ کہہ کر حاجی صاحب نے مولانا گنگوہی کے چہرے پر نظر ڈالی لیکن ان کا چہرہ تاثرات سے خالی تھا۔ (حکایات اولیاء مولانا اشرف علی تھانویؒ)

مولانا اشرف علی تھانویؒ کی منکسر المزاجی

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ اپنے بارے میں کہتے ہیں: میں بقسم کہتا ہوں کہ میں اپنے اندر کوئی کمال نہیں پاتا، نہ علمی، نہ عملی، نہ حالی، نہ قالی، بلکہ مجھ میں تو سراسر عیوب ہی عیوب بھرے پڑے ہیں، اگر کوئی میری تعریف کرتا ہے تو اسی وقت اپنے دس عیوب میرے پیش نظر ہوجاتے ہیں۔ (تاثر الحکیم الامت صفحہ ۱۱۰)

مولانا اشرف علی تھانوی صاحب اپنے بارے میں مزید کہتے ہیں: میں تو اپنے کو کتوں (اور ....) سے بھی بدتر سمجھتا ہوں اگر کسی کو یقین نہ ہو تو اس پر حلف اٹھا سکتا ہوں۔

مزید فرماتے ہیں: میں حلفیہ کہتا ہوں کہ مجھ کو تو اپنی نماز، اپنے روزے اور اپنے ہر عمل بلکہ اپنے ایمان تک میں شبہ عدم خلوص کا رہتا ہے، اور ہم لوگ کیا چیز ہیں صحابہ کرام سے بڑھ کر کون مخلص ہوگا۔ حدیث میں وراد ہے کہ اصحاب بدر میں سے ستر ۷۰ حضرات ایسے تھے جن کو اپنے اوپر نفاق کا شبہ تھا کہ کہیں ہم منافق تو نہیں۔ (ایضا صفحہ ۱۳۱)

حکیم الامت اور روحانی مریضوں کا علاج

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ممتاز مرید مولانا قاری محمد طیب نے مولانا کے سامنے شکایت کی کہ جب سے انہیں مدرسہ سے سند فراغت ملی ہے، ان کے اندر سے علم کا زعم نہیں جاتا۔ مولانا نے انہیں حکم دیا کہ وہ دو ماہ تک مسلسل نمازیوں کے جوتے درست کرتے رہیں۔ چنانچہ وہ پانچوں وقت بیٹھ کر نمازیوں کے

جوتے درست کرتے رہے۔ اس تدبیر سے ان کا علاج ہوگیا۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ایک مرید عبدالمجید کے نام سے تھے، عبدالمجید مولانا کو بہت پیارے تھے۔ ایک بار مجلس میں ان سے نکل گیا کہ فلاں فلاں شخص کو کیا معلوم، ان کو آتا ہی کیا ہے، قرآن وسنت کی بات مجھ سے پوچھو، جب مولانا اشرف علی تھانوی کو ان کی یہ بات معلوم ہوئی تو مولانا نے ان کو سزا کے طور پر یہ حکم دیا کہ وہ ہر مجلس میں اپنا تعارف اپنے پیشے کے ساتھ کرایا کریں کہ میں عبدالمجید بڑھئی ہوں (وہ بڑھئی تھے) چنانچہ وہ تین ماہ تک ہر مجلس میں اس طرح اپنا تعارف کراتے رہے۔

نتائج

یہ ہزاروں واقعات میں سے کچھ واقعات ہیں جو .... پیش کیے گئے ہیں تاکہ اسلاف کی انداز تربیت کا اندازہ ہوسکے۔ ان واقعات اور اقتباسات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارے اکابر اور اسلاف۔ رعونت، تعلّی اور کبر سے کتنے خائف رہتے تھے اور اس کے لیے کس قدر ریاضتیں کراتے تھے اور کرتے تھے چونکہ انفرادی واجتماعی نااتفاقی اور لڑائی جھگڑے کا باعث تکبر ہی ہوتا ہے، اسی سے غصہ، حسد اور جب جاہ پیدا ہوتے ہیں اور معاشرہ فساد سے بھر جاتا ہے نیز یہ مرض افراد کے مزاج کی گہرائیوں ہی میں موجود ہوتا ہے اس کی اصلاح آسانی سے نہیں ہوتی، اس کے لیے طویل عرصہ تک ریاضتیں کرنی پڑتی ہیں۔ چنانچہ بزرگوں کی صحبت کا سب سے بڑا فائدہ ہی یہ ہوتا ہے کہ مزاج میں فروتنی، نفس کشی، تواضع اور انکساری پیدا ہوجاتی ہے اس کے بعد اصلاح نفس کا کام آسان ہوجاتا ہے۔ درج بالا واقعات سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ جب باطنی آنکھ کھل جاتی ہے اور اللہ کی معرفت اور عظمت پیدا ہوجاتی ہے اور قلب کی ٹی وی سے معارف وحقائق کا مشاہدہ ہونے لگتا ہے تو پھر فرد کائنات میں اپنی حیثیت ذرہ سے بھی کم تر تصور کرنے لگتا ہے۔ جب

اسے اس حقیقت کا ادراک ہونے لگتا ہے کہ کائنات کی ساری چیزیں اپنے اپنے مقاصد کی تکمیل اور عبادت میں مصروف ہیں وہ ایک لمحہ کے لیے بھی عبادت سے غافل نہیں ہیں جب کہ ہم عبادت سے ہولناک غفلت کا شکار ہیں تو اس چیز سے ان کے اندر خوف وخشیت اور کمال درجہ کی خاکساری پیدا ہوتی ہے۔

اسلاف کے ان واقعات سے یہ نکتہ سمجھ لینا چاہیے کہ جب تک ہماری نفسیات میں بنیادی تغیر واقع نہ ہو اور اللہ کی عظمت اور معرفت پیدا نہ ہو تب تک یہی ہوتا رہے گا کہ اپنے معاصروں کی خوبی یا تعریف سن لینے سے بدن میں آگ سی لگ جائے گی اور یہی کوشش ہوتی رہے گی کہ معاصر شخصیتوں اور معاصر اداروں کی اہمیت اور وقعت ختم ہوجائے اور جب تک معاصر شخصیتوں اور اداروں کی تنقیص تحقیر اور تذلیل نہ ہوگی تب تک تسکین حاصل نہ ہوگی۔ اس لیے تعلّی اور تکبر کو ام الامراض کہا گیا ہے۔ اس کی موجودگی میں دین کے لیے ہونے والی ساری کوششیں نتائج کے اعتبار سے لاحاصل رہیں گی۔

ایک بزرگ نے ہمارے قومی امراض کی نشاندہی کرتے ہوئے کتنی اہم بات کہی ہے "اس گئی گزری حالت میں بھی مسلمانوں کے اندر دوسروں سے زیادہ حکومت کرنے کی صفات موجود ہیں۔ مثلاً عدل، انصاف، ترحم وغیرہ۔ بس کمی یہ ہے کہ ان میں نظم نہیں ہے اور نظم نہ ہونے کا سبب یہ ہے کہ اتحاد اور اتفاق نہیں ہے اور اتحاد واتفاق کی جڑ تواضع اور فروتنی ہے۔ اگر ہر شخص اپنے آپ کو دوسروں سے کم تر سمجھنے لگ جائے تو پھر نااتفاقی کی نوبت ہی نہ آئے۔ کیوں کہ نااتفاقی اسی سے تو پیدا ہوتی ہے کہ ہر شخص خود کو دوسروں سے افضل سمجھتا ہے اور ان سے آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ حالت یہ ہے کہ کسی کو اپنے سے بڑا تسلیم کرلینے میں عار آتی ہے۔ جب تک کسی کو بڑا تسلیم نہ کیا جائے مرکزیت جو نظم کے لیے ضروری ہے قائم نہیں ہو سکتی۔"

مضمون کے آخر میں ہم حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کی کبر اور بڑائی کے موضوع پر ایک تقریر کا خلاصہ اپنی زبان میں پیش کرتے ہیں۔ یہ اس موضوع پر ایک جامع تحریر ہے۔

کبر تمام گناہوں کفر و شرک کی بھی جڑ ہے

جب اللہ کی معرفت نہ رہے گی اور بندہ صفت کبریا کو اپنے اندر لینا چاہے گا تو پھر اس کے نتیجہ میں جتنی بھی مضرتیں اور عیوب پیدا ہوں وہ کم ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ صفت کبر ہی وہ چیز ہے جو تمام مفاسد کی جڑ ہے حتیٰ کہ شرک کی دنیا میں جو کوئی بھی کافر ہوا ہے وہ اپنے نفس کے کبر اور بڑائی کی وجہ سے ہی کافر ہوا ہے ورنہ حق مخفی نہیں رہتا۔ وجحدوا بھا واستیقنتھا۔ الایۃ۔ یہاں ظلم اور بڑائی کو سبب فرمایا ہے۔ جحد کا، علو اور کبر ہم معنیٰ ہیں۔ ابو طالب کو ایمان لانے سے کس چیز نے روکا۔ صرف اس عار نے کہ مرتے وقت ایمان لاؤں گا۔ تو میری قوم کہے گی کہ ابو طالب دوزخ سے ڈر گیا۔ اس کی حقیقت یہی تو ہے کہ قوم کے اندر جو مقام اور رفعت حاصل ہے وہ باقی نہ رہے گی۔ اس رفعت اور ناموری نے پیچھا نہ چھوڑا۔ یہاں تک کہ کام تمام ہوگیا۔ یہ کبر کسی خاص گروہ میں نہیں ہوتا بلکہ یہ وہ عام مرض ہے جس میں کم وبیش ہر طبقہ کے لوگ مبتلا ہیں۔ دوسرے عیوب میں تو اکثر جاہل لوگ ہی مبتلا ہوتے ہیں۔ تعلیم یافتہ لوگوں میں وہ عیب کم ہوتے ہیں۔ کیوں کہ وہ ان کے برے نتائج سے واقف ہوتے ہیں لیکن کبر اور جذبۂ بڑائی میں سب عالم کم وبیش مبتلا ہیں۔ مشرکین عرب تو جاہل تھے۔ اس گروہ کو دیکھیے جو تعلیم یافتہ کہلاتا تھا۔ یعنی اہل کتاب ان کو بھی ایمان لانے میں جو چیز رکاوٹ بنی وہ کبر ہی تھا۔ غور کر کے دیکھیے تو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ اور بہت سارے گناہوں کا سبب بھی کبر ہے ایسے گناہ جو کفر و شرک سے نیچے ہیں۔ ایسے گناہ کبر سے اس طرح ہوتے ہیں کہ گنہگار اپنے برے عمل کو صرف اس عار کی وجہ سے نہیں چھوڑتا کہ لوگ کہیں گے کہ کیا اتنے روز

سے یہ احمق رہا اس کام کو ہمیشہ سے کیوں کرتا رہا کہ اب چھوڑنا پڑا۔ اس شخص نے عیب حماقت سے اپنے نفس کو بچایا یہی کبر بڑا مرض ہے۔

چونکہ یہ مرض اللہ کی عظمت سے بے خبری کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے اس لیے اس کا علاج اللہ کی معرفت ہی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی عظمت، اسے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اپنے واسطے ثابت کیا ہے۔ ولہ الکبریآء یعنی اسی کے واسطے ہے عظمت۔ بلاغت کے قاعدے سے لہ کو مقدم کرنے کا مطلب یہی ہے کہ عظمت مخصوص ہے ذات باری تعالیٰ کے ساتھ یہ صفت دوسرے میں بالکل نہیں ہوسکتی۔ نیز یہ نہیں فرمایا ولہ الکبریا العظمیٰ کہ بڑی عظمت تو حق تعالیٰ کے لیے ہے۔ اس کے معمول حصے دوسروں کے لیے بھی ثابت ہیں۔ بلکہ مطلق کبریا کو دوسروں سے نفی کر دیا۔ اسی کو حدیث میں اس لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ العظمۃ ازاری والکبریاء ردائی فمن فاوعنی فیھا فصمتہ یعنی عظمت میرا تہ بند ہے اور کبر میری چادر ہے جو کوئی ان دونوں کو مجھ سے چھیننا چاہے گا میں اس کی گردن توڑ دوں گا۔ چادر اور تہ بند فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ یہ دونوں صفتیں خاص میرے لیے ہیں دوسرا کوئی مدعی ہوگا تو میں اس کو سزا دوں گا۔ جب کبر اللہ تعالیٰ کا حق ہوا تو اپنے نفس میں اس کو رکھنا یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ مساوات ہوئی اور دیگر معاصی کے لیے تو حدود مقرر ہیں کہ جب تک ان تک نہ پہنچے معصیت نہیں ہوتی مثلاً کھانا کہ جب تک اتنا زیادہ کھایا جائے کہ مرض کا سبب بن جائے تب تک مباح ہے یا بھوکا رہنا جب تک کہ سبب نہ ہو جائے ہلاکت کا، جائز ہے۔ مگر کبر وہ معصیت ہے کہ اس کے لیے کوئی حد نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں لایدخل الجنۃ من کان فی قلبہ مثقال ذرۃ من کبر یعنی جس کے دل میں ذرہ برابر بھی کبر ہوگا وہ جنت میں نہ جائے گا۔

ایک حدیث میں اس سے بھی زیادہ سختی ہے۔ اخرجو من النار من کان فی قلبہ مثقال ذرۃ من ایمان یعنی قیامت کے دن حکم ہوگا کہ جس کے دل میں ذرہ برابر بھی

ایمان ہے اسے دوزخ سے نکالا جائے گا۔ اسے پہلی حدیث سے ملایئے تو کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ وہاں فرماتے ہیں کہ جس کے دل میں ذرہ برابر بھی کبر ہے وہ جنت میں نہ جائے گا۔ یہاں فرماتے ہیں کہ جس کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہے وہ جنت میں جائے گا۔ اس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ جس کے دل میں ذرہ برابر کبر ہے اس میں ذرہ برابر ایمان نہیں ہوسکتا۔ اور جس کے ذرہ برابر ایمان ہے اس میں ذرہ برابر کبر نہیں ہوسکتا۔ دونوں ایک دوسرے کے متضاد ہیں گو اس کی توجیہ یہ ہے کہ جنت میں جانے کے وقت ذرہ برابر کبر نہ ہوگا لیکن آخر اس سے بھی تو اس صفت کا متضاد ایمان کسی درجہ میں ہونا ثابت ہوا۔ اس سے سمجھا جاسکتا ہے کہ کبر کتنا بڑا گناہ ہے اور ہونا بھی چاہیے کیوں کہ کفر سب سے بڑا گناہ ہے کفر کی بنیاد کبر ہی تو ہے۔ کفر کبر کی شاخ ہے۔ تو مسلمان کو چاہیے کہ غور کرے کہ کہیں اس کے دل میں کبر تو نہیں۔ مگر ہماری تو یہ عادت ہے کہ سوچتے ہی نہیں ورنہ معلوم ہوجاتا کہ نہ دیندار خالی ہیں کبر سے نہ دنیا دار، جو دیندار کہلاتے ہیں۔ وہ دین کے پیرایہ میں اس گناہ میں گرفتار ہیں۔ اور اپنے آپ کو سمجھتے ہیں کہ ہم دنیا داروں سے اچھے ہیں۔ ان کو جتنی ترقی نماز پڑھنے سے ہوتی ہے اس سے زیادہ اس برائی سے تنزل ہوتا ہے ان کے دل میں دین کے ساتھ ساتھ بدترین قسم کی دنیا شدت کے ساتھ موجود ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ نماز میں جب یہ خرابی ہے تو نماز کو چھوڑ دینا چاہیے۔ اصل یہ ہے کہ یہ خرابی نماز میں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب قلب میں حق تعالیٰ کی عظمت موجود نہیں ہوتی اور جب عظمت موجود ہو تو توجہ دوسری طرف جا نہیں سکتی بلکہ حق تعالیٰ کی عظمت کی وجہ سے آدمی اپنی نماز پر فخر کرنے کی بجائے شرمندہ ہوتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک ذلیل انسان بہت بڑے شاہنشاہ کے حضور میں بہت کم قیمت کا تحفہ لے جائے دربار کی عظمت وشوکت دیکھ کر اس کی کیا حالت ہوگی۔ مختصر یہ کہ اس ذلیل تحفہ کو پیش کرنے پر بھی اس کو قدرت نہ ہوگی ہاتھ پیر

پھول جائیں گے اور غنیمت سمجھے گا کہ کسی سزا کا حکم نہ ہوجائے۔ جلدی کسی طرح یہاں سے نکل جاؤں۔ ہماری نمازوں کی جو حقیقت ہے وہ خوب معلوم ہے پھر اس کو حق تعالیٰ جیسے احکم الحاکمین کے سامنے پیش کرکے ذرا بھی شرم نہ آنا اسی وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت دلوں میں موجود نہیں رہی اور اسی سے یہ خرابی پیدا ہوئی ہے کہ توجہ دوسری طرف چلی جاتی ہے اور اپنی نماز کو کچھ سمجھ کر دوسروں کو حقیر سمجھنے لگ جاتے۔ اس تقریر سے بخوبی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ نماز پڑھنے یا اور دین کے احکام بجا لانے سے اگر دل میں کبر پیدا ہو تو اس کا علاج یہ نہیں کہ اس عمل کو چھوڑ دیا جائے۔ بلکہ اصل سبب کو چھوڑ دیا جائے۔ اس کبر کا سبب دین کے حکم کی تعمیل نہیں ہے بلکہ دل میں عظمتِ الٰہی کا نہ ہونا ہے۔ دل میں عظمتِ الٰہی پیدا کرنا چاہیے۔ اس سے حکم کی تعمیل میں آسانی بھی پیدا ہوگی اور وہ خرابی جو اس کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ وہ بھی نہ رہے گی۔ اس غلطی میں بہت سے پڑھے لکھے اور سمجھ دار لوگ بھی مبتلا ہیں، خوب سمجھ لو، غرض ہمارے دیندار بھی کبر میں مبتلا ہیں اور دنیا دار بھی۔ دنیا داروں میں اس طرح کا کبر تو نہیں ہے جو دینداروں میں ہوتا ہے، ہاں دنیا داروں میں کبر کے اور طریقے موجود ہیں۔ وضع میں، لباس میں، شادی بیاہ میں، کبر میں دوسرے گناہوں کے مقابلے میں ایک اور خرابی بھی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان غلطی یا حالات کی ستم ظریفی کی وجہ سے دوسرے گناہ تو کر جاتا ہے لیکن دل میں اسے چوٹ ضرور لگتی ہے اور پریشان ضرور ہوتا ہے مگر کبر ایسا گناہ ہے کہ یہ گناہ ساری عمر دل میں رہتا ہے اور دل پر صدمہ بھی نہیں ہوتا جیسے اس نے سرے سے کوئی گناہ ہی نہیں کیا۔

تو ہر اس عمل کو جو کبر کی شاخ ہو چھوڑ دو۔ جیسے غیبت، حسد، وغیرہ۔ آدمی غیبت اس وقت کرتا ہے جب وہ اپنے آپ کو دوسروں سے اچھا سمجھتا ہے۔ کسی مریض پر وہی شخص ہنستا ہے جو خود تندرست ہو۔ اگر فرد خود مریض ہو تو وہ اپنے سے کم مریض پر نہیں ہنسے گا۔ یہ اچھا سمجھنا ہی دراصل کبر ہے۔ اسی طرح جو آدمی دو

سروں کی نعمت کو دیکھ کر جلتا ہے (جسے حسد کہتے ہیں) اس کی بنا بھی یہی ہے کہ فرد صاحب نعمت سے زیادہ اپنے آپ کو اس نعمت کا اہل سمجھتا ہے یہ بھی اپنے نفس کی بڑائی ہی ہے جسے کبر کہتے ہیں۔ غرض اکثر گناہوں کو ٹٹولو گے تو اس کی بنیاد کبر ہی پاؤ گے۔ لہذا کبر کو چھوڑ دو تاکہ معاصی کی اصل ہی دل سے نکل جائے۔ کیوں کہ بڑائی کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ساتھ مخصوص فرمایا ہے۔ کسی دوسرے کا اس میں حصہ نہیں تو جو شخص کبر کو نہیں چھوڑتا وہ نہیں پہچانتا کہ یہ کس کا حق تھا۔ اور کس کو دینا تھا۔ تو اس نے نہ تو نفس کا حق پہچانا نہ ہی حق تعالیٰ کا۔ اس سے بڑھ کر جاہل کون ہوگا۔ یہ شخص کبھی گناہ سے باز نہیں آسکتا۔ یہ شخص جس گناہ میں مبتلا ہو جائے کم ہے۔ کیوں کہ معاصی کی جڑ اس کے دل میں موجود ہے۔ ایک گناہ سے بچے گا دوسرے میں ضرور مبتلا ہو جائے گا۔

کبر کا ایک مجرب علاج

جس کی وجہ سے نہ چھوٹا گناہ ہو نہ بڑا۔ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس صفت کا استحضار رکھا جائے کہ بڑائی اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کے لیے کسی وقت اور کسی حالت میں بھی نہیں ہے اس طرح گناہ خود بخود چھوٹتے جائیں گے۔ اور وہ صفت عظمت ہے۔ ولہ الکبریآء فی السموات والارض. یہ اصل کل ہے تمام گناہوں سے حفاظت کی اور جب صفت کبریاء یعنی عظمت ذات باری تعالیٰ کے ساتھ ہوئی تو نفس کے واسطے کیا رہ گیا؟ تذلل، یہ ہے اصل تمام عبادت کی، تو جس شخص نے صفت کبریاء کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص مان لیا اس نے حق تعالیٰ کا حق بھی پہچان لیا اور نفس کا بھی۔ کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی عالم یا محقق ہوسکتا ہے؟ انہیں کی شان میں ہے واولئک ھم اولوا الالباب. یعنی یہی عقل مند لوگ ہیں جب آدمی کے دل سے تمام گناہوں کی اصل نکل گئی اور عبادات کی اصل جم گئی تو گویا سب کچھ پالیا۔ اس کو دن دگنی رات چوگنی ترقی ہوگی۔

(ماخوذ: ماہنامہ بیداری اگست ۲۰۰۸)

محمد موسیٰ بھٹو

خدا بیزاری کا جدید نظام

اور تصوف و اہل تصوف کا کردار

جدید تعلیم بہت ضروری ہے۔ ایک لحاظ سے یہ ہماری قومی ضرورت بن چکی ہے کہ اس کے بغیر مادی ترقی مشکل ہے، لیکن ایک اہم سوال، جس پر بہت کم غور و فکر ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ جدید تعلیم اپنے ہمراہ جو بڑے بڑے بت لاتی ہے، مادہ پرستی کا بت، خدا سے دوری و بے نیازی کا بت، دنیا، سامان دنیا، لذت دنیا ہی کو سب کچھ سمجھنے کا بت، مادی حسن پر حریصانہ طور پر ٹوٹ پڑنے کا بت، بے لاگ جنسی جذبات کی تسکین کا بت، بڑے پن کا بت، حقیقی انسانی قدروں کی پامالی کا بت، حرص و ہوس کا نہ ختم ہونے والا بت، جدید تعلیم میں کہیں بھی آخرت کے ذکر کو نہ آنے دینے کا بت، انسانوں کی پامالی، ان سے ہمدردی و رواداری کے خاتمہ کا بت، انسانوں کو جانور کی ترقی یافتہ صورت دے کر اس سے جانور والی روش اختیار کرنے کا بت، مذہب کو بے جان انفرادی مراسم تک محدود کر کے، عملی زندگی اور سماجی و معاشرتی معاملات میں مذہب کو مکمل بے دخل کرنے کا بت، زندگی کے ہر معاملہ میں اپنے نفس کی پوجا کا بت، ماں باپ، اہل خاندان اور رشتہ داروں سے دوئی کا بت، دولت اور سامان عیش ہی کو زندگی کے ہم معنیٰ قرار دینے کا بت۔

یہ ایسے بت ہیں، جو جدید تعلیم کی ساخت میں شامل ہیں، جدید تعلیمی ادارے جہاں بھی آتے ہیں، وہ اپنے ساتھ اس طرح کے سارے بتوں کو ہمراہ لاتے ہے۔ اس طرح اس ظالم نظام تعلیم نے مسلم دنیا کے کروڑوں سے زائد افراد کو خدا کے تصور سے بے گانہ کیا، نفس پرستی کی راہ پر گامزن کیا، خود غرضی کا مریض بنایا۔ مکر، عیاری، دھوکہ دہی اور اذیت رسانی کا مریض بنایا۔ اور ذہنی ونفسیاتی امراض کا شکار بنایا۔ اور

طرح طرح کی جسمانی اور روحانی بیماریوں کے تحفوں سے نوازا۔

چونکہ جدید تعلیم کے بانی و مبانی اہل مغرب ہیں اور انہوں نے خدا سے بغاوت کی بنا پر اس تعلیم میں الحاد و لادینیت اور مادی زندگی ہی سب کچھ ہے کا زہر اس طرح شامل کردیا ہے کہ ساری مخلصانہ کوششوں کے باوجود اس تعلیم سے اس زہر کو جدا کرکے، اس تعلیم کے حاملین میں خدا پرستی کے رنگ کو بھرنا اور انہیں مادی دوڑ میں شرکت کی کشمکش سے بچانا، اور انہیں توحید و آخرت کے لئے یکسو کرنا اور خالص مسلمان اور اسلامی داعی کی حیثیت سے زندگی گذارنا دشوار ہے۔ پچھلے سو ڈیڑھ سو سال میں اس سلسلہ میں بہت ساری کوششیں ہوچکی ہیں، لیکن ان کوششوں کا حاصل صرف اتنا ہوا ہے کہ کچھ افراد کو اچھا مسلمان بنایا جا سکا ہے اور دوچار فیصد افراد کو رسمی مسلمان بنانے میں کامیابی حاصل ہوسکی ہے، جدید تعلیمی اداروں کا یہ وہ بنیادی نتیجہ ہے، جس پر خوش ہونے کے بجائے خون کے آنسو بہانے کی ضرورت ہے۔ جو سوال بہت اہم ہے، وہ یہ ہے کہ کیا جدید تعلیمی اداروں کو اہل اسلام کے لئے مفید بنا کر ان اداروں سے وابستہ افراد کی اکثریت کے ایمان کو بچانے اور انہیں مادی دوڑ میں شریک ہوکر زندگی کو حب دنیا سے بچانے کی کوئی صورت ممکن ہے؟ اس سوال پر ملت کے ذہین افراد نے سو ڈیڑھ سو سال سے غور وفکر کیا ہے، لیکن اس سوال کے صحت مند جواب کی صورت پیدا نہ ہوسکی ہے۔

حکومت اس سلسلہ میں مؤثر کردار ادا کرسکتی ہے، لیکن ہمارے حکمران خود ان اداروں کے پروردہ ہیں، جو حب جاہ وحب مال کی خاطر ملک وقوم کو بیچنے کی روش پر گامزن ہیں۔ ہمارے دینی دعوتی ادارے و شخصیتیں بھی اس سلسلہ میں مفید کردار ادا کرسکتے ہیں اور وہ ایک حد تک ادا کررہے ہیں۔ لیکن جدید تعلیمی اداروں کے ذریعہ مادہ پرستی کا بڑھتا ہوا طوفان اتنا تیز ہے کہ چند دعوتی ادارے اس طوفان کا مقابلہ کر سکیں اور اپنے ساتھ وابستہ افراد یعنی اپنے حامیوں کے دین وایمان کے تحفظ کا فریضہ سرانجام دے سکیں اور صبغت اللہ کی بنیاد پر ان کی تربیت کرسکیں تو بجائے خود یہ بڑا کارنامہ ہوگا۔

تصوف کا ادارہ بھی اس سلسلہ میں مفید کردار ادا کرسکتا ہے، بلکہ ماضی میں تو مادہ پرستی اور مادی لذت اور کام و دہن کے حوالے سے جو بھی فتنے اور طوفان اٹھے ہیں، اہل تصوف نے ان کا بڑی موثر حکمت عملی کے ساتھ مقابلہ کیا ہے۔ اور لاکھوں افراد کی زندگیوں کو دنیا سے بے نیازی اور فکر آخرت کی تیاری اور سیرت وکردار کے اعتبار سے بہتر معیار پر پہنچایا ہے۔ موجودہ دور میں بھی تصوف کے کچھ ادارے ایسے ہیں، جو اس سلسلہ میں قابل قدر کردار ادا کررہے ہیں۔ لیکن دوسرے ملی اداروں کی طرح ہمارے اس دور کا تصوف بھی خرابیوں اور بگاڑ سے محفوظ نہ ہوسکا ہے۔

اہل تصوف کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ خود گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔ دیوبندی و بریلویت کے گروہ، پھر اس گروہی کشمکش میں توانائیوں کا صرف ہونا، دوسرا بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اہل تصوف میں ایسی بالغ نظر شخصیتیں نہ ہونے کے برابر ہیں، جو مسلم امت کو درپیش موجودہ چیلنج کو سمجھ کر اپنی صلاحیتوں کے مطابق اس چیلنج سے عہدہ برا ہونے کے لئے افراد کی تیاری کی سعی کریں۔

تیسرا نقص جو اہل تصوف میں موجود ہے، وہ یہ ہے کہ وہ نئے دور میں بھی تصوف کو پرانے مفہوم یعنی تصور شیخ، فنا فی الشیخ، شیخ کی تعظیم میں غلو کے سارے حدود پھلانگنا، بزرگ کی شان میں ایسے قصیدے لکھنا اور کہنا کہ اسے خدائی صفات میں شامل کرنا، پھر اپنے حلقۂ سے وابستہ افراد کی اس طرح تربیت کرنا، جس سے اصلاح نفس اور نفس مطمئنہ کے مراحل طے کرانے کے کام کو اہمیت دینے کی بجائے، القاء، الہام، کشف کو ہی مقصود سمجھنا، پھر مریدوں کی صحیح علمی اور ذہنی تربیت کے ذہن کا مفقود ہونا، اس طرح کی باتوں کی وجہ سے اہل تصوف سے وابستہ افراد جدید تعلیم

یافتہ افراد کے سامنے عجوبہ کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔

حقیقی تصوف تو نفس کی قوت کو مطیع کرنے، اللہ سے تعلق کو مستحکم کرنے، مادی دنیا سے دل نہ لگانے، اللہ کے بندوں سے محبت کرنے، سب کو اپنا سمجھنے، رواداری کا مظاہرہ کرنے، دنیا سے بے نیازی کا مزاج پیدا کرنے، دین کی خاطر مضطرب ہونے، اپنے خوشبوئے کردار سے معاشرہ میں دعوتی کام کا فریضہ سر انجام دینے وغیرہ اور حکمت وبصیرت اور فراست کی صلاحیتوں سے بہرہ وری وغیرہ کا نام ہے۔ لیکن بدقسمتی سے موجودہ دور میں صحیح اہل تصوف کے ہاں بھی ان صفات میں سے متعدد اہم صفات کا نقص موجود ہے۔ بالخصوص دور جدید کی ذہنی اور علمی سطح کے مطابق تصوف کی ہم آہنگی کے معاملہ میں تو اہل تصوف کے ہاں سرے سے کوئی سوچ اور تحرک ہی موجود نہیں۔

جہاں تک تصوف کی حکمت عملی اور اس کے طریق کار کا تعلق ہے تو یہ ایسی چیز نہیں ہے، جو نصب العین اور اصولوں کی طرح اہم ہو، اور ہر دور کے حالات میں یکساں ہو۔ اس میں تو ہر دور کی ضروریات کے تحت تغیر ہوتا رہا ہے، اور موجودہ دور میں تو اس کی سخت ضرورت ہے کہ جدید طبقات کو اہل تصوف کی طرف متوجہ کرنے، انہیں تصوف سے استفادہ کرنے لئے رجوع کرنے کے لئے تصوف کی حکمت عملی میں تبدیلی کی جائے۔ عقیدت میں بے پناہ غلو، کشف، القا، الہام، اور تصرفات جن کو کم فہمی کی وجہ سے تصوف کی بنیادوں کی حیثیت سے متعارف کرایا گیا ہے، ان چیزوں کو تصوف کی نئی حکمت عملی کے تحت غیر اہم قرار دیا جائے۔ اس ساتھ ساتھ تصوف کے بنیادی مقصد کے سلسلہ میں قرآن وحدیث میں جو بہت ساری تشریحات وتوضیحات موجود ہیں، دعوتِ تصوف کے سلسلہ میں ان آیات اور احادیث کو بنیاد بنانے کی طرف توجہ دی جائے۔ بزرگوں کی طرف منسوب اس سلسلہ

میں ساری باتیں جو عقل سلیم سے متضاد ہیں، ان سے صرف نظر کیا جائے۔

معاشرہ کو بڑھتے ہوئے زوال سے بچانے اور جدید تعلیمی اداروں کے پیدا کردہ بگاڑ سے نمٹنے کے لئے تصوف کا ادارہ آج بھی ساری جماعتوں اور سارے اداروں سے بہتر کردار ادا کرسکتا ہے، لیکن اس کے لئے صحیح حکمت عملی کی اشد ضرورت ہے۔

(ماخوذ: ماہنامہ بیداری اکتوبر ۲۰۰۸)

اخلاقی تربیت کے نظام میں

صالح افراد کا کردار

کسی بھی قوم کے لیے اخلاقی تربیت کے نظام کی اہمیت مسلم ہے، اس طرح
کے نظام کے بغیر قوموں کی حقیقی ترقی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اسی لیے کہ اخلاقی
تربیت کے نظام کے بغیر قوم کے مؤثر اور مالدار طبقات کی نفس پرستی کی داخلی قوتوں
پر کنٹرول کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ یہ کنٹرول محض کسی قانون اور ضابطے کی کارروائیوں اور
وعظ ونصیحت کے ذریعے نہیں ہوسکتا۔ اس کا اندازہ مغربی قوموں کے نظام سرمایہ
داری کے بڑھتے ہوئے حرص وہوا سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ نظام پوری انسانیت کے
ساتھ ساتھ اپنی قوم کے افراد کا بھی خون نچوڑ رہا ہے اور مغربی قوموں کا اخلاقی نظام
سرمائیداری کی ھل من مزید کی حرص کو روکنے میں ناکام ہے، حالانکہ ان کا اخلاقی
نظام اجتماعی زندگی کے متعدد اہم شعبوں میں بہتر کردار ادا کررہا ہے، لیکن نفس پرستی
کی داخلی قوتوں کی روک تھام اور افراد کی خباثتوں کو دور کرکے، ان کے اندر حقیقی
انسانی جوہر کو ابھارنے کے سلسلے میں یہ نظام کلی طور پر ناکام ہے۔

تربیت کا ایسا اخلاقی نظام، جس میں نفسی حجاب دور ہوں، وہ کیوں ضروری
ہے؟ اس سلسلے میں ایک عالم ربانی نے بہت عمدہ مثال دی ہے، ان کا کہنا ہے کہ
جس طرح ڈیڑھ سال کے بچے کو مختلف چیزوں کے جداگانہ وجود اور اشیاء کا علم تو
ہوتا ہے، اگر اس کے سامنے مختلف چیزیں الگ الگ رکھی جائیں تو وہ ہر چیز کو الگ
الگ چیز کی حیثیت سے پہچان لیتا ہے، لیکن اسے چیزوں کی خاصیت اور اثرات کا
علم نہیں ہوتا، اس لیے اگر اتفاق سے اس کے سامنے سانپ آجائے تو وہ سانپ کو
بھی دوسری عام چیزوں کی طرح ایک چیز سمجھ کر پکڑنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن اس

کا نتیجہ بچے کی موت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، عالم ربانی کا کہنا ہے کہ اسی طرح
عالم، دانشور اور اسکالر کو احکام شریعت اور مقدس لفظوں اور ان کی معنیٰ کا تو علم ہوتا
ہے، لیکن معرفت نہ ہونے کی وجہ سے اس کے اندر گناہوں سے بچنے اور نیک اعمال
کی قوت اور صلاحیت نہیں ہوتی، حرص، حسد، اور دنیا سے محبت کرنا، دولت جمع کرنا
اور دوسروں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرنا، ان ساری چیزوں کے بارے میں عام
طور پر انہیں شریعت کی تعلیمات کا تو علم ہوتا ہے، لیکن معرفت نہ ہونے کی وجہ سے
منکرات سے بچنے کی سعادت حاصل نہیں ہوتی، نتیجتاً علم کے باوجود وہ بچے کی
طرح اپنی تباہی کا انتظام کرتا ہے، علم کے باوجود وہ اپنی دائمی زندگی کو غارت کرنے کا
باعث بنتا ہے، یہ معرفت، یہ یقین اور یہ تقویٰ کیسے پیدا ہو، جس کے نتیجے میں فاسد
اعمال سے بچنے اور صالح اعمال کرنے کی عادت مستحکم ہو، دراصل یہی وہ کام ہے،
جو تربیت کا اخلاقی اور روحانی نظام سرانجام دیتا ہے۔

مغرب کے ایک دانشور کارلائل نے انسان کی کمزوری کے سلسلے میں ایک اہم
نکتہ بیان کیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ اگر انسان کی روح اور اس کی ضروریات کا انکار
کیا جائے اور روحانیت کی فکر نہ کی جائے تو پھر انسانیت کی جو حالت ہوتی ہے، وہ
یہ ہے کہ ایک عام موچی کو بھی اگر کائنات کا آدھا خزانہ دیا جائے تو وہ اسے ناکافی
تصور کرے گا اور اس سے اس کی تشفی اور تسکین نہ ہوسکے گی۔ اس طرح ساری
کائنات کا خزانہ دو افراد کے لیے بھی ناکافی ثابت ہوگا۔

اگر یہ حقیقت ہے کہ انسانی نفس اتنا بھوکا ہے کہ کائنات کے آدھے خزانے
سے بھی اس کا سیر نہیں ہوتا اور ھل من مزید کی اس کی حرص ختم نہیں ہوتی تو پھر یہ
ایک انتہائی تلخ حقیقت ہے اور اس لائق ہے کہ انسانی نفس پر کنٹرول کرنے اور اسے
مہذب بنانے کے مسئلے کو سب سے زیادہ اہمیت دی جائے۔

چونکہ یہ اللہ کی ذات ہی ہے، جس نے نفس انسانی کو اس حالت پر پیدا فرمایا

ہے، اس لیے نفس انسانی کی اصلاح، سدھارے اور اس کی تہذیب کے لیے اللہ تعالیٰ نے شروع سے انتظام فرمایا ہے، تاکہ نفس اور روح کی کشمکش میں انسانی روح کی مدد ہو سکے اور انسانی سوسائٹی نفس کی ان بے پناہ خواہشات کی وجہ سے تباہی کا منظر پیش کرنے سے محفوظ ہو سکے، اللہ کا یہ انتظام کیا ہے؟ وہ انتظام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں نفس کی داخلی قوتوں کو مار کر منانے کے لیے قانونی تعلیمات کے ساتھ ساتھ صالح انسانوں کا انتظام فرمایا ہے، ان صالح انسانوں کے ذریعہ یہ تربیت ملتی رہی ہے کہ نفس کی خواہشات اور حرص وہوا کے جذبات پر کنٹرول کر کے، بہتر انسان کس طرح بنا جا سکتا ہے، اس تربیت میں یہ صالح انسان کتاب اور وعظ ونصیحت سے بھی مدد لیتے رہے ہیں، لیکن اس تربیت میں اصلی چیز صالح انسانوں کا پاکیزہ کردار اور پاکیزہ باطنی کیفیات رہی ہیں، جو صحبت کے ذریعہ منتقل ہوتی رہی ہیں، یہ صالح انسان جو افراد کی اصلاح کا ذریعہ تھے، پہلے نبیوں اور رسولوں کی صورت میں آتے تھے، لیکن خاتم النبیین ﷺ کے بعد علمائے ربانی اور اولیائے کرام کے ذریعے اللہ کی طرف سے یہ انتظام ہوتا رہا ہے، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میرے بعد نبوت تو ختم ہے، لیکن علمائے حق کا سلسلہ جاری رہے گا، یہ علمائے ربانی بنی اسرائیل کے انبیاء کی طرح ہوں گے۔ یعنی تربیت کا جو فریضہ پہلے بنی اسرائیل کے انبیاء کرام سرانجام دیتے تھے، اب وہ کام علمائے ربانی سرانجام دیں گے۔ اس میں وہ یقیناً کتاب وسنت اور وعظ ونصیحت سے کام لیں گے اور وہ ایک ایک سنت کے عامل ہوں گے اور ظاہری وباطنی طور پر ان کی زندگی پاکیزہ ہوگی۔ لیکن اصل میں وہ صحبت کے ذریعے اپنی ایمانی وروحانی کیفیت اور قوتیں منتقل کریں گے، جس سے نفس کی قوتیں کمزور ہوں گی اور روحانی پرواز میں ارتقا ہوگی۔

بدقسمتی سے جدید دور میں جدیدیت کے زیر اثر اخلاقی تربیت کا جو تصور ابھرا ہے، اس میں کتاب، شعور اور ذہن کو تو عمل دخل حاصل ہے، لیکن صالح، متقی اور

پاکیزہ کردار کے حامل افراد کی ضرورت واہمیت سے انکار ہے، اس لیے اول تو ہمارے اجتماعی نظام میں اخلاقی تربیت کا مناسب انتظام واہتمام موجود نہیں، لیکن اگر اس سلسلے میں کچھ فیصلے کیے بھی جاتے ہیں تو اس میں علمائے ربانی، اولیائے کرام اور صالح انسانوں کی صحبت اور ان کے پاکیزہ ایمانی اور روحانی حالات اور نورانی کردار سے استفادہ کو کوئی اہمیت حاصل نہیں، اس کا نتیجہ ہے کہ ملی زندگی کے اہم شعبوں سے وابستہ افراد کی سیرت وکردار کی تعمیر کا کام بند ہو چکا ہے اور نفس پرستی کے جذبات مسلسل بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔

انسانوں کی تربیت کا انتظام انسانوں کے ذریعے کرنا، یہ اللہ کی ایسی سنت ہے، جو شروع سے جاری ہے، سوا لاکھ انبیاء کرام کی آمد کا مقصد بھی یہی تھا، اس کے بعد لاکھوں ربانی علماء کا انتظام بھی اسی مقصد کا حصہ رہا ہے، موجودہ دور غالباً پہلا دور ہے، جس میں انسان کی تربیت بذریعہ قانون، انسان کی تربیت بذریعہ وعظ و نصیحت یا "انسان کی تربیت بذریعہ کتاب" کا تصور عام ہوا ہے۔ جس کا نتیجہ ہے کہ افراد کی اصلاح کا عمل بری طرح متاثر ہے۔

صحبت صالحہ کے نظام کی اہمیت کے لیے امام غزالی نے ایک اہم نکتہ بیان کیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ اس دنیا میں جب اللہ کے انوار وتجلیات ایک عمارت پر گرتی ہیں تو وہ عمارت بیت اللہ بن جاتی ہے اور عمارت کی زیارت سے دل میں پاکیزہ کیفیتیں پیدا ہونے لگتی ہیں، جب اللہ کے یہ انوار ایک رات پر گرتے ہیں تو وہ رات (لیلۃ القدر) بے پناہ خیر وبرکت کا باعث بن جاتی ہے، جب اللہ کے یہ انوار ایک دن پر گرتے ہیں تو وہ دن (عیدالفطر یا عیدالاضحیٰ) بابرکت بن جاتا ہے، اس طرح جب اللہ کے یہ انوار انسانی شخصیت پر گرتے ہیں تو وہ شخصیت نبی ورسول سراپا خیر بن جاتی ہے، نبی ورسولوں کے بعد اللہ کے انوار کی یہ کرنیں جب اولیائے کرام کے دلوں پر گرتی ہیں تو وہ بندوں کو فیض دینے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہو جاتے ہیں

اور صحبت اختیار کرنے والوں کے دلوں میں خشیت اور رقت پیدا کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں تو کیا انسانی شخصیت میں داخل ہونے والے اللہ کے انوار افراد کی تربیت وتزکیے کے حامل نہیں بن سکتے۔

مسئلے کی اہمیت کے پیش نظر ہم اس چیز پر زور دیں گے کہ اول تو موجودہ دور میں اخلاقی اور روحانی تربیت کے لیے جو ہمہ جہتی غلط فہمی پیدا ہوئی ہے کہ یہ تربیت صالح اور متقی شخصیت کے بغیر از خود یا کتاب کے ذریعے لیکچر سے ہوسکتی ہے، ابلاغ کے ذرائع سے کام لے کر اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔

دوم یہ کہ اسمبلی ممبران، حکمرانوں، اہم سرکاری افسروں اور عدلیہ کے معزز ججوں اور جملہ انتظامی افسروں کی روحانی، وجدانی اور اخلاقی تربیت کیلئے کم از کم دو سال پر مشتمل ایک ایسا تربیتی نظام تشکیل دیا جائے، جس میں ان افراد کے دلوں میں مادیت اور مادی حسن کے نصب بت منہدم ہوں اور حسن اعلیٰ کے حسن کے اجزاء داخل ہوں، تاکہ قلب میں حسین، پاکیزہ اور لطیف ترین شعاؤں کے داخل ہونے سے لذت کے نئے احساس ابھر سکیں اور پاکیزہ بنیادوں پر انسانی شخصیت کی تعمیر کی ہوسکے اور ان نئے پاکیزہ جذبات سے نفس انسانی کے حیوانی اور جبلی جذبات پر ضرب کاری لگ سکے۔

تربیت کے اس عمل میں پاکیزہ اور صالح علماء کی صحبت کو شامل کیا جائے اور اس میں صحبت کے فلسفے، نفسی قوتوں کی فکر، انسانی ذہن کی صحت کے لیے بہیمانہ قوتوں پر فتحیابی کے نکات اور دوسرے موضوعات پر لیکچر بھی شامل ہوں۔ لیکن افراد کی عقل سے زیادہ بنیادی تربیت دل و وجدان کی ہو اور اندر کی قوتوں کی اصلاح پر ہو، جب علمائے ربانی کی صحبت کے ذریعہ دلوں کے پردے دور ہوں گے اور وجدان میں حسن اعلیٰ کے حسن کی کچھ شعائیں داخل ہونگی اور ایمان ویقین اور تقویٰ واحسان کی کیفیت قابل ذکر حد تک مستحکم ہوگی تو اس سے مادی حسن سے دستبردار ہونے کی

قوت پیدا ہوگی اور نفس پرستی کی داخلی قوتیں افراد کو زیر کرنے میں کامیاب نہ ہوسکیں گی، نیز زندگی میں اللہ کے بندوں کی خدمت، احتساب ذات اور احساس ذمہ داری جیسے جذبات طاقتور ہونگے اور اخلاق حسنہ بھی پیدا ہوگا اور قومی اور ملی اداروں کو قومی مقاصد سے ہمہ آہنگ مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا جذبہ طاقتور ہوگا۔

صحبت صالحہ کے ذریعے پچھلے چودہ سو سال سے امت کے مختلف طبقات میں یہ انقلاب برپا ہوتا رہا ہے، صاحبان کی تاریخ پڑھی جائے تو آسانی سے اس کی تفصیلات مل سکتی ہیں۔

آخر میں ہم یہ انتباہ دیئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اگر قوم کی باگ دوڑ سنبھالنے اور ملک کے جملہ نظام کے علمبرداروں کی اخلاقی تربیت اور کردار وسیرت سازی کا مناسب اہمیت حاصل نہ ہوئی یا اس میں غیر معمولی تاخیر ہوئی تو نفس پرستی کے باطنی جذبات قوم اور ملک کو سیاسی، معاشی اور اخلاقی طور پر تباہی کے ایسے دلدل میں مبتلا کریں گے، جہاں سے نکلنا دشوار ہوگا۔ ضروری ہے کہ عقل اور ہوش سے کام لے کر مسئلے کی سنگینی اور اس کی نوعیت کو سمجھا جائے اور ظاہری و قانونی اقدامات کے ساتھ ساتھ بنیادی نوعیت کے فیصلے ہوں اور حقیقی تبدیلی کے لیے پاکیزہ نصب العین کی بنیاد پر تربیت کا ایک ہمہ جہتی پروگرام ترتیب دیا جائے، جس میں افراد کے باطن کی وسیع دنیا کی تطہیر وتزکیے کا پاکیزہ انتظام ہو اور انسانی جوہروں کی نشوونما کا اہتمام ہو، حضورؐ نے ایسے افراد کی صحبت کی تاکید فرمائی ہے، جنہیں دیکھ کر اللہ یاد آئے اور نفس کی قوتوں کا زور ٹوٹ سکے اور دنیا سے بے نیازی اور استغنیٰ کی حالت پیدا ہو۔

(ماخوذ: ماہنامہ بیداری اپریل ۲۰۰۸)

تصوف واحسان کے ذریعہ

مادیت اور مادی حسن سے بچاؤ کی صورت

موجودہ دور میں مادی حسن کے مناظر اتنے عام ہیں اور مادیت کا بڑھتا ہوا سیلاب اتنا تیز ہوچکا ہے کہ اخلاقی قدریں، مذہبی طور طریقے، انسانیت اور پاکیزہ تہذیب وغیرہ سب ان کی نذر ہوچکے ہیں۔ ان حالات میں عام فرد کی تو حالت یہ ہے کہ وہ مادی حسن کے مناظر اور اس حسن سے فیضیاب ہونے کی تمنا و حسرت ہی میں وقت گزارتا ہے۔ معاشرے کے خوشحال اور مالدار افراد کی نظر میں تو خوشحال زندگی ہی یہی ہے، جس کے حصول کے لئے کاوشیں اس کی زندگی کا نصب العین بن چکا ہے۔ نئی نسل کو سرے سے ہوش ہی نہیں۔ اس کے لئے اس کے علاوہ ماورئی اور پاکیزہ زندگی کا تصور کرنا ہی مشکل ہے۔ البتہ سماج کا ایک قابل ذکر طبقہ ایسا ضرور موجود ہے، جو مادی حسن اور مادیت کی پیدا کردہ اس صورتحال سے سخت مضطرب اور پریشان ہے۔ جس کی نظر میں مسلم تہذیب، اسلامی زندگی اور اسلامیت کے لئے سب سے زیادہ خطرہ مادی حسن کے یہ مناظر اور تہذیب جدید ہی ہے۔ اس طبقے کو فکر یہ لاحق ہے کہ اس سنگین تہذیبی چیلنج اور شیطنت کی قوتوں سے بچاؤ کی صورت کیا ہوسکتی ہے، اور اپنی اولاد کو مادی حسن کے اس سیلاب میں بہنے سے بچانے اور انہیں اسلام اور اسلامیت پر قائم رکھنے کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔ اس مسئلے نے دردمند اور حساس افراد کو سخت الجھن میں ڈال دیا ہے۔ ان کی نظر میں یہ مسئلہ زندگی اور موت جیسی صورت اختیار کر چکا ہے اور مسلمانوں کی تاریخ میں پہلی بار اتنا بڑا چیلنج سامنے آیا ہے، بلکہ حقیقت میں یہ تہذیبی چیلنج تو قوم نوح کے اس سیلاب کی مانند ہے، جس نے قوم کے سارے افراد کو غرق کردیا تھا، سوائے چند صاحب ایمان وعمل افراد کے۔

سوال یہ ہے کہ گھر، بازار، دفتر اور اسکول کے ماحول کو مادی حسن کے مناظر سے بھرنے سے بچانے اور مادیت اور مادی حسن کے اس ہمہ جہتی حملے کے بعد اس سے بچاؤ کی صورت کیا ہوسکتی ہے؟ یہ ایک اہم موضوع ہے۔ اس سلسلے میں ہم یہاں چند نکات پیش کرتے ہیں۔

مادی حسن اور مادیت سے مقابلے کے لئے جو مدافعانہ قوت حاصل ہونی چاہئے، اس کا سارا تعلق افراد کے باطن اور وجدان سے ہے۔ اس سلسلے میں ”شعور“ اور قیل وقال سے زیادہ مدد ملنا مشکل ہے۔ باطن اور وجدان کی مدافعانہ قوت کو مضبوط کرنے کے لئے جس چیز کی ضرورت ہے، وہ یہ ہے کہ گھروں میں خالص مذہبی فضا اور مذہبی ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی جائے اور یہ ماحول ذکر وفکر کے حلقوں سے ہی پیدا ہوسکتا ہے۔ گھروں میں اگر روزانہ ۲۰ - ۲۵ منٹ کے لئے ذکر کے حلقے ہونے لگیں تو انشاء اللہ اس سے آہستہ آہستہ گھروں میں مذہبی ذہن اور مذہبی فضا بننا شروع ہوجائے گی۔ کچھ عرصے کے بعد ایسی فضا پیدا ہوجائے گی کہ گھر کے ہر فرد میں بُرائی سے نفرت اور نیکی سے محبت پیدا ہونے لگے گی، کیونکہ ذکر کی خاصیت ہی یہ ہے کہ اس سے قلب، وجدان، ذہن، اعصاب اور نفسیات ذکر کے نورانی اثرات سے سرشار ہوجاتے ہیں۔ ذکر کے ان حلقوں میں کوشش یہ ہونی چاہیے کہ گھر کے سارے افراد شریک ہوں۔ اگر شروع میں گھر کے افراد بے دلی سے شریک ہوں تو کوئی حرج نہیں۔ چند ہفتوں تک ان حلقوں میں پابندی سے شرکت کے نتیجے میں قلب وجدان اور دل میں ایمان کا نور ظاہر ہونے لگے گا اور لذت وطمانیت محسوس ہوگی، اس کے بعد از خود ان حلقوں میں شرکت کے لئے فضا ہموار ہوگی۔ اگر ذکر کے حلقوں میں شرکت کی سعادت حاصل نہیں ہوتی، یا اس کے لئے دل آمادہ نہیں ہوتا تو دوسری صورت یہ ہے کہ درس قرآن یا کسی مذہبی کتاب

کے مطالعے کا اجتماعی انتظام ہوجانا چاہیے۔ اس سے بھی ذہن کی تربیت ہوگی اور آہستہ آہستہ دل و وجدان میں اثرات پیدا ہونے کی صورت پیدا ہوگی۔

اس کے ساتھ ساتھ دوسری چیز جس کی سخت ضرورت ہے، وہ یہ ہے کہ گھر میں ٹیلیویژن پر آنے والے فحش پروگرام دیکھنے کے سلسلے میں احتیاط سے کام لیا جائے۔ عورتوں اور مردوں کے تیار شدہ مشترکہ ڈرامے اور فلمیں تو ہرگز نہ دیکھنے چاہیے اور آہستہ آہستہ بچوں کو بھی کنٹرول کرنے کی کوشش کی جائے اور انہیں ان پروگراموں کو نہ دیکھنے پر آمادہ کیا جائے۔ لیکن گھر سے ٹیلیویژن کو نکال دینے کی اس مہم کو نہایت حکمت اور ذہانت سے شروع کرنا ہے اور آخر تک پہنچانا ہے۔ ٹیلیویژن کے ذریعے گھروں میں جو بگاڑ آرہا ہے وہ اتنا ہمہ گیر بگاڑ ہے کہ اس کے خلاف تہذیب نفس کی ساری تدابیر اور تربیت کی ساری اسکیمیں ناکام ہوتی ہیں۔ اس لئے گھر میں ٹیلیویژن کے خلاف حکمت سے مہم چلانا، یہ اخلاقی قدروں اور تہذیب اسلامی کی حفاظت کے نقطۂ نگاہ سے وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے۔ اس محاذ پر ناکامی کے بعد ذکر وفکر کے حلقے اور درس قرآن وغیرہ کا انتظام بھی غیر مؤثر ہوجاتا ہے، اس لئے اس کام کو ترجیحی لسٹ میں اولیت دینی چاہیے۔ ٹیلیویژن کو محض تفریح اور وقت گزاری کا مسئلہ ہرگز نہیں سمجھنا چاہیے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اب شیطانی قوتیں مسلم سماج کی تہذیبی عمارت کو منہدم کرنے کے لئے جو جنگ لڑرہی ہیں۔ اس جنگ میں ٹیلیویژن کو وہ سب سے اہم ہتھیار کے طور پر استعمال کررہی ہیں۔

یاد رکھنا چاہیے کہ معرفت نفس اور معرفت رب کے رازدانوں کا کہنا ہے کہ آدھا گھنٹہ فحش پروگرام دیکھنے کا ذہن اور دل پر جو غیر معمولی منفی اثر پڑتا ہے، وہ یہ ہے کہ تین چار ہفتوں تک باطن کی دنیا میں نیکی کے جذبات سرد پڑجاتے ہیں اور خیر، صداقت اور شریعت پر عمل پیرا ہونے کی باطنی قوتیں کمزور ہوجاتی ہیں۔ جب آدھے گھنٹے کے فحش پروگرام دیکھنے کا یہ اثر ہے تو روزانہ اس طرح کے پروگرام

دیکھنے کا جو نتیجہ مرتب ہوسکتا ہے، اس کا آسانی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

چونکہ مادی حسن کے اثرات سے مقابلے کے لئے ذکر سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس لئے ذکر کے موضوع پر کچھ مزید گفتگو کرنا ضروری ہے۔ ذکر انسان کے باطن کی ایک ایسی ضرورت ہے، جس کے بغیر انسانی شخصیت کی تشفی اور تشنگی دور نہیں ہوسکتی۔ ذکر کا بدل ساری دنیا اور دنیا کی ساری نعمتیں بھی نہیں ہوسکتیں۔ انسان جس حسن کا متلاشی ہے، اس حسن کی کرنیں اور شعائیں ذکر کے ذریعے ہی دل کی وسیع دنیا پر گرتی ہیں۔ اگر ذکر کے فوائد بیان کئے جائیں تو وہ حد وحساب سے باہر ہیں۔ ذکر افراد میں زندگی کے آثار پیدا کرتا ہے۔ ذکر سے محرومی افراد میں مردنی پیدا کرتی ہے۔ ذکر شیطانی اثرات کو زائل کرتا ہے۔ ذکر سے غفلت شیطانی اثرات کے غلبے کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ ذکر قلب اور نفس کی منفی خواہشات کی تہذیب کرتا ہے۔ ذکر سے محرومی نفس کے حیوانی جذبات کو طاقتور بناتی ہے۔ ذکر وہ قوت ہے جو انسان کو زمین سے اٹھا کر ملاء اعلیٰ کی وسعتوں تک پہنچاتا ہے۔ ذکر سے افراد کے قلوب مزین ہونے لگتے ہیں۔ کثرت ذکر کے نتیجے میں نیکی پر عمل کرنے کی طاقت پیدا ہوتی ہے۔ ذکر کے نورانی اثرات کے سبب حرص وہوا کے جذبات مدھم ہوجاتے ہیں۔ سادگی، کفایت شعاری، قناعت، تھوڑے پر راضی رہنے اور استغنیٰ کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ ذکر کی وجہ سے صبر اور کم گوئی کی صلاحیت ابھرتی ہے۔ ذکر ایمان میں ارتقا اور استقامت پیدا کرتا ہے۔ ذکر مادی اثرات اور نفس کی خواہشات کو مسترد کرنے کی طاقت بخشتا ہے۔ ذکر دنیا میں افراد کو داخلی اور نفسیاتی طور پر "سکینت" کی جنت میں داخل کرتا ہے۔ ذکر کی بدولت زندگی کے ہر موڑ اور ہر مرحلے پر اللہ کی نصرت اور مدد شامل ہوتی ہے۔ ذکر سے اعتماد ذات بحال ہوتا ہے۔ ذکر زندگی سے خوف وحزن ختم کرتا ہے۔ ذکر افراد کو نفس شناسی کے مراحل طے کراکر معرفت رب کی منزلوں تک پہنچاتا ہے۔

ذکر کے ان فوائد کی وجہ سے اسے ولذکر اللہ اکبر کہا گیا ہے۔ بدقسمتی سے موجودہ دور میں مذہبی لوگ بھی ذکر کو معمولی چیز سمجھ کر نظر انداز کرتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اصلاح نہیں ہوتی اور دل کی دنیا میں مادی حسن کے جذبات طوفان برپا کرتے رہتے ہیں۔ ذکر کو معمولی اور غیر اہم سمجھنے کی دوسری سزا جو اللہ کی طرف سے ملتی ہے وہ یہ ہے کہ افراد تکبر، بڑے پن، انانیت، حب جاہ وحب مال کے نذر ہوجاتے ہیں اور یہ قوتیں افراد کو معاشرے کے تباہ کن فرد کی حیثیت سے سامنے لاتی ہیں۔

مادی حسن اور مادی جذبات کے اثرات سے بچاؤ کے لئے اگرچہ یہ مختصر پروگرام ہے، لیکن یہ مختصر پروگرام اتنا اہم ہے کہ اس پر عمل کرنے کے نتیجے میں جو طمانیت "اور سکینت" حاصل ہوتی ہے، دنیا بھر کی دولت خرچ کرنے کے باوجود ایسی "سکینت" حاصل ہونا، ممکن نہیں۔

(ماخوذ: ماہنامہ بیداری ستمبر۲۰۰۸ء)

محمد موسیٰ بھٹو

نظام تعلیم وتربیت کے حوالے سے اہم بحث

ایک مکتوب کے جواب میں

ماہنامہ تدریس القرآن کراچی کے مدیر اور جمعیۃ تعلیم القرآن ٹرسٹ کے ناظم نشرو اشاعت اور ہمارے بزرگ دوست محترم جناب اشفاق احسان صاحب لکھتے ہیں:

"ہمارے مدارس اور درپیش چیلنج" کے عنوان سے مضمون میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے، اسکی سچائی اور ضرورت سے انکار نہیں، لیکن آپ کی تحریر سے کچھ مترشح ہوتا ہے کہ آپ کا اشارہ صوفیائے کرام کے طریق تربیت کی طرف ہے، جو راقم کی رائے میں ہمارے ذہنی حالت کے مطابق نہیں، نفوس بیحد کمزور ہو چکے ہیں، تہذیب وتمدن کی خوشنمائی نے سحر زدہ کرکے نہ بجھنے والی آگ بھڑکا رکھی ہے۔ ایسے میں بزرگوں کے طریق تربیت کے بارے میں سوچنا اور اسکی سفارش کرنا نتیجہ کے لحاظ سے بے اثر ثابت ہوسکتا ہے، اس کی بنیادی اور بڑی وجہ یہ ہے کہ انکے طریقوں میں چلہ کشی ہے۔ مراقبے ہیں، اور تسبیحات ہیں، جو یوں بھی عام انسانی تحمل کیلئے ہمیشہ زیادہ صبر آزما اور روحوں کو تھکانے والے ثابت ہوکر محض گنتی کے چند ہی مخصوص افراد کیلئے باعث کشش بنتے رہے ہیں، اس کھلی حقیقت سے ظاہر ہے کہ لوگوں کی ۹۹ فی صد تعداد اپنی مادی اغراض کی خاطر تو اولیائے کرام سے رجوع کرتی رہی، لیکن ان سے روحانی اور اخلاقی فیض اٹھانے والے شاید ایک فی صد بھی کبھی نہیں رہے۔

آج دنیا میں اخلاقی، روحانیم سیاسی اور مادی غرض کہ ہر اعتبار سے ہمارے زوال پذیر ہونے کا سبب یہ ہے کہ ہماری مذہبی قیادت خود معاشرہ کو سنبھالنے کی صلاحیتوں سے عاری ہے اور اخلاقی اعتبار سے معاشرہ کو سہارا دینے کے لئے اپنے کردار کی ادائیگی پر آمادہ نہیں۔ رہے صوفیائے کرام تو چند صوفیاء کو چھوڑ کر انکا تعلیم وتربیت کا طریقہ چونکہ عام انسانی تحمل سے بہت زیادہ صبر آزما اور افراد کو جلد تھکا دینے والا ہے، محض چند مخصوص افراد ہی انکی اخلاقی تعلیم سے فیض یاب ہوسکے اور عوام کی کثیر ترین تعداد انکے تربیتی نظام سے استفادہ نہ کرسکی۔

میں یہ گذارش کرنا چاہتا ہوں کہ بزرگوں کے آزمودہ طریقے اگر سابقہ ادوا میں قومی اور

اخلاق کی حسب ضرورت اصلاح نہیں کر سکے تو موجودہ دور میں تو جبکہ نفوس کو مغربی تہذیب
ن دیمک کی طرح چاٹ چکے ہیں، پرانے طریقوں کو آزمانا، اصلاح اخلاق کیلئے اور بھی زیادہ
حکیمانہ اور بے ثمر ثابت ہو سکتا ہے۔

حالات کی تبدیلی اگر غیر مشروع چیزوں کو مباح اور مشروع چیزوں کو مکروہ بنا سکتی
ے تو کیوں نہ ہم اپنے ماحول اور حالات کی ضرورت اور حکمت پر غور و فکر کرتے ہوئے اپنے
یتی طریقوں کو جدید تقاضوں کے مطابق عوام الناس کیلئے زیادہ سہل، زیادہ موثر اور زیادہ قابل
ل بنانے کی جستجو کریں۔

اس ضمن میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ترقی یافتہ اقوام کا طریقہ تعلیم و تربیت ہمارے
ریقوں سے زیادہ موثر، زیادہ فطری اور زیادہ سہل ثابت ہوا ہے، ہمارے علمی تجربات اور
وجودہ حکمت کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم ان اقوام سے سائنسی علوم اور ٹیکنالوجی سیکھنے میں کوئی عار
سوس نہیں کرتے، اپنی قوم کی تربیت کے معاملہ میں بھی (ممکن حد تک) ان سے کچھ سیکھنے میں
سی حجاب یا تعصب کو اپنے آڑے نہیں آنے دینا چاہیے۔ اور "حکمت مومن کی میراث ہے"
والی پُرحکمت حدیث رسول کو اپنے پیش نظر رکھنا چاہیے۔

اپنی اس رائے کی مزید وضاحت کیلئے میں یہاں چند امثال پیش کرنا چاہتا ہوں۔

۱- مغرب کے تعلیمو مادہ پرستانہ معاشرہ میں تعلیم و تربیت پانے والے عیسائی مشنری آج
بھی ہزار ہا کی تعداد میں جس مخلصانہ اور فداکارانہ جذبے کے ساتھ خطرناک جنگلوں، بے آب
و گیاہ صحراؤں اور دور دراز پہاڑوں کی چوٹیوں پر اپنے فرائض انجام دیتے اور ناقابل برداشت
صعوبتوں کو برس ہا برس تک جھیلتے ... اسکی مثالیں ہمیں اپنے داتا درباروں دہلی، پاک پتن اور
اجمیر شریف کے آستانوں میں آرام فرما اولیائے کرام ہی کے اعمال میں مل سکتی ہیں، سوال یہ ہے
کہ ان مشنریوں میں فداکارانہ جذبہ اور یہ صبر و استقامت کس تربیت کا نتیجہ ہے؟ کیا صوفیانہ طور
وطریق پر عمل پیرا ہونے کا؟ اسکا جواب بالیقین نفی میں ہے۔

۲- چند سال قبل کچھ بیورو کریٹس، صنعتکار اور صحافی حضرات ایک سرکاری دعوت پر جرمنی
گئے اور اپنے دورے کے اختتام پر کسی صحت افزا مقام کے لئے ایک ہوٹل میں قیام کیا، قریب
میں مقیم کسی جرمن جوڑے سے ان کی ملاقات ہوئی، جو خود بھی چند روزہ قیام کیلئے انکے پڑوس
میں آ کر ٹھیرا تھا، چند روز کی یہ ملاقات سب کیلئے بہت دوستانہ اور خوشگوار ثابت ہوئی کہ ایک دن
صبح ہی صبح وہ جوڑا اپنے پاکستانی دوستوں کے کمرہ میں دستک دیتے ہوئے اچانک آ موجود ہوا اور

"خدا حافظ" کہنے کیلئے ان سے رخصت چاہی۔ دوستوں نے بہت اصرار کے ساتھ اپنے ہمراہ
اسے لنچ کھانے کی دعوت دی اور درخواست کی کہ وہ محض چند گھنٹوں کیلئے اپنی روانگی کا پروگرام
موخر کر دے۔ دونوں میاں بیوی نے جو خاصے فاصلے پر کسی کالج میں پروفیسر تھے، یہ عذر کیا کہ
انہیں لنچ ٹائم کے فوراً بعد اپنی کلاسیں اٹینڈ کرنی ہیں، جو وہ منسوخ نہیں کر سکتے، حد یہ ہے کہ ان
دوستوں کے بیحد اصرار کے باوجود وہ ان سے یہ کہہ کر رخصت ہو گئے کہ ہم ایک غیر ضروری دعوت
کی خاطر اپنے لیکچر کا وقت برباد نہیں کر سکتے" یہ احساس ذمہ داری جس تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھی، وہ
بہر حال ہماری قابل عزت خانقاہوں جیسا صبر آزما اور عام لوگوں کی روحوں کو تھکا دینے والا تو
ہرگز نہیں ہوتا۔

۳- میری اپنی ایک نواسی کافی عرصہ تک لندن میں مقیم رہی، اس نے سرکاری ہسپتالوں
میں دو بچوں کو جنم دیا (بغیر کوئی فیس یا دواؤں کی قیمت ادا کئے ہوئے) وہ ڈاکٹروں اور نرسوں کی
توجہ، محبت اور جذبہ خدمت کی تعریفیں کرتے کرتے نہیں تھکتی۔ ہر دو مواقع پر ایک خاتون نرس
بلاناغہ ہر ہفتہ زچہ اور بچے کی خبر گیری، انکی صفائی ستھرائی اور دوا دارو کی ضروریات پوری کرنے
کیلئے پورے چھ ماہ تک آتی رہی۔ نہایت محبت اور توجہ سے اپنے فرائض انجام دیتی رہی، جن کی
تکمیل میں بعض اوقات اسے دو دو گھنٹے بھی لگ جاتے، کیونکہ کسی خاص دوا کیلئے اسے دوبارہ
ہسپتال جا کر واپس بھی آنا پڑتا تھا۔ انسانی خدمت اور محبت کا یہ جذبہ بھی تو انکی کسی تعلیم و تربیت
ہی کا نتیجہ تھا، جو بہر صورت ہم سے بہت کچھ مختلف ہوگی۔

اہم امر مطلب، آخر میں یہی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ اپنے مضمون میں مساجد
کے خطبا اور مدارس کے منتظمین حضرات کی تربیت کیلئے خدا خوفی اور تقویٰ و تزکیہ پیدا کرنا چاہتے
ہیں اور اسکے لئے صرف پرانے اور لگے بندھے صوفیانہ طریقے ہی آپ کی رائے میں حرف آخر
ہیں، تو برائے کرم مناسب الفاظ میں بنیادی اخلاقی اوصاف کی ضرورت و اہمیت بالوضاحت ان پر
ضرور واضح کر دیں۔

راقم کی رائے میں اگر ہمارے خطیب اور مدارس کے منتظمین اپنے خطبات اور تعلیم
و تربیت کے نصاب میں مشکل حالات اور فتنہ انگیز اوقات کے مواقع پر صبر و استقامت، سچائی،
ایمانداری، عفو و درگذر، انسانی خدمت و محبت، امانت و دیانت جیسی اعلیٰ انسانی صفات کی تکرار اور
نصاب میں شمولیت کو اپنے وظائف کا حصہ بنالیں تو انکے شاگردوں کی کثیر تعداد رفتہ رفتہ اس سے
متاثر ہوتی جائیگی اور آہستہ آہستہ انشاء اللہ قوم کا اخلاقی معیار بھی بہتر سے بہتر ہوتا جائے گا، یہی

فطری طریقہ ہے اور یہی سہل تر بھی نیز یہی مغرب کا طریقہ تعلیم وتربیت بھی ہے۔

دنیا کی پوری تاریخ میں ہر قوم اور ہر مذہب کے رسولوں اور راہنماؤں اور مصلحین نے یہی طریقہ اختیار کیا ہے اور اسی طریقہ کے استعمال سے انہیں کم یا زیادہ کامیابی نصیب ہوئی ہے۔

بیداری: اشفاق احسان صاحب ہمارے ملک کے ان دانشوروں میں شامل ہیں (جو اگر چہ دانشوروں کی فہرست میں شامل ہونا پسند نہیں کرتے) جو طویل عرصہ سے خاموشی سے علمی اور فکری دنیا میں کام کر رہے ہیں۔ وہ برسوں سے جمعیۃ تعلیم القرآن ٹرسٹ کا ماہنامہ تدریس القرآن ایڈیٹ کر رہے ہیں۔ جب سے انہوں نے رسالہ کے مواد کی تدوین کی ذمہ داری سنبھالی ہے، رسالہ کو معاشرتی اصلاح اور فکری تبدیلی اور علمی مواد کے اعتبار سے اتنا قیمتی بنا دیا ہے کہ پڑھنے والا رسالہ کے سارے مواد کو پڑھے بغیر رہ نہیں سکتا۔ پاکستان بھر کے مختلف رسالوں، اخباروں اور کتابوں میں شائع ہونے والے بہتر سے بہتر مواد پر ان کی گہری نظر رہتی ہے۔ ان کی تمنا ہوتی ہے کہ مسلم امت کی رہنمائی کے سلسلہ میں کوئی بھی قیمتی مضمون ایسا نہ ہو جو تدریس القرآن میں شائع ہونے سے رہ جائے۔ موصوف کی عمر ۸۵ سال سے متجاوز ہے، لیکن اس عمر میں بھی وہ نہ صرف یہ کہ فعال ومتحرک ہیں، بلکہ ہزاروں صفحات کا مطالعہ کر کے ہر ماہ قارئین کو تدریس القرآن کا بہترین مواد پر مشتمل شمارہ فراہم کرتے ہیں۔

موصوف قوم کی گرتی ہوئی اخلاقی صورتحال پر کڑھتے رہتے ہیں اور اس سلسلہ میں اپنی بساط کے مطابق مسلسل کردار ادا کرتے رہتے ہیں۔ پچھلے دنوں انہوں نے "بیداری" میں شائع ہونے والے علماء ومشائخ کے سلسلہ میں ہمارے مضمون کی تلخیص کو بروشر کی صورت میں شائع فرما کر ملک بھر کے مشائخ میں تقسیم کرنے کا انتظام فرمایا، اب وہ ہمارے مضمون "ہمارے دینی مدارس درپیش چیلنج اور کچھ اہم معروضات" کو بروشر کی صورت میں شائع فرما کر ایک ایک عالم دین تک پہنچانے کی آرزو رکھتے ہیں۔

موجودہ حالات میں جب کہ بے حسی بڑھ گئی ہے اور خون جگر سے لکھی ہوئی تحریروں کے نتیجہ میں برائے نام بھی تحرک برپا نہیں ہوتا۔ اپنے کردار کی ادائیگی کا احساس تو دور کی بات ہے، احساس زیاں ہی ختم ہو چکا ہے، ایسے حالات میں اشفاق احسان صاحب جیسی درد مند شخصیتوں کا وجود حوصلہ افزا ہے اور وہ احساس دلاتا رہتا ہے کہ معاشرہ صحتمند سمت میں خاموشی سے کام کرنے والے افراد سے ابھی خالی نہیں ہوا۔

محترم اشفاق احسان صاحب نے تصوف کی مشکل اور ناقابل برداشت مشقتوں اور

ریاضتوں کی وجہ سے موجودہ حالات میں اس کی عدم افادیت اور یورپ میں نظام تعلیم کے ذریعہ اخلاقی نصب العین کے مطابق ذہنی، فکری اور عملی تبدیلی کا ذکر فرما کر اس طرح کی تبدیلی کا عمل ہمارے ہاں بھی شروع ہونے کے جذبہ کا اظہار فرمایا ہے۔

اس مختصر نوٹ میں اس موضوع پر تفصیلی اظہار خیال تو مشکل ہے، البتہ کچھ نکات پیش کرنا ضروری ہیں۔

ہر قوم کے مزاج اور نفسیات کی ایک تاریخ ہوتی ہے، کسی بھی قوم کو اس کی تاریخی مزاجی خصوصیات سے مستثنیٰ کر کے اس کا مطالعہ مشکل ہوتا ہے۔ یورپی قوموں نے اپنی نشاۃ ثانیہ کی تحریک کے دوران متوسط طبقات اور نئے ابھرتے ہوئے مالداروں کی مدد سے کلیسا اور بادشاہ کے خلاف جو جنگیں لڑیں اور سائنسدانوں اور دانشوروں نے علمی اور عقلی آزادی اور فرد کے سیاسی ومعاشی حقوق کے لئے جس طرح اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا اور اہل علم واہل دانش نے سیکولرزم پر مشتمل جو نئے نظریات پیش کئے اور ان نظریات کے فروغ کے لئے قوم میں جو جوش وخروش پیدا ہوا اور پوری قوم بادشاہ اور کلیسا کی گرفت سے آزاد ہو کر سیکولرزم کی بنیاد پر اپنے سیاسی اور اجتماعی نظام کی تشکیل کے لئے ڈٹ گئی، اس میں بلا مبالغہ لاکھوں سائنسدانوں، دانشوروں اور فلاسفروں کو موت اور قید وبند کا سامنا کرنا پڑا، کلیسا اور مطلق آمریت کے خلاف یورپی قوموں کی جدوجہد نے جو صورتحال پیدا کی، جسے فرد کے حقوق، فرد کی آزادی، عورت ومرد کے مساویانہ حقوق، حکومت کی تشکیل میں ہر فرد کی رائے کے حق، بنیادی انسانی حقوق کے تحفظ، ریاست کی طرف سے بے روزگاری کے الاؤنس، عدل وانصاف کی فراہمی اور نظام تعلیم کے ذریعہ افراد معاشرہ میں قوم سے وفاداری [illegible] کے جذبہ کی نشوونما، اور قومی اخلاق وکردار کے نام سے کچھ اوصاف وخصوصیات پر مشتمل مزاج کی تشکیل وغیرہ۔ یورپ کے اجتماعی ریاستی نظام کی یہ خوبیاں وخصوصیات دراصل وہاں شروع کی گئی ایک ہمہ جہتی علمی، فکری ونظریاتی تحریک ہی کا ثمرہ ہے، جو یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے دور میں چلائی گئی۔ اس کا پھل یورپ پچھلے دو تین سو سال سے کھا رہا ہے۔

چونکہ اہل یورپ کی مذہب کی صحیح تعلیمات مسخ ہو چکی تھی، وہ علم، عقل اور سائنسی کھوجنا کی دشمنی پر مبنی صورت اختیار کر گیا تھا۔ اہل مذہب ہر نئی سائنسی تحقیق کو کفر ومذہب کی جنگ شمار کرتا تھا، اس لئے اہل یورپ کو مجبوراً مذہب کو ریاست کے اجتماعی نظام سے بے دخل کرنا پڑا۔

محترم اشفاق احسان صاحب نے یورپ کی جن قومی خصوصیات کی تعریف فرمائی ہے۔ یہ

قومی خصوصیات ان کے اندر یوں ہی پیدا نہیں ہوگی۔ اس کے لئے اہل یورپ کو دوسو سال تک کلیسا اور مطلق حکمرانوں سے خوفناک جنگیں لڑنی پڑیں، اس طویل جنگ میں متوسط طبقات کی کامیابی کا بنیادی سبب نئے ابھرتے ہوئے صنعتی طبقہ کا بھرپور مالی تعاون تھا۔ چونکہ بادشاہ، کلیسا اور جاگیردار طبقات اپنے مشترکہ مفادات کی خاطر صنعت کے مخالف تھے۔ جب کہ صنعتکاروں کی ترقی، سائنسی ترقی اور آزادانہ غور وفکر اور تلاش وتحقیق سے وابستہ تھی، اس لئے نئے ابھرتے ہوئے صنعتی طبقہ نے اس جنگ آزادی میں فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ اسی لئے یورپ کی موجودہ قومی خصوصیات، فرد کی آزادی وحقوق اور انہیں میسر سہولتوں اور معاشرہ میں انہیں حاصل مراعات اور ریاستی اداروں کا عام افراد کے خادم کی حیثیت سے کردار ادا کرنا، یہ سارا کچھ ایک بہت ہمہ گیر تحریک اور غیر معمولی انقلاب ہی کا نتیجہ وثمر ہے۔ اس کے لئے سب سے پہلے ہزارہا دانشوروں نے نئی فکر دینی شروع کی، اس فکر کے نتیجہ میں ذہن بننا شروع ہوا۔ اس ذہن کے نتیجہ میں تحریکیں شروع ہوئیں، جو کامیابی سے ہمکنار ہوئیں۔

ہماری تاریخ یورپ کی تاریخ اور اس کے مزاج سے بالکل مختلف ہے۔ اس لئے اہل یورپ جیسے انقلاب کی امید رکھنا ہمارے ہاں عبث ہے۔

محترم جناب اشفاق احسان صاحب نے عیسائی مشنریوں کے فداکارانہ جذبہ کے ساتھ جنگلوں، پہاڑوں اور اور بے آب وگیاہ صحراؤں میں کام کرنے کا بھی ذکر فرمایا ہے اور ان کے فداکارانہ جذبہ سے سیکھنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ عیسائی مشنریاں یقیناً بڑے جذبہ کے ساتھ کام کر رہی ہیں اور اس میں کافی مقدار میں ڈاکٹر اور انجینئر اور ٹیکنیکل افراد بھی مصروف کار رہتے ہیں۔ ان کے جذبہ کی قدر نہ کرنا ناانصافی ہوگی، لیکن اس کا ایک سبب تو یہی ہے کہ اہل مغرب میں مہم جوئی کی جو صلاحیت دوتین سو سال سے پیدا ہوئی ہے، اس میں اس کے اثرات شامل ہیں۔ اہل مغرب جس شعبہ میں بھی کام کرتے ہیں، وہ اس شعبہ میں فنا ہوجاتے ہیں۔ فنائیت کے مزاج کی وجہ سے ظاہر ہے کامیابی ہوتی ہے۔ اس کا دوسرا بڑا سبب یہ ہے کہ عیسائی مشنریوں کو یورپی ریاستوں کی طرف سے عالمی سطح پر تبلیغِ عیسائیت کے لئے سالانہ کروڑیں ڈالر ملتے ہیں، جس کی تفصیلات رسائل واخبارات میں آتی رہتی ہے۔ وسائل کی کشش بھی باصلاحیت افراد کے لئے وقت دینے کا ذریعہ بنتی ہے۔ تیسرا سبب عیسائی مشنریوں کی گہری منصوبہ بندی ہے۔ وہ مبلغوں کی تربیت اور ان میں مشنری اسپرٹ پیدا کرنے کا خصوصی اہتمام کرتے ہیں، عیسائی مشنریوں کے جذبہ کی تائید کرنے کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ

اسلام کے دعوتی کام کے لئے ہمارے ہاں عالمی سطح پر تبلیغی جماعت کی طرف سے جو کام ہورہا ہے وہ ایسا کام ہے، جو عیسائی مشنریوں کے کام سے کہیں بڑھ کر قابل قدر ہے۔ ہرسال کئی سو جماعتیں ہندستان وپاکستان سے نکلتی ہیں، جو دنیا بھر میں دعوتی فریضہ سرانجام دیتی ہیں، جن میں عام لوگوں کے ساتھ ساتھ جدید پڑھ لکھے افراد بھی شامل ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ایک ایک سال اس کام کے لئے دیتے ہیں، بڑی بات یہ کہ کسی حکومت اور کسی ادارہ کے مالی تعاون کے بغیر اپنے ہی اخراجات کے ذریعہ یہ دعوتی فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔

تصوف واہل تصوف کے بارے میں محترم جناب اشفاق احسان صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے، اس میں سنی سنائی باتوں یادور سے مشاہدہ کی آمیزش زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ برصغیر ہند میں ہندو اکثریت کے علاقہ میں مسلمان ایک ہزار سال تک اگر صحیح سلامت رہے اور اپنے امتیازی وجود کو ایک حد تک قائم وبرقرار رکھتے رہے تو اس میں اگر سب سے زیادہ کسی طبقہ کا کردار ہوسکتا ہے تو وہ اہل تصوف اور بزرگان دین ہی کا طبقہ تھا۔ اس طبقہ نے زہد، دنیا سے بے نیازی، کردار کی بلندی، انسانیت نوازی اور رواداری جیسے جوہروں سے مزین ہوکر اور اللہ کی محبت سے سرشار ہوکر لوگوں کی تربیت اور تہذیب کا اس طرح کارنامہ سرانجام دیا کہ حکمرانوں کی سطح پر جو کچھ بھی ہوتا رہا، وہ تو ہوتا ہی رہا۔ لیکن عوامی سطح پر مسلم معاشرہ اخلاقی نصب العین کی قوت سے بہرہ ور رہا۔ اس زمانہ میں عام مسلمان ناقابل فروخت تھا، اسے بڑی سی بڑی دولت سے بھی خریدنا مشکل تھا۔ وہ کردار میں مستحکم تھا۔ اسلام سے اس کی وابستگی ووفاداری مسلم تھی۔ ایک ہزار سال تک ہندو تہذیب کی طرف سے یہاں مسلمانوں کو سینکڑوں چیلنج درپیش ہوئے۔ اسلامی تہذیب کو ہندو تہذیب میں ضم کرنے کے لئے لاتعداد کوششیں ہوئیں، لیکن صوفیائے کرام اور علمائے ربانی نے خانقاہی تربیتی نظام کے ذریعہ لوگوں کی اخلاقی ودینی حالت کو اس طرح مستحکم رکھا تھا کہ حکمرانوں کی باہمی جنگیوں، فروغ اسلام کے کام سے ان کی سرد مہری اور عیاشیانہ زندگی میں فنائیت کے باوجود برصغیر ہند کا مسلم معاشرہ اخلاقی بلندی کے اعتبار سے مضبوط رہا۔ جب حکمران طبقات کی بدکرداری اور جنگِ اقتدار اور ناعاقبت اندیشی بڑھتی گئی اور یورپی استعمار کا عمل دخل بڑھتا گیا تو اس کے نتیجہ میں ہمارا زوال بھی ہمہ گیر ہوتا گیا۔ تصوف واہل تصوف کے بارے میں یہ سمجھنا کہ ان کا کردار شروع سے محدود رہا، یہ صحیح نہیں، حضرت مجدد الف ثانی کے فرزند ارجمند حضرت خواجہ محمد معصوم کے بارے میں کتابوں میں تصریح موجود ہے کہ ہندستان بھر میں ان کے براہ راست اور بالواسطہ آٹھ ہزار خلفاء تھے۔ ہندستاں کا کوئی صوبہ اور علاقہ ان کے خلفاء سے خالی نہیں تھا۔

ں کے ان خلفاء سے اصلاح کے سلسلہ میں لاکھوں افراد وابستہ تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر کی
بیت کے لئے بھی انہوں نے ان کی درخواست پر اپنے ایک فرزند کو متعین کیا تھا، جنہوں نے
رنگ زیب کو باقاعدہ سلوک طے کرایا۔

تصوف کی خانقاہیں صدیوں تک لوگوں کے رجوع کا مرکز رہیں، ایک ایک خانقاہ میں
یک وقت ہزارہا افراد مقیم رہتے تھے اور ان کے کھانے پینے کا سارا انتظام اہل خانقاہ کی طرف
سے مفت ہوتا تھا۔ یہ خانقاہیں کوئی دو چار نہیں، ملک بھر میں سیکڑوں کی تعداد میں ہوتی تھیں۔ آج
سے اسی سوسال پہلے تک یہ حال تھا کہ ہمارے معاشرہ کا ہر فرد کسی نہ کسی بزرگ سے نسبت کا
تعلق رکھتا تھا۔

اصل میں تصوف دو طرح کا ہے۔ ایک تصوف خصوصی افراد کا ہے، جن کی تربیت کر کے
ان سے معاشرہ میں دعوت کا غیر معمولی کام لینا ہے۔ ان خصوصی افراد کے تصوف میں ریاضتیں
اور مجاہدے شامل ہیں، لیکن دوسرا تصوف عام لوگوں کی عمومی اصلاح سے تعلق رکھتا ہے۔ عام
لوگوں کے اس تصوف میں ریاضتیں اور مجاہدے شامل نہیں، روزانہ ایک آدھ گھنٹے کا ذکر و فکر اور
ایک دو ماہ میں صحبت کے لئے وقت نکالنا۔

تصوف کے نظام میں خصوصی لوگوں اور عام لوگوں کی تربیت کے لئے یہ جداگانہ طریق
نصاب شروع سے رہا ہے۔ جن لوگوں کو معاش کے لئے جدوجہد کرنی ہے اور گھریلو فرائض
سرانجام دینے ہیں، ظاہر ہے، انہیں مجاہدوں میں مبتلا نہیں کیا جا سکتا۔ لایکلف اللہ نفسا الا وسعھا۔
اہل تصوف نے ہمیشہ اس کا اہتمام کیا ہے۔ اب بھی اس کا اہتمام موجود ہے۔

تصوف کا سارا زور اللہ کے نور کو اخذ کرنے اور دل کو اللہ کو غفلت سے دور کر کے اس کی
محبت سے سرشار کرنا ہے اور نفس کو رذائل سے پاک کرنا ہے۔ یہ عمل ایک دو دن کا نہیں۔ یہ
خاموش عمل ہے۔ جب روزانہ ایک آدھ گھنٹہ کا ذکر ہوتا ہے تو قلب میں انوار کا نزول ہونا شروع
ہو جاتا ہے۔ انوار کے اس نزول سے فرد یوں محسوس کرنا شروع کرتا ہے، گویا اس کا پہلی بار جنم ہوا
ہے۔ اب تک وہ قیل قال اور رسمی اسلام پر عمل پیرا تھا۔ اب پہلی بار حقیقت اسلام اور روح
اسلام سے آشنا ہوا ہے۔ تصوف کا یہ تجربہ ایسا ہے، جسے بیان کرنے کے لئے بڑے سے بڑے
الفاظ کا ذخیرہ بھی ناکافی ہے۔ یہ تو ایمان کی وہ حقیقی لذت ہے، جسے حدیث میں "احسان" کے نام
سے ادا کیا گیا ہے۔ ایمان کی اس لذت سے آشنا ہونا ہر مومن کے لئے ناگزیر ہے۔ اس کے بغیر
نفس کی شرارتوں کا ادراک ہونا ہی دشوار ہوتا ہے، اس لئے کہ اس کے بغیر فرد جو زندگی بسر کرتا

ہے، وہ عام طور پر عقلی اور علمی سطح کی زندگی ہوتی ہے۔ عقلی اور علمی زندگی خشک زندگی ہوتی ہے،
جو ایمان کے لطیف ترین احساسات سے پوری طرح آشنا نہیں ہوتی۔ تصوف و احسان یعنی اللہ
سے محبت کا تعلق چونکہ انسانی فطرت کا ناگزیر تقاضا ہے۔ ہر انسان کی فطرت یکساں نوعیت کی
ہے، اس لئے فطرت کے محبت کے جذبات کی تسکین کے لئے اگر فرد کو محبوب کے ذکر کی مطلوبہ
خوراک حاصل نہ ہوگی تو نہ تو قلبی اطمینان حاصل ہوگا اور نہ ہی حسن کردار پیدا ہوگا۔ یورپ کی
قوموں کے کردار کو حسن کردار سے تعبیر کرنا صحیح نہ ہوگا، اس لئے کہ یہ تو نظام تعلیم کے جبر سے قومی
نوعیت کا کردار ہے، جس میں عقل سے کچھ باتیں منوا کر اور کچھ عادتوں کی تربیت کر کے کچھ
بنیادی معاملات میں انہیں اصولوں کا پابند بنایا گیا ہے۔ اس طرح کے تعلیم کے ذریعہ پیدا ہونے
والے قومی کردار سے نہ تو فطرت کے سارے جذبات کی تسکین ہوتی ہے اور نہ ہی خاندانی
و معاشرتی نظام میں استحکام پیدا ہو سکتا ہے۔

محترم جناب اشفاق احسان صاحب نے مغربی طرز کے نظام تعلیم سے جو امیدیں وابستہ
کی ہیں اور اس سلسلہ میں جو حسن ظن ظاہر فرمایا ہے، چونکہ ہمارے ہاں بہت سارے حساس افراد
اس انداز سے سوچتے ہیں، اس لئے یہاں مختصراً اس کا تجزیہ ضروری ہے۔

مغربی نظام تعلیم و تربیت کی ایک خصوصیت تو یہی ہے کہ اس کے ذریعہ اس طرح کے
انسانوں کی تیاری کا عمل جاری ہے، جو بہتر مادی زندگی بسر کرنے اور قوم و ریاست کے حوالے سے
اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے سلیقہ سے آشنا ہو سکے اور قومی خصوصیات اور قومی اخلاقیات کا
حامل بن سکے۔

یقیناً سیاست، معیشت، اور اجتماعی زندگی پر اس نظام تعلیم و تربیت کے بہتر اور مؤثر اثرات
ظاہر ہوئے ہیں اور آج مغربی انسان مادی سہولتوں، سیاسی آزادی اور تمدنی ترقی کے اعتبار سے
معلوم انسانی تاریخ میں سب سے زیادہ خوش نصیب انسان شمار ہو گیا ہے۔ اس نظام تعلیم کا دوسرا
سب سے اہم منفی پہلو بھی ہے، جس نے مغربی انسان کو انسانیت کے لئے المیہ بنا دیا ہے اور
بر و بحر کو فساد سے بھر دیا ہے اور آخرت کے جہنم سے پہلے اس دنیا کو ذہنی، نفسیاتی اور وجدانی طور پر
جہنم کا نمونہ بنا دیا ہے۔ مغربی نظام تعلیم کا وہ پہلو یہ ہے کہ انسان کائنات اور اجتماعی زندگی کے
حوالے سے سارے سائنسی، طبعیاتی، نفسی و نفسیاتی علوم کو خدا کے تصور سے خارج کر دیا گیا ہے۔
اور ان علوم کی بنیاد میں اس تصور کو راسخ کر دیا گیا ہے کہ جو چیز عقل اور حواسِ خمسہ کے مشاہدہ میں
نہ آئے، وہ سرے سے موجود ہی نہیں ہے اور اس کا انکار کیا جائے۔ علوم کو تصورِ خدا سے نکال کر

تصور مادیت سے سرشار کرنے کا جو نتیجہ ظاہر ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ انسان جو فطرتاً خدا سے محبت کا داعیہ رکھتا ہے اور اس کی شخصیت کی ساری تان بان اس محبت سے ہی متشکل ہوئی ہے۔ اور اس شخصیت کے سارے وجود اور اس وجود کی ساری کڑیوں کی سلامتی ہی اس بات سے وابستہ ہے کہ وہ دل و جان سے خدا کی محبت کے ذریعہ اپنے جذبات کو تسکین کرے، وہ محبت خدا اور تصور خدا سے عاری ہو کر ترقی یافتہ حیوان کی صورت اختیار کر گیا ہے اور ایک طرف تو وہ نفسی، نفسیاتی، اعصابی، وجدانی اور روحانی طور پر ہزارہا امراض کا شکار ہو کر خود اعتمادی کے بحران میں مبتلا ہو گیا ہے۔ دوسری طرف خدا کی محبت سے پھوٹ کر نکلنے والی صفات و اوصاف محبت، شفقت، رحم، انسانیت نوازی، اخلاق حسنہ، ایک دوسرے سے اللہ کی خاطر تعلق خاطر رکھنا، دنیا سے بے نیازی، مادی سود و زیاں سے بلند ہونے کا نقطہ نگاہ، ماں باپ اور رشتہ داروں سے صلہ رحمی کرنا، شرم و حیا اور عزت و عصمت کے پاکیزہ تصورات کی پاسداری، دوست و احباب سے بے غرضانہ مخلصانہ تعلقات، بے لاگ جنسی جذبات پر رضا کارانہ طور پر قدغن لگانا، قوم پرستی کے تصورات سے بلند ہو کر انسانوں کو انسانی نقطہ نگاہ سے دیکھنا اور معاملہ کرنا، غرض کہ مغربی انسان ان سارے اوصاف سے محروم ہو گیا ہے۔

تیسری طرف سائنسی اور ٹیکنالوجی ترقی کی وجہ سے وہ قدرت کی ایسی قوتوں کو مسخر کرنے کا ذریعہ بن گیا ہے، جن قوتوں سے انسان کی حیثیت سے کام لینے کی صلاحیتوں سے وہ عاری ہے۔ چنانچہ بڑھتی ہوئی سائنسی ترقی اور ٹیکنالوجی انسانی ہلاکت کا موجب بن گئی ہے اور چند ہزار سرمایہ دار ملٹی نیشنلز کی صورت میں پوری انسانیت کے دل و دماغ کو کنٹرول کرنے، انہیں مادہ پرستانہ کلچر کے سانچہ میں ڈھالنے، ان پر اپنے مادہ پرستانہ نظریات ٹھونسنے اور گلوبلائیزیشن کے ذریعہ سیاست، معیشت، معاشرت، تعلیم اور پبلسٹی کے ذریعہ ایسے حالات پیدا کر چکے ہیں، جس سے پوری دنیا کی دولت کھنچ کر ملٹی نیشنلز کے ہاں پہنچ جائے۔ انسانوں کی عظیم اکثریت فاقوں کی وجہ سے بلبلا اٹھے، علاج و معالجہ کی رقوم نہ ہونے کی وجہ سے امراض کا شکار ہو جائے، گلوبلائیزیشن کے علمبردار عالمی سرمائیداروں کو اس سے کوئی واسطہ نہیں، وہ حیوانوں کا دل رکھتے ہیں، انہیں تو سرمایہ اور فقط سرمایہ چاہئے، اس مقصد کے لئے ساری انسانی قدریں تباہ ہو جائیں اور انسانی کلچر بدترین حیوانی صورت اختیار کر جائے تو کوئی ہرج نہیں، عالمی سرمائیدار کو صرف اور صرف سرمایہ چاہئے اور انسانی محنت کے خون پسینہ کا حاصل چاہئے۔ عالمی سرمائیدار کے سامنے دنیا پر اپنی خداوندی کو مسلط کرنے اور انسانوں کو آخری حد تک اپنا زیردست بنانے کے علاوہ اور کوئی

مقصد پیش نظر نہیں ہے۔

سرمایہ دار مغربی نظام تعلیم ہی کا پیداوار ہے۔ اس نظام تعلیم کا یہ وہ منفی اور تاریک پہلو ہے، جس کے مقابلہ میں اس کے افادیت کا پہلو غیر اہم سا ہو جاتا ہے۔

جب نئے نئے نظریات گھڑ کر سارے علوم و فنون اور اجتماعی زندگی سے خدا کے تصور کو خارج کر دیا جائے گا اور سیاست، تجارت، صنعت، سائنس، انتظامیہ وغیرہ کی تشکیل سیکولرزم کی بنیاد پر ہوگی، وحی کی تعلیمات سے سرے سے انکار ہوگا تو ہزارہا سالوں کے انسانی تجربات سے استفادہ کر کے اپنی قوم کی دنیا کی زندگی بہتر بنانے کے لئے تو ریاستی نظام ایک حد تک بہتر بنایا جا سکے گا، جس میں افراد قوم کو مادی اعتبار سے جملہ سہولتیں حاصل ہوں گی۔ عدل و انصاف کی فراہمی بھی ہوگی۔ لیکن قوم کو عالمگیر انسانی اخلاقیات کا حامل بنانا، ان کے ذہنوں پر انسانیت کے نقطہ نگاہ کو غالب کرنا، انہیں نفسی، نفسیاتی، دماغی اور اعصابی بیماریوں سے بڑی حد تک نجات دلانا، خوشحال زندگی اور مادی تعیشات سے آخری حد تک لطف اندوز ہو کر ڈپریشن، مایوسی احساس تنہائی اور خودکشی کے تصورات سے بچانا، فاضل دولت سے پسماندہ قوموں کی بھلائی کا پروگرام بنانا، حیوانی مقاصد سے کچھ دیر کے لئے بلند ہو کر پاکیزہ انسانی مقاصد کو پیش نظر رکھنا، یہ ساری چیزیں ایسی ہیں، جس کی بے خدا نظام تعلیم و تربیت سے امید رکھنا عبث ہے۔

اس ضمنی بحث کے بعد اب ہم پھر تصوف و احسان کی طرف آتے ہیں۔

آج جب کہ انسانیت مادہ پرستی کے عالمگیر ہولناک اثرات کہ وجہ سے بُری طرح ذہنی و نفسیاتی اور اعصابی امراض کا شکار ہو گئی ہے۔ مغرب کے ہر ملک کے ہر شہر کے ہر محلہ میں نفسیاتی ڈاکٹروں کی فوج ظفر موج تیار ہو گئی ہے۔ مغرب کا تقریباً ہر دوسرا فرد نفسیاتی مریض بن چکا ہے۔ مغرب کی بڑھتی ہوئی مادہ پرستی پر مشتمل تہذیب کے یہی اثرات مسلم ممالک میں تیزی سے پروان چڑھ رہے ہیں۔ اس طرح کی صورتحال میں تصوف و احسان سے وابستہ مسلم نفسیات کے ۱۳ سو سالہ ادارہ کی اہمیت کو نظر انداز کرنا اور اسے مختلف طریقوں سے غیر اہم ثابت کرنا اور اس نفسیات سے استفادہ کر کے اپنے افرادِ معاشرہ کے زندگی کے حوصلہ و ہمت کو قائم و برقرار رکھنے میں معاون ثابت نہ ہونا اور تصوف و احسان کے ادارہ کے ذریعہ وھو معکم اینما کنتم اور ان اللہ معنا کے تصور کو راسخ کرنے میں معاون نہ ہونا، یہ دوری اور دور بینی نہ ہوگی۔

ہمارے ہاں مسلم نفسیات سے دوری کی جو صورتحال پیدا ہو گئی ہے، وہ کئی اعتبار سے تشویشناک ہے۔ اس اعتبار سے بھی کہ ہم قرآن و سنت اور طویل تجربات و مشاہدات سے ماخوذ

بزرگوں اور علمائے ربانی کے علوم سے کورے ہونے کی وجہ سے تہی دامن ہوتے جا رہے ہیں۔ اور اس اعتبار سے بھی کہ اب ہمارا معاشرہ مغرب کی طرح تیزی سے نفسیاتی، اعصابی اور ذہنی مریضوں کے معاشرہ میں تبدیل ہوتا جا رہا ہے اور تحمل اور برداشت ختم ہو کر معمولی مسائل پر اپنی ذات سے بیزاری کے رجحان کی وجہ سے خودکشی کا عمل جاری ہے۔ مسلم نفسیات کیا ہے؟ اپنی ذات سے آشنائی کا نام ہے۔ اور اپنی اندر کی پوشیدہ قوتوں کے مشاہداتی علم کے ذریعہ منفی قوتوں پر کنٹرول اور مثبت قوتوں کی فروغ پذیری ہی مسلم نفسیات کا موضوع ہے۔ مسلم نفسیات بڑے پن سے دستبرداری اور چھوٹے پن کے انسانیت کا سفر طے کرنے کا نام ہے۔ مسلم نفسیات عقل کو نفس کی یرغمالی سے بچا کر اسے قلب سلیم کے حوالے کرنے کا نام ہے، تاکہ قلب سلیم انوار الٰہی کی منتقلی کے ذریعہ عقل کو عقل سلیم بنا سکے۔

مسلم نفسیات مطلق ہستی کی ذات سے رابطہ مستحکم کر کے اعصاب و نفسیات کے نظام کو معتدل بنانے اور اس نظام میں پیدا ہونے والے خلل کو ختم کرنے، دل کی رفتار کو متوازن بنانے اور عقل میں موجود سوچ کی لہروں میں نورانیت کے اثرات کو شامل کر کے پوری انسانی شخصیت کو مطلق ہستی ذات کے اثراتِ نور سے سرشار کر کے اسے اشرف المخلوقات کی حیثیت دینے کا نام ہے۔ یہ سارا کام قرآن سنت میں پوشیدہ نور سے اخذ فیض کے ذریعہ ہی ہوتا ہے۔

جس مسلم نفسیات نے صدیوں سے دینی و اخلاقی اعتبار سے معاشرہ اور افرادِ معاشرہ کی بڑی اکثریت کے اعصاب و نفسیات کو مستحکم کر کے، انہیں صبر، تحمل، قناعت، شکر، تھوڑے پر راضی رہنے، مصائب کو قدرت کی مرضی سمجھ کر صبر سے جھیلنے اور توکل علی اللہ، غیظ و غضب اور انتقام کے مقابلہ میں معافی جیسے اوصاف پیدا کئے۔ آج مادہ پرستی اور عقلیت کی عالمی تحریک کے زیر اثر اس مسلم نفسیات سے انکار کا نتیجہ اس کے علاوہ اور کیا نکل سکتا ہے کہ جملہ انسانی اوصاف سے محرومی ہو اور معاشرہ، افراد کی نفسی بیماریوں کی وجہ سے ہمہ جہتی فساد سے دوچار ہو جائے۔ کتاب و سنت لوگوں کی اصلاح از خود نہیں کرتے یا قیل قال کے صاحباں کے وعظ و نصیحت سے اصلاح نہیں ہوتی، اس لئے کہ جو افراد خود اپنی اصلاح نفس سے محروم ہوں، ان کی باتیں اور وعظ و نصیحت تاثیر اور نورانی اثرات سے خالی ہوتی ہیں، بلکہ ان کی باتوں سے معاشرہ میں تضادات ہی جنم لیتے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہئے کہ مسلم نفسیات کا نظری علم اور اس نفسیات کے ماہروں کی صحبت کا تربیتی نظام ہمارے نظام تعلیم کا حصہ ہوتا، تاکہ افراد کی شر کی نفسیات پر خیر کی نفسیات کے غلبہ کی صورت پیدا ہو اور مسلم معاشرہ نفسیاتی مریضوں کے معاشرہ میں تبدیل ہونے سے بچ جائے۔ لیکن جدید

علوم اور عقلیت کی تحریکوں نے مسلم نفسیات کی حقیقی نوعیت کے فہم کے سلسلہ میں جو غیر معمولی حجابات پیدا کر دیئے ہیں۔ ان حجابات کے دور ہونے کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

• مسلم نفسیات کے ماہر یعنی علمائے ربانی کیا چاہتے ہیں؟ وہ تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ آپ ہمیں خالی دل دیدیں، تاکہ ہم خالی دل کو پاکیزہ نقش و نگار کے ذریعہ اس کی تہذیب و تطہیر کا فریضہ سرانجام دیں۔ جب اس دل کی تہذیب و تطہیر کا عمل شروع ہوگا تو وہ مادہ پرستی اور عقلِ محض کی کسی تحریک سے متاثر نہ ہوگا۔ ایسا دل صابر و شاکر اور محبوب کی محبت سے سرشار ہوگا۔ اور جملہ انسانی اوصاف سے بھی بہرہ ور ہوگا لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ ہم ہر قسم کے نفسی، نفسیاتی اور ذہنی و دلی امراض کا شکار ہونا بلکہ موت تک قبول کرنا گوارا کریں گے، لیکن دل کو علمائے ربانی کے حوالے کرنے کے لئے تیار نہ ہوں گے۔ ایسے میں بڑے سے بڑا ماہر، نفسیاتی مریضوں کی حالتِ زار پر خون کے آنسو بہائے بغیر اور کیا کر سکتا ہے۔

تصوف افراد کی باطنی بیماریوں سے بحث کرتا ہے اور ان کا علاج کرتا ہے۔ آج جب کہ ہم میں سے تقریباً ہر فرد باطنی بیماریوں میں مبتلا ہے۔ حب جاہ حب مال، بڑے پن، اعتراض اور بحث و مباحثہ کی نفسیات، اپنے علاوہ سب کو گناہوں کا مجسمہ اور معاشرہ کو بگاڑنے کا ذمہ دار سمجھنے کے زاویہ نگاہ کا مستحکم ہونا، دوستوں، عزیزوں اور اپنی جماعت اور گروہ سے وابستہ افراد سے اکثر شاکی رہنے اور ذہنوں پر ان کے کمزور پہلوؤں کے غالب ہونے کا احساس، سب سے بے اطمینانی، بیزاری اور عدم اعتماد کی صورت کا پیدا ہونا، معمولی اختلاف رائے یا مفادات کے معمولی نقصان یا عزت و وقار میں کمی کے مسئلہ کو تعلقات کی مستقل خرابی اور دشمنی کا ذریعہ بنانا، تضاد اور دوئی کا شکار ہونا، سامنے تعریف کرنا، پس پشت شخصیت کے گرانے کے لئے کوشاں ہونا، ڈاکٹروں، وکیلوں، افسروں، صحافیوں اور پولیس وغیرہ کی نظروں، کا ہر وقت لوگوں کی جیبوں پر رہنا، غرض کہ اس طرح کی باطنی بیماریاں ہیں، جن میں ہم میں سے تقریباً ہر شخص کسی نہ کسی حد تک مبتلا ہے۔ لیکن ان بیماریوں میں مبتلا ہونے کے باوجود المیہ یہ ہے کہ نزع کی حالت میں مبتلا ہر مریض یہ سمجھتا ہے کہ وہ صحتمند ہے، اس کے ساتھ ساتھ نہ صرف یہ کہ وہ معالج کی ضرورت محسوس نہیں کرتا، بلکہ اس کا دل معالج کے خلاف طرح طرح کی غلط فہمیوں، عدم اعتماد بلکہ اسے اپنی سطح سے بھی کم تر سمجھنے کے احساس سے بھرپور ہے۔

جب مریضوں سے اپنی بیماری کا ادراک سلب ہو جائے اور معالجوں سے دل بیزار ہو جائے تو ظاہر ہے باطنی و روحانی بیماریوں پر مشتمل معاشرہ ہر طرح کے مفاسد سے بھر جاتا ہے،

اور وہ اس معاملہ میں دنیا کے دوسرے معاشروں کے لئے عبرت کا موجب بن جاتا ہے۔

تصوف واحسان دراصل فرد کی نفسیات کو متوازن بنانے کا سب سے بڑا ادارہ ہے۔ اس کا پہلا اور بنیادی نکتہ ہی یہ ہے کہ فرد اہل اللہ کی بزرگی کو تسلیم کرکے ان کے تلمذ کی حیثیت سے اس کے سامنے پیش ہو۔ اللہ کو بندہ کی فروتنی کی یہ ادا ایسی پسند ہے کہ بس محض اس کا خود سپردگی کی حیثیت سے پیش ہونا ہی اسے تو اور میں کے حجابات اور بڑے پن اور تفاخر کے جذبات سے ایک حد تک نجات دلانے کے لئے کافی ہوجاتا ہے۔ اگرچہ اصلاح کا عمل آہستہ آہستہ ہی شروع ہوتا ہے۔ لیکن ایک بار خود سپردگی سے ہی فرد کو غیریت اور دوئی سے نجات کا ایک حد تک اندازہ وادراک حاصل ہوجاتا ہے۔

بڑوں کی بزرگی مان کر چھوٹے پن کی حیثیت سے ان کے سامنے پیش ہونا، موجودہ دور میں بالخصوص جتنا مشکل ہوگیا ہے، وہ سامنے کی بات ہے، کسی ذہین اور باصلاحیت فرد کو یہ کہنا کہ روحانی معاملات میں اہل اللہ کی شاگردی اختیار کرنا چاہئے، اسے مشتعل کرنے اور اس کے مزاج میں گرما گرمی پیدا کرنے کے برابر ہے، حقیقت یہ ہے کہ فرد کی آدھی اصلاح تو محض اسی بات سے ہوجاتی ہے کہ وہ خود شکستہ ہوکر اللہ کے دوست کے سامنے آداب عبدیت سیکھنے کی غرض سے پیش ہو۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ ایک بار شیطان نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے پیش ہوکر عرض کیا کہ آپ کلیم اللہ ہیں، اب کی بار اللہ سے گفتگو ہو تو میری سفارش بھی کریں، تاکہ میری توبہ قبول ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بڑے خوش ہوئے کہ شیطان توبہ کی راہ پر گامزن ہوا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے سامنے شیطان کی سفارش پیش کی تو اللہ نے فرمایا کہ شیطان سے کہو کہ توبہ کی ایک ہی شرط ہے، وہ یہ کہ آدم علیہ السلام کی قبر پر جاکر سجدہ کرو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے شیطان کے سامنے یہ شرط رکھی، شیطان نے کہا کہ میں نے جب زندگی میں آدم کو سجدہ نہیں کیا تو اب موت کے بعد اسے سجدہ کیسے کرسکتا ہوں۔

الغرض یہ کہ بڑے پن کا جذبہ نفسیات میں جو مفاسد پیدا کردیتا ہے، اس کے ہزاروں علاج کا علاج ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ جو لوگ اپنی ہستی کو اللہ کے سامنے مٹا چکے ہیں اور نفس کی فنائیت کی وجہ سے وہ دوئی سے نجات حاصل کرچکے ہیں، ان کی عقیدت ومحبت سے شاگردی اختیار کی جائے۔

تصوف واحسان کا ادارہ معاشرہ کے مجموعی بگاڑ کے اثرات سے متاثر ہونے کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ آج بھی اس ادارہ میں وہ قوت موجود ہے کہ اگر زندگی کے مختلف شعبوں سے

تعلق رکھنے والے باصلاحیت افراد اصلاح نفس کے سلسلہ میں اس ادارہ سے رجوع ہوں تو یہ ادارہ نہ صرف یہ کہ اللہ کی محبت اور بندوں کی محبت پیدا کرکے فرد وافراد کو معاشرہ کے لئے نہایت مفید وکارآمد بنا سکتا ہے، بلکہ یہ ادارہ دینی حمیت پیدا کرنے کا موجب ہوکر داخلی وخارجی باطل کے خلاف صف آرائی کے لئے بھی افراد کار فراہم کرسکتا ہے۔ ایسے افراد کار جو قول وعمل کے بحران وتضاد سے محفوظ ہوں گے اور جو محض اللہ کے لئے کٹیں گے اور اللہ لئے جڑیں گے اور جو اپنی نفسیات کے مدوجزر کے حوالے سے افراد ومعاشرہ کی نفسیات سے بھی آشنا ہوں گے۔

اس دور میں اگر تصوف واحسان کا ادارہ مؤثر کردار ادا کرنے سے قاصر ہے تو اس کا ایک سبب یہ ہے کہ ذہین، تجربہ کار اور باصلاحیت افراد یا تو عقلیت کی تحریکوں کے زیر اثر یا غلط فہمیوں کی وجہ سے یا روایتی پیری مریدی کے رنگ ڈھنگ کو دیکھ کر اس ادارہ سے متنفر ہیں۔ حالانکہ اگر ان حجابات کو ہٹا کر اہل اللہ سے قربت کا تعلق پیدا ہوجائے تو یہ دیکھ کر حیرت زدگی ہوجائے کہ وہ سارے پاکیزہ جذبات جو للّٰہیت، بے نفسی اور خدمت دین کے لئے مطلوب ہیں، وہ تو اللہ کے ان بندوں کے پاکیزہ قلبوں سے ہی منتقل ہوتے ہیں اور صبغۃ اللہ کی صورت پیدا ہونے کا ذریعہ تو اللہ کے یہی بندہ ہیں، ان سے دوری، ان کے بارے میں غلط فہمیاں اور ان سے سوئے ظن تو حقیقت سے دوری اور اپنے آپ سے دوری اور مخلصانہ کیفیات سے دوری کے مماثل ہے۔

اس دور میں جدید عالمی فکری اور نظری تحریکوں کے زیر اثر ایک اہم نکتہ جو اسلامی فکر کے فاضلوں کے ذہنوں سے ایک حد تک اوجھل ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ افراد کی اصلاح کتابی علم، نظریاتی اور اصولی نکات کے تکرار، درسی نظام ونصاب اور وعظ نصیحت اور کانفرنسوں وسیمیناروں سے نہیں ہوتی، کتابی علم اور اصولی تعلیمات کے تکرار سے ذہن یقیناً ایک حد تک متاثر ہوتے ہیں اور شعور کی ایک حد تک تربیت ہوتی ہے۔ لیکن نفس کی قوتوں کے زور کو توڑنے کے لئے شعوری اصلاح کافی نہیں ہوتی، اس کے لئے ذکر وفکر کے ذریعہ اللہ سے محبت کے تعلق کو قائم رکھنے اور مستحکم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ سارا عمل شعور سے زیادہ وجدان اور دل کا عمل ہوتا ہے۔ دل جب محبت اور ذکر کے انوار سے نفس کی کثافتوں اور اس کے حجابات سے ایک حد تک آزاد ہونے لگتی ہے تو زندگی میں حقیقی انقلاب کا عمل شروع ہوجاتا ہے اور زندگی کے سارے پہلو اور گوشے بدلنا شروع ہوجاتے ہیں اور اللہ اور اس کے دین کے لئے حساسیت اتنی بڑھ جاتی ہے کہ داخلی وخارجی زندگی میں موجود منکر وباطل کے خلاف وحشت اور طبعی بیزاری کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ شعوری اسلام کے لئے تو یقیناً علم کی ضرورت ہے، لیکن ایمان ویقین کی پختگی اور تہذیب نفس کے لئے

محبت کی باطنی حسوں کی بیداری کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے بغیر سیرت سازی کے کام میں استحکام ہونا ہی دشوار ہے۔ محبت کی حسوں کی بیداری کا یہ عمل ذکر وفکر کے تربیتی ماحول کے ذریعہ ہی شروع ہوتا ہے۔ قرآن وسنت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان واسلام کی ساری عمارت ذکر وفکر کی اینٹوں سے ہی مستحکم ہوتی ہے۔ ذکر وفکر نہ صرف یہ کہ نفس کی جبلی قوتوں کو مطیع کر کے اللہ سے تعلق کے استحکام کا ذریعہ ہے، بلکہ ذکر وفکر میں ایسا نور پوشیدہ ہے، جو بجائے خود علم میں غیر معمولی اضافہ کا بھی ذریعہ ہے یعنی ذکر وفکر کے نتیجہ میں وہ باطنی صلاحیت پیدا ہوتی ہے، جس سے صحیح اور غلط کے درمیاں تمیز پیدا ہونے کی قوت بھی حاصل ہو جاتی ہے۔

اس سلسلہ میں ذیل میں قرآن کی چند آیتیں پیش کی جاتی ہیں، جس سے واضح ہوتا ہے کہ اصولی تعلیمات کی تکرار اور چند بنیادی نکات پر زور دینے سے اخلاقی تبدیلی کا عمل شروع نہیں ہوتا، بلکہ فرعونِ نفس کو مضمحل کرنے میں فیصلہ کن کردار اللہ کا ذکر ہی ادا کرتا ہے اور ذکر کا یہ ملکہ ذکر کے خاص ماحول اور اہل اللہ کی صحبت سے ہی حاصل ہوتا ہے۔

الم یان للذین آمنو ان تخشع قلوبھم لذکر اللہ (کیا ایمان والوں کے لئے اس کا وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر سے کانپ جائیں)

فویل للقسیئہ قلوبھم من ذکر اللہ اولائک فی ضلال مبین. (پس ان لوگوں کے لئے ہلاکت ہے جن کے دل اللہ کے ذکر سے متاثر نہیں ہوتے یہ لوگ کھلی گمراہی میں ہیں)

استحوذ علیھم الشیطان فانسھم ذکر اللہ اولائک حزب الشیطان الا ان حزب الشیطان ھم الخسرون. ان پر شیطان کا تسلط ہوگیا ہے پس اس نے ان کو اللہ کے ذکر سے غافل کردیا ہے یہ لوگ شیطان کا گروہ ہیں، خوب سمجھ لو یہ بات محقق ہے کہ شیطان کا گروہ خسارہ والا ہے۔

اقم الصلواۃ لذکری نماز قائم کرو میرے ذکر لئے۔ یعنی نماز جو مقاصد دین میں شامل ہے، اس کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ اس کا مقصود بھی ذکر کا استحضار ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا گیا ہے "**اذھب انت واخوک بآیاتی ولاتنیا فی ذکری.**" اے موسیٰ تم اور تمہارے بھائی فرعون کے جاؤ، میری آیتوں کے ساتھ، لیکن دیکھنا میرے ذکر سے غافل نہ ہونا۔ قتال کے موقعہ کے وقت بھی جس چیز کی یاددہانی فرمائی گئی ہے وہ ذکر ہی ہے۔ یاایھاالذین آمنوا اذا لقیتم فاۃ فاثبتو واذکر اللہ کثیرا. اے ایمان والو، جب تمہاری کفار سے مڈبھیر ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کا کثرت سے ذکر کرو۔

خود حضور ﷺ کو دعوۃ کے عظیم کام سے فارغ ہونے کے بعد اللہ کی طرف رجوع ہونے کا فرمایا گیا ہے۔ **فاذافرغت فانصب والیٰ ربک فارغب.** (آپ جب فارغ ہو جائیں تو ریاضت کریں اور اپنے پروردگار کی طرف توجہ رکھیں)۔

جن کا دل اللہ کی یاد سے غافل ہے، ان کے بارے میں تاکید کی گئی ہے کہ ان کی بات نہ سنو، **ولاتطع من اغفلنا قلبہ عن ذکرنا والتبع ھواہ.** ان کی بات نہ مانو جس کے دل کو ہم نے ذکر سے غافل کیا ہے، وہ خواہشات نفس کا پیروکار ہے۔

ولاتطرد الذین یدعون ربھم بالغدواۃ والعشی یریدون وجھہ (اور ان لوگوں کو اپنی مجلس سے علیحدہ نہ کیجئے جو صبح شام اپنے پروردگار کو پکارتے رہتے ہیں جس میں خاص اس کی رضا کا ارادہ کرتے ہیں)

واصبر نفسک مع الذین یدعون ربھم بالغداوۃ والعشی. (اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ بیٹھنے کا پابند رکھا کیجئے جو صبح شام اپنے رب کو پکارتے ہیں)

الغرض یہ کہ معاشرہ میں ہمہ گیر معاشرتی انقلاب (جو سیاسی انقلاب کا بھی ازخود ذریعہ بن جائے گا) کے لئے ضروری ہے کہ مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے دردمند اور باصلاحیت افراد روحانی توانائی اور اخلاقی قوت کے حصول کے لئے کسی نہ کسی حدتک تصوف کے ادارہ سے اخذ فیض کریں۔ نفس کی سرکشی اور اس کے زور قوت کو ایک حدتک توڑنے کی سعی کریں۔ اپنے حب جاہ، حب مال اور جذبہ شہرت کے رذائل کی اصلاح کریں۔ غیظ وغضب کے جذبات کو حد اعتدال میں لائیں۔ اللہ کے لئے مرنے اور اللہ ہی کے لئے جینے کا سلیقہ سیکھیں۔ باصلاحیت افراد کی طرف سے تربیت کے اس عملی تجربہ سے کسی حدتک گزرنے کے بعد اس سے معاشرہ میں جو معاشرتی انقلاب کی تحریک برپا ہوسکتی ہے، وہ حقیقی انقلابی تحریک ہوگی۔ اس تحریک سے معاشرہ میں ہر سطح پر سماجی فلاح وبہتری کے ادارہ مستحکم ہوں گے، بے بسوں محتاجوں کی خبرگیری کا بہتر نظام متشکل ہوگا اور بُرائی کے خلاف معاشرہ کی نچلی سطح پر دباؤ بڑھتا جائے گا اور منکر کے قلع قمع کے لئے ایسی حکمت عملی اختیار ہوگی، جس سے بے چینی بھی پیدا نہ ہو اور منکر کے دفع کی صورت بھی پیدا ہوگی، انشاء اللہ اسی معاشرتی انقلاب سے ہی میدان سیاست میں بھی ایسی طاقتیں مستحکم ہوں گی، جو سیاست کو استحصالی اور مفاد پرست سیاستدانوں اور فوجی وسول نوکر شاہی کی گرفت سے آزاد کرنے اور اس کی صفائی وتطہیر کا موجب ہوگی۔

اس وقت جب کہ معاشرہ کا پڑھا لکھا طبقہ عمومی طور پر تصوف کو مسترد کر چکا ہے، ایسی

ت میں بھی بعض اہل تصوف کی طرف سے معاشرہ میں سماجی فلاح کے شعبہ میں ایسے کام انجام ہو رہے ہیں کہ جنہیں دیکھ کر دل خیرہ ہو جاتا ہے۔

مثلاً حضرت مولانا حکیم اختر صاحب کی طرف سے اختر ٹرسٹ کراچی کے ذریعہ ملک بھر ں نادار لوگوں کے علاج و معالجہ وغیرہ کی سطح پر بہت بڑا کام ہو رہا ہے، اسی طرح حضرت مولانا ید احمدؒ کے رشید ٹرسٹ کی طرف سے مجاہدین کی امداد اور میدان صحافت میں حق وصداقت کے وغ کے لئے کئی رسائل واخبارات کے اجراء کا کام، اور ان رسالوں کے ذریعہ باطل اور اہل ل کے خلاف جدوجہد کو تیز کرنے کا کام بڑی خوش اسلوبی سے ہو رہا ہے۔

محترم جناب اشفاق احسان صاحب نے موضوع ایسا چھیڑا ہے کہ دل چاہتا ہے کہ اس پر یر حاصل بحث کی جائے، لیکن بحث کی طوالت کی وجہ سے اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔

یہ مضمون لکھا جا چکا تھا کہ محترم جناب اشفاق احسان صاحب کا دوسرا مکتوب ملا، جس میں وصوف نے کچھ نئے اشکالات کی وضاحت کے لئے بھی فرمایا ہے۔

محترم اشفاق احسان صاحب نے ایک سوال یہ دریافت فرمایا ہے کہ ہمارے ہاں اتنے عارفین کہاں ہیں، جو پندرہ ہزار مدارس کے مدرسین اور شاگردوں کی اصلاح کے لئے زیادہ نہیں تو پانچ فی صد ضرورت ہی پوری کرنے کے لئے کافی ہوں۔

یقیناً زوال پذیر معاشرہ میں، اب ایک تو پہلے کی طرح صاحب کمال علمائے ربانی کا خال ہے، تاہم بہرحال معاشرہ کی استعداد، ضرورت وحالات کی مناسبت سے اب بھی اہل اللہ موجود ہیں۔ ہر وہ شخص جو مربی کی فہرست میں شامل ہے، جو نفس مطمئنہ کا کورس مکمل کر کے کسی مستند بزرگ کا خلافت یافتہ ہے، وہ نفس کی ساری عیاریوں اور مکاریوں سے بڑی حد تک آشنا ہو جاتا ہے اور دوسروں کی نفسی تربیت کے اہل ہو جاتا ہے۔ اس طرح کے مربی الحمدللہ معاشرہ میں اب بھی موجود ہیں۔ ملک میں یقیناً دو چار ہزار افراد تو ایسے مربی ضرور موجود ہوں گے۔ اس طرح کا ہر شخص باطن میں سوز و ساز اور عشق کی اتنی کیفیات رکھتا ہے کہ جو فرد بھی ایک بار حقیقی طلب اور محبت وعقیدت کے جذبات کے ساتھ ان سے وابستہ ہو جائے، اس کے دل میں عشق کی چنگاری بھڑکنا شروع ہو جاتی ہے، اگر ایک مربی سے دس بیس، پچاس ہزار یا ایک دو لاکھ افراد بھی وابستہ ہو جائیں تو ان سب کا دل اپنی اپنی استعداد کے مطابق محبت اور عشق کے جذبات سے ہمکنار ہونا شروع ہو جاتا ہے اور ''احسان'' اور نور ایمان اور نور معرفت کے ذریعہ آہستہ آہستہ اس کا معرفت نفس ومعرفت رب کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ بزرگوں کی روحانی قوت کی مثال ریل کی

اس طاقتور انجن کی طرح ہے، جو سوسو ڈبوں کو کھینچ لیتی ہے اور ان ڈبوں میں موجود بے شمار افراد کو مطلوبہ منزل تک پہنچاتی ہے۔

محترم جناب اشفاق احسان صاحب نے ایک اشکال یہ پیش فرمایا ہے کہ مجھے بڑے بڑے بزرگوں میں اظہار تفاخر اور عجب کا انداز نمایاں نظر آتا ہے اور وہ چھپائے نہیں چھپتا، مثلاً ملک بھر سے نکلنے والے مختلف دینی رسالوں میں بزرگوں کے نام سے محبوب العلماء والصلحاء حضرت مولانا پیر صاحب جیسے الفاظ ان کے علم اور ان کی اجازت ہی سے لکھے جا سکتے ہیں۔ کیا یہ اپنے منہ میاں مٹھو بننے کی کوشش کے علاوہ بھی کچھ ہو سکتا ہے؟

راقم کی نظر میں مریدوں کی طرف سے بزرگوں کے شان میں غلو کی حد تک قصیدہ گوئی اور آداب کی بجا آوری میں تفریط ایسی چیز ہے، جو بہت ساری غلط فہمیوں کا موجب بنی ہوئی ہے اور ذہین اور سمجھدار افراد کو بزرگوں کے نفسی ونفسیاتی علوم سے دور کرنے کا موجب بن گئی ہے۔ لیکن مریدوں کے اس غلو کو بزرگوں کے اظہار تفاخر یا ان کی رضامندی کی علامت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے دو اسباب ہیں۔ ایک یہ کہ سلوک میں داخل ہونے کے بعد فرد جوں جوں آگے بڑھتا رہتا ہے، تجلیات الٰہی کے ذریعہ سالک کی تربیت ہوتی رہتی ہے۔ کبھی جلالی تجلی کا غلبہ ہوتا ہے تو کبھی جمالی تجلیات کا۔ سالک کی شخصیت تجلیات کے زیر اثر اس طرح سفر کرتی رہتی ہے کہ وہ چوبیس گھنٹے جلالی اور جمالی تجلیات کی حالت میں رہتی ہے۔ جلالی تجلیات کا اثر رہتا ہے، سالک کا دل گھلنے لگتا ہے اور فرد یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس سے گویا دین و دنیا کی ساری نعمتیں سلب کر لی گئی ہیں۔ محبوب کی طرف سے اعراض اور بے رخی کے نتیجہ میں سالک اپنے اوپر اذیت کے پہاڑ محسوس کرنے لگتا ہے اور اس کی دل کی دنیا درہم برہم ہو جاتی ہے، لیکن جلالی تجلیات کے مابعد جمالی تجلیات کا عکس قلب پر گرنے لگتا ہے۔ جمالی تجلیات کا اثر یہ ہوتا ہے کہ سالک محسوس کرتا ہے کہ محبوب نے قرب و معیت کا راستہ کھول دیا ہے، اب اس کے لئے یہ دنیا جنت کا نمونہ بن گئی ہے۔ سالک دس بیس سال تک قبض وبسط اور جلالی وجمالی تجلیات کی ان حالتوں میں رہ کر جب نفس مطمئنہ کے مقام پر فائز ہو جاتا ہے تو وہ حقیقتاً دعویٰ سے دستبردار ہو جاتا ہے، وہ عاجزی، فروتنی اور فنائیت کی راہ پر آ جاتا ہے۔ اس لئے کہ سلوک کے سفر کے دوران دعویٰ، تفاخر، افضلیت اور بڑے پن کے احساسات ونتائج کو بھگت چکا ہوتا ہے کہ جمالی تجلیات کی سلبی کی وجہ سے اس کے دل پر قیامت سے پہلے قیامت برپا ہو جاتی ہے، جب تک وہ توبہ اور آہ وزاری کے ذریعہ فروتنی کی راہ پر نہیں آتا، اس کے قلبی وباطنی حالات درست نہیں

ہوتے اور اسلامیت کی راہ پر چلنا اس کے لئے دشوار تر ہو جاتا ہے۔

بزرگوں کی شان میں غیر معمولی قصیدہ گوئی دراصل مریدوں کا اپنا انفرادی فعل ہوتا ہے۔ چونکہ عقیدت اور محبت سے متعلقہ افراد کو بزرگوں سے غیر معمولی روحانی فیض حاصل ہوتا ہے بزرگوں سے اپنے قلب کے اتصال کی وجہ سے ان کے قلب میں موجود کثرت ذکر کے ذخیرہ کے انوار سالکین کے قلب میں منتقل ہونا شروع ہو جاتے ہیں، جس سے وہ مسرت کے لازوال احساسات سے سرشار ہو جاتے ہیں، اور دنیا مافیہا کے غم سے نجات حاصل کر لیتے ہیں۔ ان احساسات کی وجہ سے وہ محبت وعقیدت کے جذبات میں اعتدال قائم نہیں رکھ پاتے، عقیدت ومحبت کے غلو کے اس طرح کے مظاہر بزرگوں کے لئے خود بڑی پریشانی کا باعث بن جاتے ہیں، لیکن چونکہ بزرگ محسوس کرتے ہیں کہ محبت کا یہ اظہار اندر کے والہانہ جذبات کی وجہ سے ہے، ان کے جذبات پر قدغن لگانے سے سالکوں کی سخت دل شکنی ہوگی۔ حالانکہ بزرگوں کے لئے اس طرح کے مظاہر خود بڑی شرمساری اور سخت اذیت کا موجب ہوتے ہیں، میرے سامنے اس سلسلہ میں اپنے مربی حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان مدظلہ کے کئی تجربات ہیں۔ انہوں نے بیسیوں بار محبت کے ان مظاہر سے منع کیا۔ لیکن نتیجہ صفر رہا۔ اس کے بعد یہ بھی دیکھا کہ جس صاحب علم فرد نے بھی ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ چومے، ڈاکٹر صاحب نے مجمعہ میں اس شخص کے ہاتھ کھینچ کر کے اس کا بوسہ لیا۔ کیا اظہار تفاخر کا حامل ہزاروں مریدوں کے سامنے اپنے مرید کے اس طرح ہاتھ چوم سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں اس عاجز کو اپنے بھی کچھ تجربات ہیں۔ بعض خوش گمان دوستوں کو اس عاجز کی باتوں سے بہت فائدہ ہوا۔ اس فائدہ کا اثر یہ ہوا کہ یہ دوست محبت میں اتنا غلو کرتے ہیں اور وہ الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ دل شرم اوراذیت کے شدید احساسات محسوس کرتا ہے، لیکن انہیں سختی سے روکنا اس لئے دشوار ہے کہ وہ اپنے دل کے ہاتھوں ایسا کرنے پر مجبور ہیں۔

اس لئے بزرگوں کے بارے میں یہ بدظنی ہرگز بجا نہ ہوگی کہ انہیں دعویٰ اور اظہار تفاخر کا مریض قرار دیا جائے۔

دراصل اہل اللہ سے استفادہ کی راہ میں عقل سیکڑوں بہانے بناتی ہے۔ عقل کے ایک دلیل کا توڑ ہو جاتا ہے تو وہ دس نئے دلیل سامنے لاتی ہے، اہل اللہ کے معرفت نفس اور معرفت رب کے علوم سے مشاہداتی آگاہی کے لئے عقل کو ایک طرف رکھے بغیر چارہ کار ہی نہیں ہے۔ ہاں عقل جب معرفت کے انوار سے ایک حد تک بہرہ ور ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد

عقل کے بھرپور استعمال کے جو نتائج نکلتے ہیں، وہ باعث برکت ہوتے ہیں۔

آخر میں یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ تصوف واحسان کا ادارہ اصلاح نفس، تہذیب نفس اور محبت الٰہی اور انوار الٰہی کے اخذ کے لئے کوئی آخری ادارہ نہیں۔ اور اصلاح محض اسی ادارہ سے وابستہ نہیں ہے، بلکہ اللہ کے بہت سارے ایسے بندہ ہر دور میں موجود رہے ہیں اور آج بھی ہیں، جن کے فطرت سلیمہ کے اجزاء بڑی حد تک محفوظ رہتے ہیں اور جنہیں خود احتسابی اور اپنی اصلاح کی غیر معمولی فکر دامنگیر رہتی ہے، اس طرح کے افراد قرآن اور ذکر واذکار سے مستقل تعلق قائم کر کے اور اپنے نفس کا باریک بینی سے مستقل احتساب کر کے بڑی حد تک اپنی اصلاح کرنے میں کامیاب رہتے ہیں، ایسے افراد کا قرآن وسنت اور ذکر واذکار سے تعلق دوسروں کو سنانے کی غرض سے نہیں ہوتا، بلکہ ان کا اولین مقصد اپنی اصلاح ہی ہوتا ہے۔ اپنی اصلاح کے قابل ذکر مرحلہ کے بعد ہی وہ دعوۃ کے فریضہ کی سرانجامی کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اس طرح کے افراد بھی اہل اللہ کے زمرہ میں شامل ہوتے ہیں۔ لیکن اتنا فرق ضرور ہوتا ہے کہ وہ نفس کے تجزیاتی وتجرباتی مراحل سے نہ گزرنے اور جلالی وجمالی تجلیات کے عکس اور قبض وبسط کی وسیع دنیا سے عدم آشنائی کی وجہ سے دوسروں کی تربیت کرنے اور انہیں نفس مطمئنہ کے مراحل سے گزارنے کی صلاحیت سے بہرہ ور نہیں ہوتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس طرح کے اہل اللہ جو نفسی خرابیوں سے بڑی حد تک محفوظ ہوں اور جو اخلاق حسنہ کے حامل ہوں، موجودہ دور میں خال خال ہی ہیں۔ اس لئے کہ بدقسمتی سے معاشرہ مفاسد سے اتنا بھرپور ہے کہ وہ عام طور سے افراد کی فطرت سلیمہ کے اجزاء کو ضائع ہی کر دیتا ہے اور ان کی نفسیات کو مفاسد سے بھر دیتا ہے۔

دورِ جدید کا چیلنج

اور صوفیائے کرام کی ذمہ داریاں

مسلم امت کی حالتِ سکرات میں علمائے ربانی کا کردار

ہمارے صحیح صوفیائے کرام اور علمائے ربانی میں ایک بڑی کمزوری جو نظر آتی ہے، وہ یہ ہے کہ مسلم امت کو درپیش نئے دور کے چیلنج کا انہیں شعور حاصل نہیں، اس عدم شعور کی وجہ سے اس سلسلے میں اپنے کردار کی ادائیگی کا انہیں کوئی فکر لاحق نہیں، ورنہ مسلم امت کی ساری تاریخ میں مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی تک ہر دور کے بزرگوں اور علمائے ربانی نے اپنے دور کے فتنوں کے مقابلہ اور مسلم امت کی بقا و تحفظ کے لئے اہم کردار ادا کیا ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اب تک دین کو پہنچانے اور اس کے تسلسل کو قائم رکھنے میں سب سے فیصلہ کن کردار علمائے حق اور صوفیائے کرام کا ہی رہا ہے۔ اس وقت جب مسلم امت حالتِ سکرات میں مبتلا ہے اور عالمی کفر اور کفر کی عالمی طاقتوں نے چہار سو مسلم امت کا گھیرا کر کے، دنیا میں ایمان کی سلامتی اور عزت اور وقار کے ساتھ زندہ رہنے کے اس کے سارے دروازے بند کر دیئے ہیں اور مسلم امت کے ہر علاقے اور ہر ملک کے حکمرانوں کو خرید کر کے یا انہیں خوفزدہ کر کے ریاست کے سارے اداروں کو، امت کے افراد کو خدا اور رسول سے باغی اور مرتد بنانے اور تہذیبی اعتبار سے مادہ پرست عالمی تہذیب کے لئے فضا سازگار بنانے کے مقصد کے کام پر لگا دیا ہے تو اس طرح کی صورتحال میں انفرادی طور پر افراد کی اصلاح کا کام بھی اس وقت تک مشکل ہے، جب تک قومی اور ملی سطح پر حکمرانوں پر دباؤ ڈال کر انہیں امت کو تہذیبی اعتبار سے مارنے اور ہلاک کرنے سے روکنے کے طریقے اختیار نہ کئے جائیں گے۔

علمائے ربانی کے لئے دورِ جدید کے چیلنج سے عہدہ برآ ہونے کی دو راہیں

جب امت کا ملی اور تہذیبی وجود تباہ ہوتا ہو اور اسلام کے بنیادی عقائد اور اقدار خطرے میں ہوں اور تہذیبی ارتداد کا یہ سارا کام عالمی شیطانی قوتوں کے ایما پر مسلمان حکمران، قوم کے حکومتی ذرائع اور وسائل اور تعلیمی نظام اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے سرانجام دیتے ہوں تو ظاہر ہے کہ اس طرح کی صورتحال میں خاموش تماشائی نہیں رہا جا سکتا، ایمانی غیرت اور حمیت کا تقاضا ہے کہ اس سلسلہ میں اپنی بساط کے مطابق اپنا کردار ادا کیا جائے، اگر ہمارے صوفیائے کرام اور علماء حق اس سلسلے میں براہ راست کردار ادا نہیں کر سکتے تو نہ سہی، کم از کم انہیں بالواسطہ طور پر اس سلسلے میں کوئی متحدہ کردار ادا کرنا چاہئے۔ اس کی کئی صورتیں اور طریقے ہو سکتے ہیں، ایک صورت یہ ہے کہ صوفیاء کرام اور علماءِ حق کا باہم رابطہ ہو، قومی سطح پر موجود اہم خانقاہوں کے بزرگوں کے درمیان بہتر رابطے کی صورت پیدا ہو، اس ابتدائی اقدام کے بعد دوسرا اقدام یہ ہونا چاہئے کہ صاحبانِ خانقاہوں کو مدارس کے علماء اور مذہبی اور دینی جماعتوں کو واضح طور پر یقین دلانا چاہئے کہ حکومت کی طرف سے نظامِ تعلیم کی مذہب دشمنی کی بنیاد پر تشکیل اور جدید ابلاغ کے تیز ذرائع سے مرد اور عورت کے عریانی کے شرمناک مظاہر کے ذریعے قوم کے کروڑوں افراد کو دیوس اور بے غیرت بنانے کی کارروائیوں کے خلاف جو بھی جدوجہد ہوگی، اس میں انہیں ان کا بھرپور تعاون حاصل ہوگا۔

چونکہ ہمارے حکمران اقتدار کے بھوکے ہیں، قوم کا غیر معمولی دباؤ نہ ہونے کی وجہ سے وہ عالمی قوتوں کے ہاتھوں فروخت ہو جاتے ہیں یا ان کے دباؤ میں آ جاتے ہیں، لیکن جب انہیں یہ خطرہ رہے گا کہ دینی عالم اور خانقاہوں کے بزرگ اپنے لاکھوں مریدوں سمیت ہماری حکومت کے لئے خطرہ بن جائیں گے تو سیکولر ہونے کے باوجود ان کے لئے قوم کی ذہن سازی اور تعلیمی تربیت کے اداروں کو تہذیبی بغاوت کے مقصد کے لئے استعمال کرنا مشکل ہوگا۔ کیا آج کے صوفیاء کرام سے یہ امید رکھی جائے کہ وہ اس سلسلے میں غور و فکر کر کے عملی اقدام اٹھائیں گے۔ اگر ہمارے صوفیاء کرام نے ایسا نہ کیا تو ان کے لئے آخرت میں احتساب سے بچنا مشکل ہو جائے گا۔ کیونکہ بزرگی کی وجہ سے انہیں خدا کی طرف سے وسائل بھی حاصل ہیں، ہزاروں مرید ہیں، جو ان کی اداؤں پر فدا ہیں، معرفت کے نام پر انہیں بھرپور مادی قوت بھی حاصل ہے۔ اس سب کے باوجود اگر صاحبانِ خانقاہ نے اپنے ذہین افراد کی مدد سے کوئی رابطائی نظام قائم کر کے حکمرانوں پر اخلاقی دباؤ ڈالنے کے لئے کوئی پروگرام تشکیل نہ دیا تو ملت اخلاقی احتساب سے تباہی کے غار میں جا گرے گی۔

صوفیاء سے وابستہ ذہین افراد کی ذہنی سطح کو بلند کرنے کا مسئلہ

دورِ جدید کے چیلنج سے عہدہ برآ ہونے کے سلسلے میں آج صوفیاء کرام اور علماء ربانی کے کرنے کا دوسرا کام یہ ہے کہ انہیں اپنے حلقہ سے وابستہ کچھ ذہین افراد کو اسلامی فکر کے نئے مفکروں

اور فلاسفروں کے مطالعے کے لئے مخصوص کرنا چاہئے، ایسے مفکر و فلاسفر جنہوں نے اسلام کو دورِ جدید کے نظریات کے پس منظر میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے، چونکہ ان کی یہ کوشش اسلامی فکر کے لئے سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہے، اس سے دورِ جدید کی تعلیم یافتہ نسلیں متاثر ہوئی ہیں اور اسلام کے قریب آئی ہیں، اس لئے ایسا اسلامی فکر نہ صرف قابلِ مطالعہ ہے، بلکہ اس سے بھرپور استفادہ کر کے صوفیاء سے وابستہ افراد کی ذہنی سطح کو بلند کرنے کی ضرورت ہے۔

چونکہ اسلام دل کے ساتھ عقل کو بھی بڑی اہمیت دیتا ہے، قرآن میں اہلِ جہنم کی طرف سے یہ کہلوایا گیا ہے کہ ہم اگر عقل سے کام لیتے تو آج جہنم میں نہ ہوتے، قرآن بار بار عقل سے کام لینے پر زور دیتا ہے۔ جو افراد عقل سے کام لے کر قدرت کے کائنات کی عظیم نشانیوں پر غور نہیں کرتے، قرآن ایسے افراد کو گمراہی کی نوید سناتا ہے۔ عقل سے سینکڑوں، ہزاروں علوم اور فنون وجود میں آ گئے ہیں۔ عقل زندگی میں ارتقا کا بھی بڑا ذریعہ ہے۔ عقل کو بالکل مسترد کر کے محض دل اور وجدانی صلاحیتوں کو بڑھانے اور تصوف کو کشفی اور کراماتی علوم میں بند کرنا، یہ سادہ لوحی ہے، جو اسلام کے فروغ اور مسلم امت کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ اہلِ مغرب کی طرف سے پیدا کردہ عقلی علوم (جو مادہ پرست تہذیب کے فروغ کا ذریعہ ہیں) ان نظریات نے دنیا کی علمی و ذہنی سطح کو بلند کیا ہے۔ ہمارے وہ مفکر جنہوں نے مغربی فکر اور فلسفے اور نظریات کا وسیع مطالعہ کر کے اسلام کو نئے علمی رنگ اور اسلوب میں پیش کرنے کے لئے لٹریچر کا بڑا ذخیرہ تیار کیا ہے، چونکہ اسلامی فکر کے تسلسل میں اس لٹریچر کو اہمیت حاصل ہے، اس لئے اس کے گہرے تجزیاتی مطالعے کے لئے تصوف سے وابستہ ذہین افراد کو اس کام کے لئے مخصوص کرنا ضروری ہے۔ اس سے ایک تو نئے دور کے علمی، نظریاتی چیلنج اور جدید مادہ پرست تہذیب کی فکری بنیادوں کا ادراک ہوگا۔ دوم یہ کہ اس باطل فکر کی تردید کے لئے استدلال اور اندازِ بیاں حاصل ہوگا۔ سوم یہ کہ علماءِ ربانی کے اسلامی فکر اور دورِ جدید کے اسلامی فکر کے تقابلی اور تجزیاتی مطالعے کے ذریعے یہ صلاحیت بھی پیدا ہوگی کہ نئی نسل کے سامنے اسلامی فکر کو معرفت اور درد و محبت کے رنگ میں کس طرح پیش کیا جائے۔

ایسے مفکروں اور فلاسفروں میں جن کا مطالعہ کرنا ضروری ہے، علامہ اقبال، ڈاکٹر محمد رفیع لدین، مولانا مودودی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا محمد حنیف ندوی اور خلیفہ عبدالحکیم وغیرہ کی کتابوں کا مطالعہ شامل ہے۔ لیکن یہ سارا مطالعہ اس راہ کے واقف کار افراد کی رہنمائی میں ہی کرنا چاہئے، اپنے طور پر ہرگز نہ کرنا چاہئے۔

خانقاہوں کی ذریعے سماجی اصلاح کا لائحہ عمل

معاشرے میں کئی کام ہیں جو علمائے حق اور صوفیاء کرام کے کرنے کے ہیں۔ وہ کام ایسے ہیں، جن کے نہ کرنے کی وجہ سے مسلم معاشرہ تیزی سے زوال پذیر ہے۔ وہ کام اصل میں تو دینی جماعتوں کے کرنے کے تھے، لیکن چونکہ دینی جماعتوں نے زیادہ تر سیاست، سیاسی جدوجہد اور سیاسی بیانات اور تقاریر کو ہی وظیفہ بنایا ہے، اس لئے ان سے اس طرح کے دعوتی کاموں کی امید رکھنا مشکل ہے۔ ان کاموں میں سب سے اہم کام ملک کے سارے موثر طبقات کو دعوتی پیغام کے ذریعہ انہیں اپنے کردار کے اثرات اور نتائج سے واقف کرنا، جھنجھوڑنا اور بیدار کرنا ہے، یہ کام ملک کے ہر شہر میں مقامی سطح تک کرنے کا ہے۔ اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ ملک کے ہر مؤثر طبقے کو الگ خطاب کر کے ان کے لئے بہتر کارڈ پر مشتمل ایک پیغام چھپا کر انہیں بہتر طور پر پہنچانے کا انتظام کرنا چاہئے۔

ڈاکٹروں کے نام پیغام علمائے ربانی کی طرف سے

مثلاً ڈاکٹروں کے لئے دعوتی پیغام ان الفاظ پر مشتمل ہو:

''آج ہمارا ملک غربت، بدامنی، رشوت، لوٹ مار، قتل، مہنگائی اور قومی انتشار کے جس عذاب میں مبتلا ہے، آپ اس سے ہم سے زیادہ بہتر طور پر واقف ہیں، قومی انتشار کی یہ صورتحال ایسی ہے، جس نے ہم سب کے مستقبل کو بالخصوص نئی نسل کے مستقبل کو خطرے میں ڈال دیا ہے، اس صورتحال پر ملک کا ہر پڑھا لکھا فرد خون کے آنسو بہا رہا ہے۔ یہ حالات کیسے پیدا ہوئے اور تاریک مستقبل سے بچاؤ کی صورت کیا ہے؟ یہ وہ سوال ہے جس پر ملک کے ہر دردمند فرد کو غور و فکر کر کے اصلاحِ احوال کے لئے ہر ممکن کوشاں ہونا چاہئے۔ اور اپنی بساط کے مطابق بھرپور کردار ادا کرنا چاہئے۔ ملک اور قوم سے دردمندی اور غیرت کا بھی تقاضا ہے۔

قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ بتاتی ہے کہ قوموں کے زوال میں ان کے موثر طبقات کا اہم کردار رہا ہے، موثر طبقات قومی آزادی کے پھل میں عام لوگوں کو شریک کرنے سے انکار کرتے ہیں اور لوگوں کی غربت کی قیمت پر ان کے خون پسینے کی محنت سے مادی خوشحالی، دولت اور عیش و عشرت کا سامان جمع کرتے ہیں تو اس سے ایک طرف تو معاشرہ میں طبقاتی کشمکش بڑھتی رہتی ہے، جس سے بدامنی پیدا ہوتی ہے اور وسائل سے محروم لوگوں میں مالداروں کے خلاف بغاوت ابھرتی

ہے اور سماج میں ڈاکہ زنی، لوٹ مار اور قتل کی وارداتیں بڑھتی رہتی ہیں تو دوسری طرف ملک اور قوم کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور دشمن طاقتیں قوم کے اس طبقاتی انتشار کو دیکھ کر ملک کو مزید کمزور کرنے کے لئے منصوبہ بندی سے کام کرتی رہتی ہیں۔ تیسری طرف ظلم، ناانصافی اور استحصال کی وجہ سے قدرت کا مکافاتی قانون بھی ایسی قوم کی مدد کرنا چھوڑ دیتا ہے، اور انہیں ان کی بداعمالیوں کی سزا کے طور پر دوسری قوموں کے لئے عبرت کا نمونہ بناتا ہے۔

آپ سے دردمندانہ درخواست ہے کہ ڈاکٹر کی حیثیت سے آپ کو دیکھنا چاہئے کہ ملک کی موجودہ صورتحال میں کہیں آپ کے کردار کو بھی ایک عامل کی حیثیت تو حاصل نہیں۔ حالات کا گہرا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک کے کروڑوں غریب جنہیں دو وقت کی روٹی بھی نصیب نہیں اور جو ایک وقت کھاتے ہیں تو دوسرا وقت بوکھا رہتے ہیں، وہ اپنے علاج معالجے کے لئے قرضہ لے کر، عورتوں کے زیورات گروی رکھ کر آپ کے بھاری اخراجات دینے کا انتظام کرتے ہیں۔ غریب لوگ ایکسروں، ٹیسٹوں اور آپریشن وغیرہ کے لئے جس پریشانی میں مبتلا ہوتے ہیں اور مال متاع بیچ کر بھی آپ کے بھاری اخراجات ادا کرتے ہیں، یہ افسوسناک، دردناک اور تشویشناک صورتحال ہے، جس پر سخت سے سخت دل رکھنے والے فرد کو بھی رحم آنا چاہئے۔ آپ کے جذبۂ حُبِ مال نے ملک کی کروڑوں غریب آبادی کو بڑے عذاب میں مبتلا کر کے ان کی دلوں کو درد اور غم سے بھر دیا ہے، کیا آپ ملک، قوم اور خود اپنی حالت پر رحم فرما کر مریضوں کی معائنے کی فیس میں کمی نہیں کر سکتے، آپ اگر چار پانچ سو روپے کی بجائے سو روپیہ فیس لینے کا فیصلہ کریں تو اس سے یقیناً غریبوں کی فکر، پریشانی اور مالی تکلیف میں کمی ہوگی۔ اگر آپ سرجن ہیں تو اپنی آپریشن کی فیس کو کم کر کے صرف ایک ہزار روپیہ کریں، انشاء اللہ آپ کی مالی خوشحالی میں کوئی زیادہ فرق نہ ہوگا۔ اس قربانی کی وجہ سے آپ کو صبر و شکر، قناعت اور غریبوں پر رحم کرنے کا اجر بھی ملے گا۔ اور غریبوں کی مظلومانہ آہوں سے بچنے اور ان کی خیر و برکت کی دعاؤں کی وجہ سے قوم اور ملک کے حالات میں بھی انشاء اللہ بہتری پیدا ہوگی اور خدا کے قانونِ مکافات میں بھی تبدیلی آئے گی، جس سے سکھ، اطمینان اور خوشی کی فضا پیدا ہوگی۔

سرکاری افسران کے نام، علمائے حق کا پیام

سرکاری آفیسروں کو اس قسم کا دعوتی پیغام دینا چاہئے:

"قوم کی زندگی کا رخ متعین کرنے اور حالات کو تبدیل کرنے کے سلسلے میں آپ کا کردار سب سے فیصلہ کن رہا ہے، آپ ملک میں سب سے موثر طاقت ہیں۔ کیونکہ قوم اور ملت کی ذہن سازی اور معیشت، معاشرت اور تعلیم کے اہداف متعین کرنے، پالیسیاں متشکل کر کے، ان پر عمل کرانے کے ذمہ دار آپ ہی ہیں۔ آپ کی اس بنیادی حیثیت کے سب معترف ہیں۔ اگر معترف نہ بھی ہوں تو حقیقت کے انکار سے حقیقت تو تبدیل نہیں ہوسکتی۔ اس وقت ملک معاشی، تعلیمی، فکری اور امن و امان کے اعتبار سے جس بحران میں مبتلا ہے، آپ اس سے پوری طرح واقف ہیں۔ ہم تو اخبارات کے ذریعے حالات پڑھتے ہیں، جبکہ آپ کو تو ان حالات کا براہ راست علم ہے۔

اس وقت حالت یہ ہے کہ ہمارا تعلیمی نظام تباہ ہو چکا ہے۔ اسکولوں سے لے کر یونیورسٹیوں کے اساتذہ پڑھانے کے بجائے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کی فکر میں غلطاں ہیں۔ امریکہ کے ایما پر تعلیمی نظام میں جو تبدیلی ہو رہی ہے، اس پر ملک کا ہر دردمند فرد سخت متفکر ہے۔ ملک کا نظریاتی اور تہذیبی تشخص بھی خطرے میں ہے۔ عوام کی معاشی حالت دن بدن بد سے بدتر ہو رہی ہے۔ امن کی حالت یہ ہے کہ روزانہ ملک میں قتل اور خودکشی کی وارداتیں، ڈاکے اور لوگوں کے اغوا کا سلسلہ جاری ہے، مہنگائی ختم ہونے کا نام نہیں لیتی، مادی تہذیب کے علمبردار عالمی ادارے اور ملک اربوں ڈالر خرچ کر کے ملک میں این جی اوز کے نام پر ہمارے اپنے لوگوں کے ذریعے ایمان اور عقیدے کا بگاڑ پیدا کرنے، اسلامی اقدار کو پامال کرنے اور تہذیبی ارتداد کی تحریک برپا کرنے میں مصروف ہیں۔ الغرض کہ قومی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں، جو تباہی و زوال کا شکار نہ ہو۔ اگر یہ صورتحال چند سالوں تک مزید جاری رہی تو نہیں کہا جاسکتا کہ ملک کا حشر کیا ہوگا۔

اگر ملک کے ان تشویشناک حالات کے عوامل کا تعین کریں تو بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ اس صورتحال میں آپ کی سستی اور اپنی ذمہ داریوں سے فرار اور قومی زندگی کے مختلف شعبوں کو سنبھالنے کے سلسلے میں چشم پوشی کا مظاہرہ کرنے، بلکہ کئی حالتوں میں حرص و ہوس اور حبِ جاہ و حبِ مال کی خاطر قومی اداروں کو نقصان پہنچانے کے آپ کے نفسی جذبات کو بھی بڑا عمل دخل حاصل ہے۔ قوم اور ملک کی وجہ سے ہی آپ کو بڑے بڑے عہدے حاصل ہیں۔ اور ان عہدوں کی وجہ سے آپ نے اپنا اور اپنے بال بچوں اور عزیز و اقارب کا مستقبل بھی مادی اعتبار سے بہتر بنایا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ ان جملہ رعایتوں اور سہولتوں کے باوجود آپ اپنی ذمہ داریاں ادا کر کے ملک کے تعلیمی، عدالتی، بلدیاتی، معاشی، اور جملہ انتظامی نظام کو بہتر بنانے کی کوششوں میں کوتاہی کی ہے۔ اگر آپ اپنے مستقبل کے ساتھ ساتھ قوم کے مستقبل کو بھی بہتر بنانے کے لئے کسی حد تک اپنے فرائض ادا کرتے ہوتے تو آج ہمارا تعلیمی، تہذیبی، تربیتی، بلدیاتی، عدالتی اور انتظامی نظام اتنی تباہی کا شکار نہ ہوتا۔ ملتِ پاکستان

کے زوال کی جو تاریخ لکھی جائے گی، اس میں آپ کے حد سے زیادہ غیر ذمہ دارانہ کردار کو کسی بھی صورت نظر انداز نہیں کیا جاسکے گا۔ آپ اگر ملی اداروں کی تشکیل اور قومی پالیسیوں پر عمل پیرا ہونے کے سلسلہ میں معمولی اخلاص کا مظاہرہ کرتے اور قومی مالیات پر رحم کھا کر اس کی اس بے دردی سے لوٹ مار نہ کرتے، رشوت، بدنظمی، کام چوری اور سرکاری رقم کی لوٹ اور قانون کو پامال کرنے اور ہر طاقتور کو قانون سے بچانے کے مکروہ کلچر کو مضبوط نہ کرتے تو یقیناً قومی اداروں کو تباہی کا یہ سامنا نہ کرنا پڑتا۔ اور عام آدمی بے سہارہ اور بے بس ہو کر غربت کے موجودہ عذاب میں مبتلا نہ ہوتا۔

خیر جو ہوا، سو ہوا، جن آفسروں نے ملک کے ساتھ یہ فریب کیا ہے، انہیں پاکستان جیسی کارآمد قوم کو ذلیل کرنے اور ہر معاملے میں دشمن کا محتاج بنانے کی سزا ضرور بھگتنی ہوگی، لیکن ابھی وقت گیا نہیں، آج بھی اگر آپ اپنی ذمہ داریاں بہتر طور پر ادا کرنے کے لئے تیار ہوں اور قومی اداروں کو زوال سے نکال کر قوم کی صحیح تعلیم وتربیت اور معاشی، سماجی اور شہری اداروں کو ملک وقوم کو مستحکم کرنے کے مقصد کے لئے استعمال کرنا شروع کریں تو یقیناً آج بھی قومی صورتحال میں بہتری پیدا ہوسکتی ہے۔ آپ کے اس مثبت کردار کی وجہ سے انشاء اللہ ایک طرف تو ادارے مضبوط ہوں گے، قانون کی حکومت قائم ہوگی، کروڑوں لوگوں کی بے بسی کی حالت ختم ہوگی۔ تعلیمی اور تربیتی نظام کے صحیح خطوط پر کام کرنے کی وجہ سے قوم تہذیبی اعتبار سے بھی حالتِ انتشار سے باہر نکل آئے گی۔ دوسری طرف عالمی باطل تہذیب کے علمبرداروں کی طرف سے ملک میں بدتہذیبی، مادر پدر آزادی، اور اسلام سے بغاوت کی جو ہمہ جہتی تحریک شروع کی گئی ہے، انشاء اللہ اس پر بھی ضرب کاری لگے گی۔ آپ اگر بنیاد پرست بننا نہیں چاہتے تو نہ سہی، کم از کم اخلاقی اور قانونی اعتبار سے ریاست کی وہ ذمہ داریاں تو پوری کریں، جن کا وعدہ سروس میں داخل ہوتے وقت آپ نے کیا تھا۔ آپ کی طرف سے محض اخلاقی اور قانونی ذمہ داریوں کی ادائیگی سے ہی انشاء اللہ ملک وقوم کو اتنا فائدہ حاصل ہوگا کہ قوم کے سارے ادارے فطری رفتار سے کام کرنے کی وجہ سے ارتقا پذیر ہوں گے۔ سب کو اپنے حقوق ملنے لگیں گے، تعلیم کی صحیح خطوط پر ترقی کی وجہ سے قوم کو صحیح آفیسر، صحیح سیاستدان، بہتر ڈاکٹر، بہتر وکیل اور اخبار نویس وغیرہ حاصل ہونے لگیں گے۔

اگر آپ نے اپنے رویے کو تبدیل کر کے قوم کی آرزوؤں اور تمناؤں کے مطابق بنانے کی کوشش کی تو اس سے ملک اور قوم کا مستقبل بھی محفوظ ہوگا تو آپ کا اور آپ کی نسلوں کا بھی، آپ کے اس نئے مثبت کردار کی وجہ سے قوم آپ کی دعا گو ہوگی"۔

اس سے ملتا جلتا دعوتی پیغام اخباری مالکان، اخبار نویسوں، وکیلوں، ممبرانِ اسمبلی اور سیاسی لیڈروں کو بھی بھیجنا چاہئے۔ کوشش یہ ہونی چاہئے کہ اپنے حلقہ سے وابستہ ذہین افراد کو اس کام کے لئے بالخصوص تیار کیا جائے، یہ مستقل نوعیت کا کام ہے، جس کے لئے ذہین افراد پر مشتمل کمیٹی بنا کر یہ کام ان کے سپرد کرنا چاہئے۔ پہلے مرحلہ پر مختلف طبقات کے نام اس قسم کا پیغام خوبصورت کاپڑ پر چھپوا کر متعلقہ افراد سے وقت لے کر انہیں گھروں یا دفتروں میں پہنچانا چاہئے۔ دوسرے مرحلے پر اس قسم کے دوسرے بہت سے کام ہیں جو کئے جاسکتے ہیں۔ اگر ہمارے علمائے ربانی ملت کی حالات کی بہتری کے اس فکر کے لئے وقت نکالیں تو یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ ملک میں خانقاہوں سے اصلاح احوال کی زبردست تحریک شروع ہوسکتی ہے۔ چونکہ بزرگوں کے پاس ہر ذہنی سطح کے لوگ روحانی اصلاح کے لئے آتے ہیں، اگر نسبتاً ذہین اور متحرک افراد کی ابتدائی باطنی اصلاح کے بعد ان کی مزید باطنی اصلاح کا کام معاشرے میں دعوتی کام کے حوالے سے وابستہ کیا جائے، اور ان کی روحانی ترقی کا انحصار اس دعوتی کام پر رکھا جائے، تو انشاء اللہ معاشرے کے حالات میں بہتری پیدا ہوسکتی ہے اور خانقاہوں کے ذریعے ملک میں اصلاح احوال کی خاموشی سے ایک مؤثر تحریک برپا ہوسکتی ہے۔ اور یہ سارا کام سیاست میں حصہ لینے اور اخباری سرگرمیوں کے بغیر ہی خاموش حکمت عملی کے ذریعے ہوسکتا ہے۔

اقبال کا فلسفۂ عشق

اور اس کے اسرار و رموز

صفحات:۱۶۰۔ قیمت ۸۰ روپے

اقبال کے فلسفۂ عشق کے بنیادی اجزاء پر سیر حاصل گفتگو۔ ان کے منتخب فارسی اشعار کی ایسی اردو تشریح، جس سے انسانی تخلیق اور مقصد زندگی کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر کی بھرپور وضاحت شامل ہے۔ اقبال کے فلسفہ پر اب تک آنے والی کتابوں میں اس اعتبار سے منفرد نوعیت کی کتاب کہ کتاب کے مصنف و مرتب نے دل کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کرکے، اقبال کو پڑھا اور سمجھا ہے اور آتش عشق میں جل کر اقبال کے فلسفہ عشق کو اپنی ذاتی واردات کی روشنی میں پرکھ کر اس کی تشریح کی ہے۔

صاحب دل اہل قلم نے جو فکر کی دنیا کا وسیع مطالعہ بھی رکھتے ہیں، انہوں نے جدید انسان کے سامنے اقبال کے درد عشق کے پیام کو اس خوبصورتی سے پیش کیا ہے کہ حقیقی عشق کی معمولی چنگاری رکھنے والے اہل علم و اہل دانش کو یہ کتاب جھنجھوڑے بغیر نہیں رہتی۔

سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ

۴۰۰۔ بی، لطیف آباد۔ حیدرآباد

بزرگان دین کی تعلیمات

صفحات:۱۷۰۔ قیمت ۱۰۰ روپے

اکابر بزرگان کے ملفوظات کی ایسی تلخیص، جس میں ان کی تعلیمات کا جوہر شامل ہوگیا ہے۔ بالخصوص اللہ کی محبت کے طالبوں کے لئے راہ محبت کے سفر کے حالات کی سیر حاصل نشاندہی اور ان کی روزمرہ زندگی کے لئے لائحہ عمل متعین کرنے والی کتاب۔

مسلم نفسیات کی اتھاہ گہرائیوں سے واقف کرنے والی کتاب۔

کتاب میں جن بزرگوں کے ملفوظات اور مکتوبات وغیرہ کی تلخیص شامل ہے، ان میں حضرت نظام الدین اولیاء کی ملفوظات کی کتاب، حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات، حضرت خواجہ محمد معصومؒ قیوم ثانی کے مکتوبات، حضرت شاہ ولی اللہؒ کے والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیمؒ، حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ وغیرہ شامل ہیں۔

سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ

۴۰۰۔ بی، لطیف آباد۔ حیدرآباد

قرآن اور علم جدید

مصنف: ڈاکٹر محمد رفیع الدین
تلخیص: محمد موسیٰ بھٹو

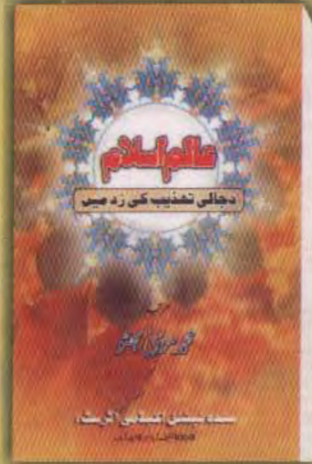
صفحات ۲۸۰ - قیمت ۱۵۰

مغربی تہذیب نے جن الحادی نظریات کو جنم دے کر، اپنی ساری علمی تحقیقات اور اپنے سارے نظام زندگی میں ان نظریات کی روح کو شامل کرلیا ہے اور اپنی فوجی، سائنسی اور مادی برتری کی وجہ سے پوری انسانیت اور سارے عالم اسلام کے ذہین طبقات کو ان نظریات کے سحر میں مبتلا کیا ہے، عالم اسلام کے ممتاز فلاسفر ڈاکٹر محمد رفیع الدینؒ نے اپنی خداداد بصیرت سے کام لے کر، زیر نظر کتاب میں علمی طور پر ان نظریات کے سحر کو توڑ دیا ہے اور جدیدیت کے پیش کردہ نظریہ ارتقا، نظریہ جبلت، نظریہ جنس، نظریہ برتری اور معاشی نظریات وغیرہ پر بھرپور علمی تنقید کے ساتھ ساتھ ان چیزوں کے سلسلہ میں قرآن کے موقف کو شرح وبسط کے ساتھ پیش کر کے، جدید طبقات کے لئے قیمتی علمی رہنمائی فرمائی ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کے بقول یہ کتاب مذہبی طبقات کو جدیدیت کے فہم کے سلسلہ میں اسلامی دنیا کی سب سے منفرد کتاب ہے۔

حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب نے ڈاکٹر موصوف کی اس جامع کتاب کی تلخیص پیش کر کے، ہر سطح کے افراد کے لئے اس قیمتی کتاب سے استفادہ کی صورت پیدا کی ہے۔

سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ

۴۰۰۔ بی، لطیف آباد ۴، حیدرآباد



عالم اسلام

دجالی تہذیب کی زد میں

مرتب: محمد موسیٰ بھٹو

صفحات: 180 ہدیہ: 70روپے

☆ دجال کے خدوخال اور اس کی علامات وخصوصیات پر احادیث کی روشنی میں بحث

☆ مادہ پرستانہ تہذیب کی ہمہ گیری وہمہ جہتی اور اشیائے کائنات کے قوانین سے واقفیت کے ذریعہ عالم پر چھا جانے والی دجالی خصوصیات پر گفتگو۔

☆ عالم اسلام میں پچھلے پچاس سال میں مادہ پرستانہ تہذیب کے نفوذ کی بتدریج اور ارتقائی تفصیلات

☆ دجالی تہذیب جب ٹیکنالوجی قوت اور تعلیم وتفریحی پروگراموں کے نام پر ہر گھر میں پہنچ جائے تو ہر فرد کی سلامتیٔ ایمان کے لئے تدابیر کی نشاندہی۔

☆ دجالی تہذیب کی روک تھام کے لئے اہل اسلام کے لئے لائحہ عمل پر غور وفکر۔

سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ

۴۰۰ ۔ بی لطیف آباد ۴۔ حیدرآباد

TIMES GRAPHICS CELL: 0333-2755980

Salam Printers & Publishers Hyd. 0333-2783772

تصوف
و
اہل تصوف

سلف وخلف کی نظر میں

زیر بحث موضوع پر ممتاز بزرگوں، مستند عالموں
اور مایہ ناز اہل دانش کے قیمتی علمی مضامین کے
مجموعہ پر مشتمل کتاب

مرتب محمد موسیٰ بھٹو

سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ